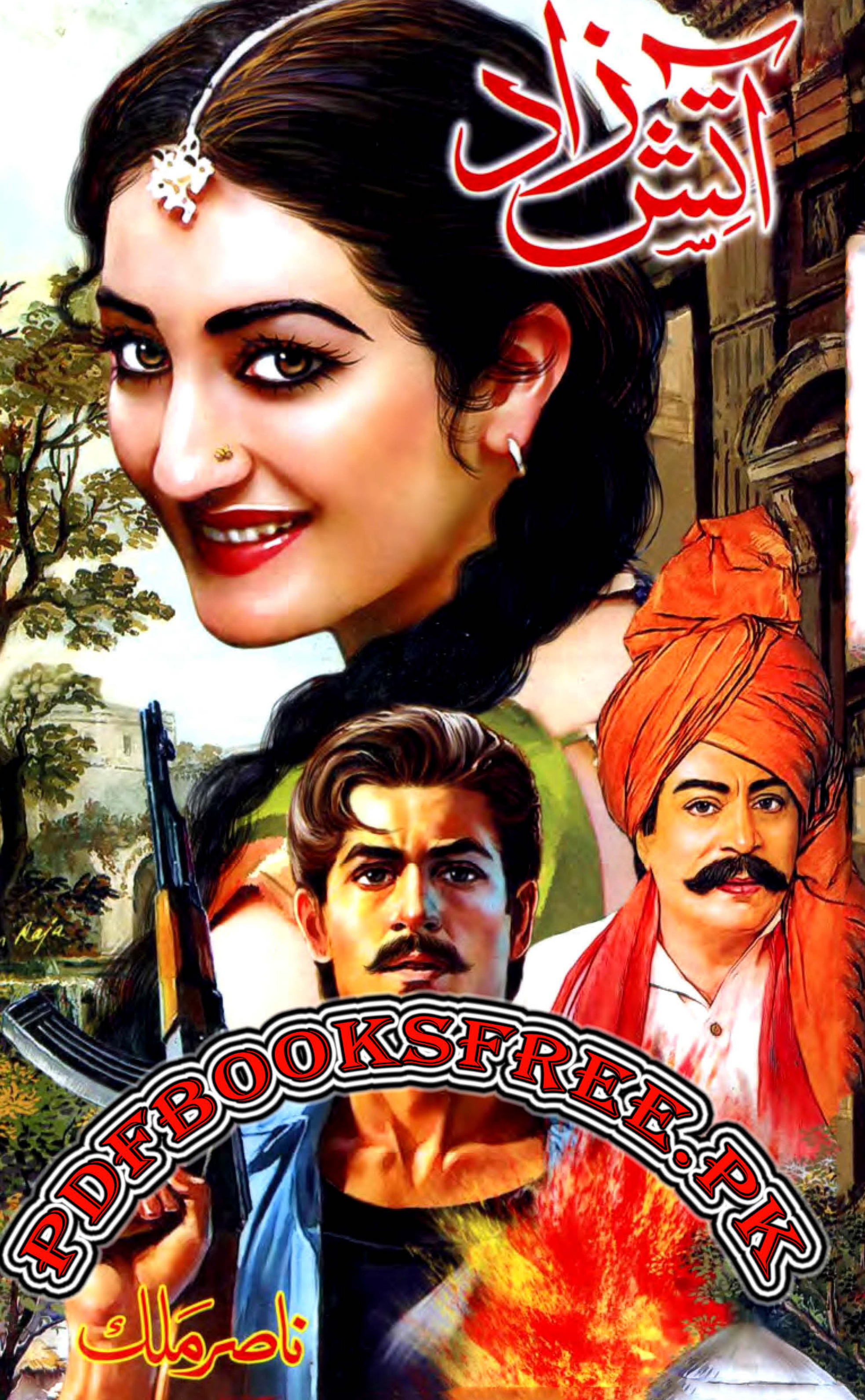
آتشِ زاد
PDFBOOKSFREE.PK
ناصر ملک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں
قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے
لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر
استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو
تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی
، قانونی و شرعی جرم ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

آگ چولھے میں بھڑکتی ہے تو شکم کی بھڑکتی ہوئی آگ کو نگل لیتی ہے۔ چولھے سے نکل کر جہنم تک کے سفر میں آگ کا نظارہ کرنے والوں کو بھی جلاتی جاتی ہے۔ بے وفا ہوتی ہے۔ آگ لگانے والے کو بھی معاف نہیں کرتی۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں زردی مائل عکس بن کر ٹھہر جاتی ہے۔ اُس کی آنکھیں بھی آئینہ بنی ہوئی تھیں۔ تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے دھوئیں سے جھانکتے ہوئے شعلوں کو بہ آسانی اُس کی آنکھوں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ بلند آواز میں قہقہے لگا رہا تھا۔ اُس کے ساتھی بندوقیں لہراتے ہوئے اُس کی ہذیانی خوشی میں شریک تھے۔

اچانک اُس کا قہقہوں کی وحشیانہ تال پر کھلتا بند ہوتا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ دھوئیں میں اُٹے کچے گھر کے شعلوں میں سے سفید لباس میں ملبوس ایک جواں سال عورت اپنے چھ سات سالہ بچے کو گھسیٹتے ہوئے باہر گلی میں نکلی۔ دونوں کی آنکھوں سے موت کا خوف جھلک رہا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ یقین نہ آیا۔ آنکھوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے سہلا کر دیکھا۔ منظر جوں کا توں رہا۔ عورت اُس سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ کر ساکت ہوگئی۔ اُس کا معصوم بچہ بھی قدم روکے کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے چلتی ہوئی ڈسک کو ریموٹ کے ذریعے باز کر دیا گیا ہو۔ اُس کے ساتھی اُس کی حالت سے بے خبر جشنِ آتشزدگی منا رہے تھے۔ وہ گن زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ زور سے آنکھیں میچتے ہوئے بولا ''یہ کیا ہوا؟ میں نے تو پالتو بکریوں تک کو گھر سے نکال کر آگ لگائی تھی۔ یہ دونوں کہاں سے نکل آئے؟''

عورت کا ساکت وجود متحرک ہوا۔ اُس پر انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''ساری عمر چولھے میں آگ دہکا کر میں تین نسلوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ تمہاری دہکائی ہوئی آگ نے تین نسلوں کے بنائے ہوئے گھونسلے کو آن کی آن میں بھسم کر کے رکھ دیا ہے۔''

یکبارگی اُس کا گن کے دستے پر ٹکا ہوا وجود لرز اُٹھا۔ یہ آواز اُس کیلئے اجنبی نہیں تھی۔ سر جھٹک کر سوچنے لگا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جسے اپنے ہاتھوں سے زمین میں برسوں قبل دفن کیا تھا، وہ کیسے اُس آگ میں سے نکل کر سامنے آسکتی ہے؟''

اندھیرے میں آدھے میل کے فاصلے پر واقع کچی بستی سے اِس ڈیرے تک آنے والے راستے پر لوگوں کے بھاگنے دوڑنے اور شور مچانے کی صدائیں گونج اٹھیں۔ اُس کے ایک ساتھی نے چیخ کر کہا۔ ''گاڑی میں بیٹھو اور نکل چلو۔ بستی والے آگ بجھانے کیلئے آرہے ہیں۔''

لطف کشیدگی کا کھوکھلا مگر نہائت سفاکانہ جشن رک گیا۔ سب بھاگ کر ڈبل کیبن ڈالے میں بیٹھ گئے۔ بشیر خان نے کوئی وقت ضائع کئے بغیر یوٹرن لیتے ہوئے بستی کی مخالف سمت میں گاڑی دوڑا دی۔

اُس نے بے ساختگی سے اُدھر دیکھا جہاں چند لمحے پہلے سفید پیرہن میں ملبوس عورت اپنے بچے کے ساتھ کھڑی تھی۔ اَب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑانے سے بھی وہ نظر نہیں آئی تو سوچنے لگا کہ اُسے زمین کھا گئی، آگ نگل گئی یا آسمان نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک طویل سانس لے کر وہ گردن موڑ کر بستی کی طرف دیکھنے لگا۔ لوگ جلتے ہوئے گھر کے قریب پہنچنے والے تھے۔ وہ نہائت سفاکی سے زیرِلب مسکرانے لگا۔ آگ بجھانے کیلئے آنے والوں کے ہاتھ خالی تھے۔ خالی ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے نہ تو دریا کے سامنے بند باندھا جاسکتا ہے اور نہ ہی آگ کی طوفانی لپٹوں کو روکا جاسکتا ہے۔

اونچے نیچے نیم پختہ راستے پر فور وہیل ڈالا غیر معمولی رفتار سے دوڑتا ہوا مین روڈ پر چڑھ گیا۔ رفتار میں بے حد تیزی آگئی۔ دس منٹ کے بعد پھر ایک لنک روڈ پر مڑ گیا۔ اُس کی منزل دریائی کٹاؤ والے کچے کے علاقے میں واقع سردار فضل خان کی متروک حویلی تھی۔

نصف گھنٹے بعد وہ پانچوں بڑے پائیوں والی چارپائیوں پر ٹانگیں پسار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ بشیر خان نے مونچھوں کو بَل دیتے ہوئے کہا۔ ''عالمگیر! کیا خیال ہے لوگوں نے آگ پر قابو پالیا ہوگا؟''

وہ دائیں سائیڈ پاکٹ سے مہنگے برانڈ کی سگریٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ''حکومت کی چولی میں آگ لگ جائے تو مہینوں بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ غریب کے جھونپڑے کی آگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیسے ایک رات میں بجھ سکتی ہے۔''

لالٹین کی روشنی کے پیدا کردہ ملگجے ماحول میں بے ساختہ ستائشی قہقہہ اُبل پڑا۔ عالمگیر ایسی باتیں ہی کرتا تھا۔ سمجھ میں آتی تھیں تو سمجھ جاتی رہتی تھی۔ سر کے اوپر سے گزرتیں تو سر سلامت نہیں رہتا تھا۔

بشیر خان نے اُس کے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''گولی چلانے اور تیلی جلانے تک تم بہت دلیر ہوتے ہو۔ موت اور شعلوں کو دیکھ کر پسینے میں بھیگ جاتے ہو۔ تین سالوں میں تمہیں سمجھ نہیں پایا۔ کیا ہو تم؟''

وہ زیرِلب مسکرانے لگا۔ گہرا کش لے کر بولا۔ ''بشیر خان! اِس بات کی سمجھ مجھے آج تک نہیں آئی، تمہیں خاک سمجھا سکوں گا۔''

فقیر محمد چائے پکا لایا۔ بڑے بڑے پیالوں میں ڈال کر ایک ایک کے ہاتھ میں تھمانے لگا۔ عالمگیر کو سب سے پہلے سَرو کیا جاتا تھا۔ چائے کا پیالہ پکڑ کر سوچ میں پڑ گیا۔ ''میرے ایک ہاتھ میں سگریٹ ہے جو انگلیوں میں دہک کر سینے میں دھواں بھرتی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں چائے ہے۔ آگ پر پک کر کوزے میں بند ہو کر منہ تک آتی ہے اور جہنم جیسے پیٹ میں اُتر جاتی ہے۔ اٹھائیس برسوں سے میرے اندر باہر، ہر سُو، آگ ہی آگ ہے۔ آگ پر بدن جلتا ہے، روح جل کیوں نہیں جاتی؟''

وہ چائے پی نہیں رہا تھا۔ پیالے میں سانس کی زد پر چائے ننھے ننھے ہلکورے لے رہی تھی۔ چائے پر مرکوز اُس کی نظر بھی لرز رہی تھی۔ بشیر خان بغور اُسے دیکھ رہا تھا۔ لمبا گھونٹ بھر کر بولا۔ ''عالمگیر! تمہاری زندگی میں کوئی عورت بھی آئی ہے؟''

وہ چونک کر بولا۔ ''نہیں تو......''

''پھر ایسے گم کیوں ہو جایا کرتے ہو؟'' بشیر خان نے پوچھا۔ ''تمہارا دنیا میں کوئی نہیں، کسی عورت نے تمہیں چاہا نہیں اور نہ ہی تم نے کسی کو چاہا ہے۔ پھر؟ تمہاری نظر ٹھہر کیوں جاتی ہے؟''

وہ طویل سانس لے کر چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق میں اتارنے لگا۔ بشیر خان کو جواب نہیں ملا، کبھی بھی نہیں ملتا تھا۔ خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ اگر اُس نے اُس کے ہاتھوں کے کرتب دیکھ نہ رکھے ہوتے تو کبھی یقین

نہ کرتا کہ وہ غیر معمولی اور ناقابلِ یقین حد تک سریع، پر تشدد اور سفاک زندگی گزار رہا ہے۔

شبر علی نے ٹوٹی ہوئی تاروں کے ٹانکے جوڑ کر اپنا ایف ایم بینڈ والا ریڈیو آن کر لیا تھا۔ کمرے کے پُر ہیبت سکوت میں کسی خوش گلو فنکارہ کا پُر انجام عشق گیت بن کر گونجنے لگا۔ یوں لگا جیسے ریل گاڑی کی چھک چھک میں کوئی نوزائیدہ بچہ ہمک ہمک کر رونے لگ گیا ہو۔ عالمگیر چونک کر گیت کی طرف متوجہ ہوا۔ دل میں سوچنے لگا۔ ''گولیوں کی سماعت شکن جھنکار زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ دل پھر بھی کہیں نہ کہیں نرمی کی راہیں تلاش کر لیتا ہے۔ گانے والی جس تعلق کا رونا رو رہی ہے، وہ تعلق تو میری زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں۔ پھر کیوں اِس رام کہانی کو سنتے رہنے کو جی کرتا ہے؟''

لحافوں میں دُبک کر رات گزارنے والوں کے بے ہنگم خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔

اُس نے لیٹتے ہوئے باری باری سب پر نگاہ ڈالی۔ وہ سب تھکاوٹ کی وجہ سے آن کی آن میں سو چکے تھے۔ وہ بھی لیٹ گیا مگر سو نہ سکا۔ لالٹین کے لرزتے ہوئے ننھے سے شعلے نے میز پر پڑے پانی کے گلاس کا سایہ دیوار پر بنا رکھا تھا۔ سایہ سینے کی طرح لگی بندھی رفتار سے بڑھ گھٹ رہا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ صبح ہونے پر اِس سائے نے مر جانا تھا۔ گھٹتا بڑھتا دل معدوم ہو جانا تھا۔ اِس کی طرح اُس نے بھی ایک نہ ایک دن بجھ جانا تھا۔ کیا زندگی اِسی کا نام ہے؟

نیند نہ آنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ چارپائی کا سرہانے والا حصہ نیچا تھا اور پائنتی نسبتاً اونچی تھی۔ وہ اٹھ کر پائنتی کی طرف سر کر کے لیٹ گیا۔ اب لالٹین اُس کی نظروں کے سامنے تھی۔ وہ شعلے کو گھٹتا بڑھتا دیکھنے لگا۔ اچانک ننھا سا شعلہ بڑھنے لگا۔ بڑھتے بڑھتے قد آدم سے بھی نکلتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ وہ ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا۔

شعلے کے سرخ حصے میں سفید کپڑے پہنے وہی عورت نظر آنے لگی جسے وہ آغازِ شب کی واردات کے دوران دیکھ چکا تھا۔ اب اُس کے ساتھ اُس کا بچہ نہیں تھا۔ وہ اُسے مخاطب کر کے بولی۔ ''اے قاتل ٹولے کے سردار! بتلا کیا میں نے تمہارا نام عالمگیر رکھا تھا؟''

وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''نہیں۔ میرا نام پہلے علم دین تھا، اب عالمگیر ہے۔''

وہ خفگی بھری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ''میں نے تمہیں جن کر علم دین بناتے ہوئے سوچا تھا کہ تم دین کے علم کا چراغ لے کر دنیا میں نکلو گے تو دنیا امن و آشتی کا گہوارہ بن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائے گی۔ تم نے عالمگیر بن کر میرے ارادوں کی توہین کیوں کی؟''

وہ بولا۔ ''مجھے علم دین کا نام دیتے ہوئے تم بھول گئی تھیں کہ چراغ آگ کی ننھی سی لو دیتا ہے۔ زمانہ ہوا دے کر ننھی سی لو کو شعلوں میں بدل دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اب شعلے میرے وجود سے نکل کر دنیا کو جلانے لگے ہیں تو اِس میں میرا کیا قصور ہے؟''

شعلے میں کھڑی عورت کا چہرہ دھندلایا ہوا تھا۔ پہچانی نہیں جاتی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ وہ کون تھی؟ وہ اُسے جننے والی رَجو تھی، اُس کی ماں تھی۔ اُس کے لبوں سے سِسکی کی طرح ماں کا لفظ نکلا تو وہ ناگن کی طرح بل کھا گئی۔ پھنکارتے ہوئے بولی۔ ''تف ہو تم پر! تمہیں بیٹا کہتے ہوئے میری زبان ناپاک ہو جاتی ہے۔ تمہیں جس آگ سے بچانے کیلئے میں زندگی بھر انگاروں پر چلتی رہی، تم نے اُسی آگ کا بازار گرم کر رکھا ہے۔''

وہ صفائی میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کھڑکی سے داخل ہونے والے ہوا کے خنک جھونکے نے لالٹین کی لو کو بجھا دیا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ اندھیروں میں رہنے والا سکھی رہتا ہے۔ وہ بھی چند منٹوں میں ہی سکھی ہو کر دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

صبح دیر سے اُٹھا۔ شبر علی بارہ وولٹ کی بیٹری پر کنورٹر لگائے سارے موبائل فون چارج کر رہا تھا۔ اُس نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''شبر! سردار کا فون تو نہیں آیا؟''

وہ نفی میں سر ہلا کر اپنے کام میں رُجھ گیا۔

وہ چارپائی سے اُٹھ کر صحن میں چلا گیا۔ منہ اندھیرے اُٹھ کر ورزش کرنے کا عادی تھا۔ رات دیر سے سونے کی وجہ سے دیر سے اٹھا تھا جس کی وجہ سے آج کسرت نہیں کر سکا تھا۔ جسم پر کسلمندی سوار تھی۔ موڑھے پر بیٹھ کر دھوپ سینکنے لگا۔ بشیر خان چولھے پر دیگچی چڑھائے بیٹھا بلند سروں میں کوئی بھونڈا سا گیت گنگنا رہا تھا۔ ایسے میں شبر علی نے اُسے موبائل تھماتے ہوئے کہا۔ ''لو منیرے قصائی سے بات کرو۔''

وہ موبائل فون کان سے لگا کر بولا۔ ''بول میرے جگر کے ٹکڑے! کیا کہنا چاہتا ہے؟''

دوسری جانب کی بات سننے کے بعد ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ''یار! تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اور ہاں! یہ دھیان میں رکھنا کہ سردار یا ملک فرید کو تمہاری میری سازباز کا پتہ نہ چلے ورنہ کیا دھرا خاک میں مل جائے گا۔''

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اُس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ بشیر خان متفکرانہ انداز میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُسے دیکھ رہا تھا۔ چائے پیالیوں میں انڈیلتے ہوئے بولا۔ ''تم ہر بار سردار کو چکر دے جاتے ہو۔ ہر بار پانی ایک رخ پر کٹاؤ کرنے لگے تو لوگ بند باندھ کر اُس کا راستہ کاٹ دیتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ ہمارا پتہ کاٹ دیا جائے۔''

وہ مصنوعی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''زندگی پہلے ہی خنجر کی تیز دھار پر چلتے گزر رہی ہے۔ یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی ہے کہ ایک ٹانگ ادھر، دوسری ادھر اور ہمارا کام تمام...... بشیر خان! پھر ڈرنا کیسا؟''

''کتے چوروں سے یارانہ گانٹھ لیں تو مالک زہر آلود روٹی کھلا کر مار دیتا ہے۔'' بشیر خان نے اُسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ ''کتنی بار ایسا ہوگا کہ ہم سردار کو دھوکہ دے کر غریبوں کو جان بچا کر بھاگنے کا موقع دے سکیں گے۔ اِک نہ اِک دن پردہ اُٹھ جائے گا۔ پھر ہم اُٹھ جائیں گے یا ہمارا دانہ پانی یہاں سے اُٹھ جائے گا۔''

وہ بولا۔ ''اندیشوں میں مبتلا ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ تمہیں سردار کوئی الزام نہیں دے سکے گا۔''

باوجود تسلی دینے کے بشیر خان متردد دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''تمہیں کیا ضرورت پڑی تھی انہیں بھاگنے کا موقع دینے کی۔ اگر سردار کو پتہ چل گیا تو وہ ہمیں الٹا لٹکوا دے گا۔''

وہ پھنک کر بولا۔ ''کیا کرسکتا ہے وہ؟ اس کے کہنے پر ہمارے علاوہ کوئی بھی خون کے کھیل میں ہاتھ ڈالنے والا نہیں ہے۔ ہم سے بگاڑ کر وہ چند قدم اکڑ کر چلنے کے قابل نہیں رہے گا۔''

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ سردار فضل خان مقامی سیاست کا اَڑیل گھوڑا تھا۔ اُس پر شرطیں باندھنے والے پہلے سے طے کر لیتے تھے کہ اُن کا گھوڑا ریس جیت کر مالا مال کر دے گا۔ اب تک صوبائی اسمبلی کا کوئی بھی الیکشن نہیں ہارا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ جیتنے کیلئے ہی پیدا ہوا ہے۔ لاکھوں کروڑوں روپے انتخابی موسم میں بو کر اَربوں کی فصل کاٹتا تھا۔ حالیہ انتخابات میں اُس کے مدمقابل کسی نے کھڑے ہونے کی جرأت ہی نہیں کی تھی۔ اُس کے کروڑوں روپے بچ گئے تھے۔ فصل تازہ دم رفتار سے پھل پھول رہی تھی۔

اُس کی طاقت کا سرچشمہ عالمگیر تھا۔ عالمگیر کی ماتحتی میں پلنے والے قتل و ڈکیتی کے سزا یافتہ مجرم جیلیں توڑ کر سردار فضل خان کے حریفوں کی ٹانگیں توڑنے میں مصروف رہتے

تھے۔ پورے علاقے میں کشت و خون کا دریا بہاتے ہوئے انہیں کوئی خوف لاحق نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سردار فضل خان اولاً تو ان پر کوئی مقدمہ درج ہونے ہی نہیں دے گا۔ اگر کسی نے گستاخی کرتے ہوئے اعلیٰ افسران تک رپورٹ پہنچا بھی دی تو وہ خود سنبھال لے گا۔ اُس کی اوپر تک پہنچ تھی۔ اپنے اقتدار کی لمبی بانہوں کو مضبوط رکھنے کیلئے وہ اپنے ہاتھوں پیروں کو بھی محفوظ کر لیتے تھے۔ اوپر والے اِس حقیقت سے روشناس تھے کہ اُن کے تخت سے جڑے کارندوں کو زندہ رہنے کیلئے مسلسل تور دہکائے رکھنا پڑتا ہے۔ چند انگارے اُن کے دامن تک بھی پہنچ جاتے تھے جنہیں وہ بے نیازی سے جھٹک دیتے تھے۔

شوکت علی نور پور بستی کا چھوٹا زمیندار تھا۔ بدقسمتی سے اُس کی زمین برلب سڑک واقع ہونے کے ساتھ ساتھ بستی کے زرعی رقبے میں دل کی حیثیت رکھتی تھی۔ بہت زرخیز مانی جاتی تھی۔ سردار فضل خان نے اُس سے زمین خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر دست بستہ عرض کیا۔ ''سردار جی! شمال سے جنوب تک آپ کی زمینیں پھیلی ہوئی ہیں۔ میرے چھ ایکڑ خریدنے سے کیا فرق پڑے گا۔ ہم غریب لوگ ہی آپ کی سرداری قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نہ رہے تو خالی رقبے قبرستان کی طرح دکھائی دینے لگیں گے۔ مُردے قبروں سے نکل کر ہاتھ باندھ کر حضور کے دربار میں سلامی نہیں دیتے۔''

سردار کو بات بہت بری لگی۔ بدقت تمام خود پر قابو پا کر رعونت سے بولا۔ ''میں وہاں پٹرول پمپ لگانا چاہتا ہوں۔ نور پور کیلئے ایک خوبصورت مارکیٹ تعمیر کرانا چاہتا ہوں۔ اِس میں تم لوگوں کا ہی فائدہ ہے۔ روزگار بن جائے گا۔ بستی خوبصورت دکھائی دے گی۔''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''پر ہم کہاں جائیں گے سردار جی؟''

اُس کا کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''ہمیں نکال کر گاؤں کو جنت بنانے والے! ہمیں تمہاری جنت کا کیا فائدہ پہنچے گا؟''

سردار نے حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے رقبے پر آ جاؤ۔ چھ کی بجائے دس ایکڑ کاشت کرو۔''

شوکت علی اچھی طرح جانتا تھا کہ اپنی زمین چھوڑ کر سردار کی زمین پر مزارع بن کر جانے میں کیا قباحت ہے۔ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں سردار! سڑک کی دوسری سمت آپ کا مربعوں رقبہ پڑا ہے۔ مارکیٹ اور پٹرول پمپ اُس جانب بنا لیں۔ میں اپنی زمین بیچنا

نہیں چاہتا۔''

اپنی عادت کے مطابق سردار سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سر ہلا کر بولا۔ ''اچھا شوکت! جیسے تمہاری مرضی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ تمہارا فائدہ بھی ہو جائے اور بستی کا بھی۔ مگر سیانے سچ کہہ گئے ہیں کہ پیٹ کی طرح بھکے کا سر بھی خالی ہوتا ہے۔''

وہ سردار کی بڑی حویلی سے سر جھکائے نکلا۔ متفکر تھا۔ اُسے بخوبی احساس تھا کہ معاملہ ختم نہیں ہوا بلکہ شروع ہوا ہے۔ ہر آدمی کی طرح اُسے بھی علم تھا کہ سردار بہت منتقم مزاج اور ظالم شخص ہے۔ اُس کی کینہ وری کی وجہ سے کوئی بھی اُس کے سامنے کھڑا ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ گھر پہنچ کر بیوی سے مخاطب ہوا۔ ''زرینہ! لگتا ہے کہ نور پور سے ہمارا دانہ پانی اُٹھ گیا ہے۔ سردار کی نظروں میں ہماری زمین رَڑکنے لگی ہے۔ آج یا کل، اِس فصل پر یا اگلی پر...... ہمیں یہاں سے کوچ کرنا ہوگا۔''

''پر ہم کہاں جائیں گے؟''

دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اُن کے تین بچے تھے۔ دونوں بیٹے سکول میں ساتویں اور پانچویں کلاسوں میں پڑھتے تھے۔ بیٹی اُن سے بڑی تھی۔ پانچ جماعتیں پاس کر کے گھر میں بیٹھا دی گئی تھی۔ بستی میں لڑکیوں کیلئے مڈل سکول نہیں تھا۔ بچے بھی متفکر ہو گئے۔

سردار نے عالمگیر کو شوکت کی زمین حاصل کرنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک ماہ کا وقت ہے۔ اگلے مہینے میں وہاں پر تعمیر شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سمجھ گئے ہو ناں؟''

وہ سردار کے بولنے سے پہلے ہی سمجھ جایا کرتا تھا۔ گزشتہ کئی سالوں سے اُس کی انگلیوں پر ناچتا آ رہا تھا۔ کس انگلی کی کس حرکت پر اُسے کیا کرنا تھا؟...... بخوبی جانتا تھا۔ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم فکر نہ کرو سردار! شوکت علی کے اچھے کیا، بُرے بھی زمین بیچنے پر تیار ہو جائیں گے۔''

آنے والے جمعہ کے دن چار بجے کے قریب وہ شوکت علی کے گھر میں بیٹھا اُسے سمجھا رہا تھا۔ ''دیکھ شوکت علی! زندگی ایسی چیز نہیں ہے جسے کسی ضد یا اکڑ کی نذر کر دیا جائے۔ زمین کیلئے لڑنا دین کیلئے لڑنے کے برابر نہیں ہے۔ تم ضد چھوڑ دو اور زمین سردار کے ہاتھ بیچ دو۔''

وہ بولا۔ ''مجھے علم ہے کہ میں اُس کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتا۔ مگر کیا کروں؟ جتنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیسے وہ لگاتا ہے اتنے میں تو مجھے تین ایکڑ رقبہ بھی نہیں مل سکے گا۔ اُسے سمجھاؤ کہ مارکیٹ ریٹ پر خریدے، میں بیچتا ہوں۔''

''میرے سمجھانے سے وہ اُلو کا پٹھا نہیں سمجھے گا۔'' عالمگیر نے کہا۔ ''میں اُس کا حکم ماننے پر مجبور ہوں۔ تمہیں میری گن مجبور کر دے گی۔ پھر؟''

وہ لاچارگی سے بولا۔ ''تو کیا میں بچوں کو بھوکا مارنے کیلئے خود کو تیار کر لوں؟''

''ایسی بات نہیں ہے شیر علی!'' وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''ابھی کسی کو اِس بات کا علم نہیں۔ تم ایسا کرو کہ ملک غلام فرید کے ہاتھ پر اَندرو اَندری رقبہ فروخت کر دو۔ میرے پاس ایک ماہ کا وقت ہے۔ اِس دوران تم مارکیٹ کے بھاؤ پر رقم حاصل کر کے یہاں سے نکل سکتے ہو۔ ملک سے سردار فضل خان ٹکر نہیں لینا چاہے گا۔ تم بڑی آسانی سے اِس علاقے سے بہت دور نکل کر محفوظ ہو جاؤ گے۔''

شوکت علی سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سردار اُس سے مفت رقبہ ہتھیانا چاہتا تھا، اُس کا کتا اُسے جان بچانے اور رقبہ ملک کے ہاتھوں بیچ کر نکلنے کا مشورہ دیتا تھا۔ یہ کیا معاملہ تھا؟ پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''جو تم کہہ رہے ہو وہ کہاں تک قابلِ عمل ہے؟...... میں ملک فرید کے پاس پہنچوں گا، اِس سے پہلے ہی خبر سردار تک پہنچ جائے گی۔ میرے گھر واپس آنے سے پہلے ہی تم یہاں پہنچ کر بندوقوں کے منہ کھول دو گے۔ سچ بتلاؤ۔ یار بن کر پیٹھ میں وار کرنے آئے ہو؟''

وہ مسکرانے لگا۔ شوکت علی کا رویہ اُس کیلئے غیر متوقع نہیں تھا۔ منہ نزدیک کر کے بولا۔ ''شوکت! یہ کام میں اَب بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک آپشن دیتا ہوں۔ منیرے قصائی سے کسی کی نظر میں آئے بغیر ملو۔ اُسے ساری صورتِ حال بتلاتے ہوئے رازداری کی شرط پر ملک فرید سے بات کرنے کا کہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟ منیرا قصائی اُس کا خاص بندہ ہے۔ وہ کسی کے علم میں لائے بغیر تمہارا سودا کروا دے گا۔ چوری چھپے بیان بھی ہو جائیں گے اور تمہارے یہاں سے بھاگ نکلنے کے بعد وہ قبضہ بھی لے لے گا۔''

وہ سمجھا تھا یا نہیں...... اِس کے علاوہ کوئی چارہ نہ پا کر رضامند ہو گیا۔ عالمگیر اُس کے ہاتھ پر سنہری ٹوکن رکھ آیا تھا۔ اَب اُس پر موقوف تھا کہ وہ کاؤنٹر پر جا کر ٹوکن کیش کراتا تھا

یا دامن جھاڑ کر بینک سے باہر نکل آتا تھا۔ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر منیرے قصائی سے رابطہ کرنے لگا۔ نصف گھنٹے بعد رابطہ ہوا۔ بولا۔ ''یار منیرے! تمہارے پاس شوکت علی آئے گا۔ وہی شوکت علی جس کے بیٹے نے پانچویں میں وظیفہ لیا تھا۔ اُس کا کام رازداری سے کروا دینا۔''

منیرے کی بات سننے کے بعد ہنسنے لگا۔ ''ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ سردار کے ہاتھ کو پھر کھجلی ہوئی ہے۔ کھجلی کرتے ہوئے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ہتھیلی پر کوئی مچھر، کوئی مکھی تو نہیں بیٹھی۔ اپنی کھجلی میں اُن کی جان لے لیتا ہے۔''

منیرے نے حامی بھر لی تو وہ مطمئن ہو کر گنگنانے لگا۔

منیرا ملک غلام فرید کا خاص بندہ تھا۔ دلیر آدمی تھا۔ اُسی کی وجہ سے کبھی سردار نے ملک پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ جہاں ملک اُس کی ہر بات آنکھیں بند کر کے مان لیتا تھا وہاں منیرا بھی وفاداری میں حد سے گزر جاتا تھا۔ وہ عالمگیر سے یاری کا دعویٰ رکھتا تھا۔ کبھی اُس کی مان لیتا، کبھی اپنی منوا کر فائدہ اٹھا لیتا تھا۔ دریا میں رہنے والے دونوں مگرمچھوں نے ایک دوسرے سے مفاہمت کر لی تھی۔ ملک فرید کی کوٹھی بستی کے عین وسط میں واقع تھی۔ وہ سیاست میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ غریب پرور آدمی تھا مگر اُسے شدت سے یہ احساس تھا کہ کسی مار دھاڑ والے بندے کے بغیر اُس کا سردار فضل خان کے علاقے میں رہنا محال ہے۔

چونکہ وہ سردار کا سیاسی حریف نہیں تھا اور نہ ہی اُس کے معاملے میں ٹانگ اڑاتا تھا، اس لئے آج تک دونوں کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ ملک فرید کا ایک بیٹا سول جج تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس کے بیٹے ملک امجد فرید کے وسیع اختیارات سے سردار خائف رہتا ہو۔ بہرحال جو وجہ بھی رہی ہو، وہ ملک فرید سے دشمنی لینا پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ عالمگیر کے سامنے اُس نے کبھی اپنی اِس کمزوری کا اعتراف نہیں کیا تھا۔

تین چار دنوں کے بعد وہ نور پور کی طرف نکلا۔ آج بشیر خان بھی اُس کے ساتھ تھا۔ توقع کے مطابق شوکت علی گھر پر مل گیا۔ اُس نے پوچھا۔ ''سناؤ بھئی شوکت میاں! کہاں تک پہنچے ہو؟''

شوکت نے ہاتھ میں حقہ تھام رکھا تھا۔ لمبا کش لے کر بولا۔ ''میرے رقبے اور مکان کی قیمت تیرہ لاکھ سے کچھ اوپر نیچے بنتی ہے۔ وہ گیارہ لاکھ دے رہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سودا کر لینا چاہیے۔''

بشیر خان نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''احمق آدمی! دیکھتا کیا ہے؟ پیسے پکڑ اور یہاں سے بھاگنے کی سوچ۔ سردار کو پتہ چل گیا تو مفت میں زمین گنوا بیٹھو گے۔''

وہ دونوں کی خوشامد کرنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے واسطے دیتے ہوئے دعائیں دینے لگا۔

آنے والے ہفتے میں شوکت علی کو رقم مل گئی۔ چپکے سے حلقے کے ریونیو آفیسر کو گھر میں بلوا کر ملک فرید نے بیان حاصل کر لئے اور اُسے فارغ کرتے ہوئے کہا۔ ''لے بھائی شوکت! تیری جان تو گئی چھوٹ۔ اب دعا کرنا کہ میں اُس مگرمچھ کے جبڑوں میں آنے سے بچا رہوں۔''

وہ سر نیہوڑائے بستی کی گلیوں میں کبیدہ خاطر چلتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ بیوی اور بچوں کو رازداری سے سامان باندھنے کا حکم دیا اور خود کمرے میں چھپ کر رونے لگا۔ اِس گاؤں میں زندگی گزری تھی۔ رشتہ داری کا سا تعلق گاؤں والوں کے ساتھ پیدا ہو چکا تھا۔ چوروں کی طرح بنا کسی جرم کے رات کے اندھیرے میں بھاگنے پر کبیدہ خاطر تھا۔ سامان سمیٹ چکا تو عالمگیر کا خیال آیا۔ برسوں سردار فضل خان کو ووٹ نہ دینے کے ارادے کا اعادہ کرنے والے اُس کی ایک جھلک دیکھ کر صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے تھے۔ پورا گاؤں اُسے ظالم کہتا تھا۔ عجیب ظالم تھا کہ اُسے جان بچا کر بھاگنے کا موقع دے گیا تھا۔ سیانے سچ کہتے ہیں کہ انسانی دماغ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ مشین کی مانند نہیں ہے کہ ایک ہی رفتار سے ایک ہی جانب چلتا رہے۔ یہ کبھی کبھی الٹی چال بھی چلنے لگتا ہے۔

عالمگیر نے اگلے دس دن تک مختلف کہانیوں کے ذریعے سردار کو ٹالا۔ سردار کا صبر جواب دے گیا تو گرم ہو کر بولا۔ ''عالمگیر! مجھ سے اتنا صبر نہیں ہوتا۔ تم ہر روز مجھے نئی کہانی سنانے کیلئے آ جاتے ہو۔ مجھے دو دنوں کے اندر اندر رقبے کا قبضہ ملنا چاہیے ورنہ تمہاری خیر نہیں ہے۔''

بشیر خان بھی اُس کے ساتھ ہی تھا۔ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''سردار جی! غصے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کل ہی جا کر اُس کا سر کچل دیں گے۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری!''

سردار کا پارہ بدستور چڑھا رہا۔ دونوں بڑی حویلی سے نکل کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ بشیر خان بولا۔ ''عالمگیر! پھر بے وجہ مروا دیا تم نے۔ اَب کے سردار معاف کرنے والا نہیں ہے۔''

وہ بھی فکر مند ہو گیا۔ حویلی سے سیدھا شوکت علی کے گھر پہنچا۔ اُسے سامان باندھتے دیکھ کر غصے سے بولا۔ ''تمہیں ان کچ پھبروں کی پڑی ہے۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ جتنا جلد ہو سکے، یہاں سے نکل بھاگو۔ اب تمہیں یہ کہنے کیلئے آیا ہوں کہ آج رات کو یہاں سے نکل جاؤ ورنہ پھر کبھی بھی مجھے الزام نہ دینا۔''

اُس کے لہجے کی درشتی نے شوکت علی کو دہلا دیا۔ وہ اُس کے قدموں میں جھکتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے بیوی بچوں کو سندھ میں چھوڑ آیا ہوں۔ گاؤں میں شادی کا بہانہ بنایا تھا میں نے۔ آج رات یہ سامان لے کر چلا جاؤں گا۔''

خالی کمروں کو آگ نہیں لگتی۔ شعلے مٹی کی دیواروں سے ٹکرا کر بجھ جاتے ہیں۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ ''شوکت! اب بہت ہو گئی۔ قیمتی چیزیں تم لے جا چکے ہو۔ کچرا سمیٹنے کیلئے موت کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کیلئے آئے ہو۔ بس! بہت ہو چکا۔ اب جان بچانا چاہتے ہو تو اِس علاقے سے نکل جاؤ۔ یہاں سے کچھ بھی لے کر نہ جانا۔ یہ میرا حکم ہے۔''

وہ دندناتا ہوا بشیر خان کی معیت میں پلٹ آیا۔ آتے ہی اپنے ساتھیوں کو حملہ کرنے کی تیاری کا حکم دیتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے گھر کو آگ لگانا ہے۔ وہ کم بخت کافی سارا سامان اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ تم چار پانچ کین مٹی کا تیل ساتھ لے لینا۔ جلنے کیلئے کوئی چیز تو ہو۔''

رات کو جب وہ وہاں پہنچے تو تالے اُن کا منہ چڑا رہے تھے۔ انہوں نے پورے مکان میں لکڑی کا ایندھن پھیلا دیا۔ ہر طرف مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی اور باہر کھڑے ہو کر جشن منانے لگے۔ سوائے چارپائیوں کے کچے گھر میں جلنے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا۔

تمام دِن اُس کا دل دھڑکتا رہا۔ اُسے اندازہ تھا کہ جونہی سردار کو پتہ چلے گا کہ شوکت علی زمین ملک فرید کے ہاتھ بیچ کر نکل گیا ہے تو وہ باؤلے کتے کی طرح اُس پر پل پڑے گا۔ بارہا تجربہ ہوا تھا کہ وہ غصے میں ننگی گالیاں دینے اور ہاتھ چلانے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ بشیر خان اور اُس کے ساتھی بے فکر تھے۔ چونکہ سردار کا تمام تر نزلہ عالمگیر پر ہی گرتا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس لئے انہیں یقین تھا کہ آج بھی ہمیشہ کی طرح وہ بال بال بچ جائیں گے اور عالمگیر بے بھاؤ کی سنے گا۔

شام کا دھندلکا اندھیرے میں تبدیل ہوا تو سردار کی نئی نویلی لینڈ کروزر شکستہ حال حویلی کے صحن میں داخل ہوئی۔ عالمگیر کے اعصاب تن گئے۔ ڈرائیور اور باڈی گارڈ کی معیت میں سردار اُس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں بتلایا تھا کہ شوکت کی زمین مجھے ہر صورت میں چاہیے۔''

وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ سردار کی سفاک آواز سماعت میں زہر انڈیلنے لگی۔ ''تم نے آگ لگائی، جلے ہوئے ملبے سے کوئی لاش برآمد نہیں ہوئی۔ کیا سمجھوں؟ تمہارے ہاتھ میں دبی ہوئی ماچس گیلی ہو گئی ہے یا ہاتھوں کی گرفت نے بڑھاپا اوڑھ لیا ہے؟''

وہ بشیر خان کی طرف کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے خاندان سمیت آگ میں جل مرے مگر قسمت اُس کا ساتھ دے گئی۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے خاندان کو لے کر نکل چکا تھا۔ تلاش کرنے پر بھی ہاتھ نہیں لگا۔''

سردار کی تأسف بھری آواز سنائی دی۔ ''عالمگیر! تمہاری لاپرواہی سے سارا کھیل ہی چوپٹ ہو گیا ہے۔ تمہیں پتہ ہی نہیں چلا اور وہ چالاک بڈھا ملک فرید کو رقبہ بیچ کر نور پور سے نکل گیا۔ تم سب نکمے ہوتے جا رہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''تم فکر نہ کرو سردار! میں ملک فرید سے مل کر زمین خریدنے کی کوشش کروں گا۔''

سردار پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔ ''فکر کرنے کی بات ہے عالمگیر! ملک زمین میرے ہاتھ نہیں بیچے گا اور اگر بیچنے پر رضامند ہو بھی گیا تو پوری قیمت مع منافع مانگے گا۔'' ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔ ایک عرصہ سے سیاسی میدان میں گھاتیں لگاتا آیا تھا۔ ایک مچان کے ناکارہ ہونے پر دوسری فی الفور بنا لیتا تھا۔ اُس کے سامنے چھاتی پھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے سینے پر انگلی کی ضرب لگاتے ہوئے بولا۔ ''عالمگیر! مجھے وہ رقبہ چاہئے۔ ملک فرید سے بات کرو۔ وہ جتنے میں سودا کرے، کر کے خرید لو۔ تمہاری لاپرواہی کی یہی سزا دیتا ہوں کہ رقبے کی قیمت تم ادا کرو گے۔ کہاں سے اور کیسے؟ یہ میں نہیں جانتا۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ سوچنے لگا کہ سردار ایک امتحان کے بعد دوسرے امتحان میں ڈال دیتا

ہے۔ انکار کر کے اُس کی شبہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ نیم دلی سے بولا۔ ''سردار! تمہارا حکم مانتا آیا ہوں۔ اب بھی مانوں گا مگر یہ ضرور خیال رکھا کر کہ بندے کے ہاتھ چاہے جتنے لمبے ہوجائیں، وہ قسمت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

سردار گہری سرد نگاہوں سے اُسے گھورنے لگا۔ وہ اُس کے بیچ کو کنگھالنا چاہتا تھا۔ توقف کے بعد بولا۔ ''ملک فرید سے بات کرتے ہوئے یہ دھیان رکھنا کہ میں اُسے ناراض کرنا نہیں چاہتا۔''

عالمگیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سردار غصے میں تھا اِس لئے بغیر چائے پیئے ہی رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد بشیر خان نے کہا۔ ''عالمگیر! سردار کا رویہ بتاتا ہے کہ اُس نے ہمیں آخری چانس دیا ہے۔''

عالمگیر کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو بشیر خان! ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنے کیلئے وہ ہم پر لاکھوں روپے حرام نہیں کرتا۔ سیاست جیسے پل صراط پر کامیابی سے چلنے والا ہمیں بار بار گرتے ہوئے دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی دن رِسالہ بدلنے پر تُل جائے گا۔''

صحن کے وسط میں کھڑے ہو کر اُس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے دھند پڑے گی۔''

دریا بالکل نزدیک تھا۔ سردیوں کی اکثر راتیں کہر اوڑھ کر بہت گہری ہوجایا کرتی ہیں۔ دھند کے باعث موسم سردی بھی پکڑ لیتا تھا۔ وہ کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے شوکت علی کو بچا کر سردار سے غداری کا چھٹی مرتبہ ارتکاب کیا تھا۔ وہ کسی کو آگ میں جلانا نہیں چاہتا تھا۔ بندوق اور بازو کے زور پر دنیا سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا تھا مگر غریب زادوں کی پیٹھ کو دیا سلائی دکھانے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپنے لگتے تھے۔

اُس نے اپنے تئیں اندازہ لگایا کہ ملک فرید پندرہ لاکھ روپے میں سودے پر رضامند ہوجائے گا۔ وہ منیرے قصائی کے کندھے پر چڑھ کر ملک کی گردن تک پہنچ سکتا تھا۔ سردار کی ہٹ دھرمی کا بھی بخوبی علم تھا۔ فکر دامن گیر ہوگیا کہ پندرہ لاکھ روپے کا بندوبست کہاں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرے گا؟ شب گردی کے نتیجے میں پورے گروپ کو ماہ بھر میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے حاصل ہوجاتے تھے جن پر سردار نے کبھی قبضہ نہیں جمایا تھا۔ اُس نے آزادی دے رکھی تھی کہ وہ اپنا گزارا چلانے کیلئے چھوٹی موٹی وارداتیں قانون کی نظر میں آئے بغیر کرتے رہیں۔ ہر ماہ ایک لگی بندھی رقم بھی انہیں دیتا تھا۔ اِس رقم سے اُن کے خفیہ ڈیرے کا خرچہ چلتا تھا۔

وہ تین ماہ پہلے اِس حویلی میں منتقل ہوئے تھے۔ یہاں وہ نسبتاً محفوظ اور عام لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ تھے۔ حویلی سے دو فرلانگ کے فاصلے پر دریا بہہ رہا تھا۔ دریا تک جانے کا راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ جنگلی گھاس اور جھاڑیوں کی بدولت پانچ منٹ کا فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔ یہ گھاس اور جھاڑیوں کا گھنا جنگل دریا کے ساتھ ساتھ پندرہ بیس میل تک پھیلا ہوا تھا۔ حویلی سے کھیتوں تک یہ جنگل ڈیڑھ کلومیٹر تک چلا گیا تھا۔ آگے دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع بڑی شاہراہ تک گھنے کماد نے ماحول کو خاصا پراسرار بنا دیا تھا۔ لنک روڈ تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے سے گزرتی تھی۔ لنک روڈ پر چڑھنے کیلئے کماد کے کھیتوں کے بیچ میں موڑ در موڑ کچا دشوار گزار راستہ عبور کرنا پڑتا تھا۔ حویلی کے اطراف میں لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ مہینوں کسی کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ قانون کی نگاہوں سے اُن کا یہ اڈہ اَب تک اوجھل ہی رہا تھا۔ تھانہ دور ہونے کی وجہ سے کبھی کوئی تھانیدار یا اہلکار یہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ اگر پہنچ بھی جاتا تو ڈیرے کی حالت زار دیکھ کر یہی سمجھتا کہ یہ نوکروں چاکروں کیلئے بنایا ہوا ڈیرہ ہے۔

اُن کے زیر استعمال عمومی طور پر چوری شدہ گاڑیاں ہی رہتی تھیں۔ واردات کے دوران انہیں نمبر پلیٹوں یا گاڑی کی شناخت کو چھپانے کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں آتا تھا۔ پرانی ایف ایکس سردار کی ذاتی گاڑی تھی۔ اس گاڑی کو وہ صرف اور صرف عام حالات میں سودا سلف لانے کیلئے استعمال کرتے تھے۔

اُنہیں پوری طرح باور تھا کہ سردار ہر آنے والے تھانیدار سے ذاتی مراسم قائم کر لیتا ہے۔ سیاست کی سیڑھی پر چڑھنے کیلئے قانون کی ریلنگ کو گرفت میں رکھنا پڑتا ہے۔ گرفت ڈھیلی پڑنے پر زینے قدموں تلے سے کھسک جاتے ہیں۔

اگلے دن اکیلا ہی بستی میں منیرے قصائی کے گھر پہنچ گیا۔ اُس کی بیوی نے اُسے

بیٹھک میں بیٹھایا اور اپنے بیٹے کو ملک فرید کے ڈیرے پر بھیج کر منیرے کو بلوالیا۔ وہ عالمگیر سے بغل گیر ہوکر بولا۔ ''بغیر مطلب کے بستی میں نہ آنے والا آج بھٹک کر میرے گھر تک کیسے پہنچ گیا؟''

وہ اُس کے شانے پر ہاتھ مار کر چارپائی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ منیرے نے تیز پتی والی چائے بنوالی۔ گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے بولا۔ ''عالمگیر! میرے جانی، اَب کہو، کیسے آنا ہوا؟''

وہ بولا۔ ''مصیبت میں پھنس گیا ہوں شوکت علی کی چوری چھپے مدد کر کے۔ اب سردار وہ رقبہ مانگتا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ملک کی ناراضی بھی مول نہیں لینا چاہتا۔ تم ہی بتاؤ، کیا کروں؟''

منیرا سوچ میں پڑ گیا۔ وہ خود بھی دونوں بڑوں کو لڑانا نہیں چاہتا تھا۔ بھینسوں کی جنگ میں بکریاں پس جاتی ہیں۔ وہ بولا۔ ''سردار فضل خان بڑا کائیاں بندہ ہے۔ وہ ملک کی اُس طاقت سے بھی آگاہ ہے جس کا آج تک ملک نے فائدہ نہیں اُٹھایا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ ملک کے سول جج بیٹے کی وجہ سے کنی کتراتا ہے۔ نہیں! وہ ملک فرید کے بھائی ملک ظہور اور اُس کے بیٹوں کو جانتا ہے۔ یہ بھی جانتا ہے اگر ملک ظہور شیخوپورہ سے اپنے بھائی کی مدد کیلئے یہاں پہنچ گیا تو اُس کی خیر نہیں ہوگی۔ بہر حال! میں ملک سے بات کروں گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مان جائے۔ ایک بات دھیان میں رکھنا کہ ماننے کی صورت میں بھی وہ منافع ضرور لے گا۔''

عالمگیر کو پتہ تھا۔ ہاتھ آئی دولت کوئی بھی نہیں چھوڑتا۔ اُس نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے فون کر کے جلد ہی بتلاؤ گے۔ میں سردار سے پیسے لے کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

بیٹھک سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ بستی اُس کی بارہا کی دیکھی بھالی تھی۔ اُسے ذاتی خریداری کیلئے شہر میں بھی جانا تھا۔ سوچا کہ سردار کی حویلی کا چکر لگا کر بازار کی طرف نکلے گا۔ حویلی کے گیٹ پر گاڑی روک کر ہارن بجانے لگا۔ دل میں سوچنے لگا۔ ''ہم جیسے مہروں پر سیاست کی بازی کھیل کر سردار جیسے آدمی کتنا اوپر چلے جاتے ہیں۔ میں نے پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ سے سول انجینئرنگ کا ڈپلومہ حاصل کر رکھا ہے، دو وقت کی روٹی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیلئے چند ٹکوں کی نوکری نہیں ملی۔ اِس بھیڑیا صفت اَن پڑھ شخص کی قسمت نے اِسے کروڑوں میں کھلا رکھا ہے۔ بی اے کی جعلی سند پر کتنے ٹھاٹھ سے الیکشن لڑ کر ہر بار اسمبلی میں پہنچ جاتا تھا۔''

گیٹ کھلنے میں دیر ہورہی تھی۔ ہارن بجا کر پھر سوچوں میں گم ہوگیا۔ ''سیاسی وڈیروں نے کبھی بھی مملکت کو ٹھٹھہ مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ دستخطوں کے علاوہ ایک لفظ بھی نہ لکھ سکنے والے سردار فضل خان کو صوبائی پارلیمانی سیکرٹری برائے تعلیم تعینات کر کے پندرہ کروڑ لوگوں کے ساتھ مذاق ہی تو کیا گیا ہے۔''

سوچوں میں دُور تک بھٹک جاتا مگر واچ مین نے گیٹ کھول کر اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گاڑی اندر پورچ تک لے گیا۔ واچ مین سے پوچھنے لگا۔ ''بخت علی! سردار بیٹھا ہے؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہاتھ کے اشارے سے اُسے دائیں ہاتھ پر واقع سردار کے مہمان خانے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ٹہلنے کے سے انداز میں مہمان خانے میں داخل ہوا۔ صوفوں اور کرسیوں پر دس بارہ اشخاص براجمان تھے۔ اندرونی دیوار کے ساتھ سردار اپنے تخت نما صوفے پر براجمان تھا۔ گردن غرور سے تنی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر بولا۔ ''تم اُس کمرے میں بیٹھو۔ میں مہمانوں سے فارغ ہوکر آتا ہوں۔''

وہ وی آئی پی گیسٹ روم میں آبیٹھا۔ سردار اکثر یہیں اُس سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ بہترین آراستہ کمرے میں ائرفریشنر کی بھینی بھینی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ونڈو کا پردہ ہٹا کر بیٹھ گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد میز پر بخت علی نے چائے اور لوازمات چُن دیے۔ اُس نے پوچھا۔ ''آج خلقت کم دکھائی دے رہی ہے۔''

بخت علی اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ ''خلقت بھی کبھی کم ہوئی ہے کیا؟ یہ جائیں گے، اور آجائیں گے۔ کسی کا کام ہوجاتا ہے، کوئی جھڑکیاں سن کر رخصت ہوجاتا ہے۔ سردار کا ڈیرہ لگا رہتا ہے۔''

وہ چائے پیتے ہوئے سوچنے لگا۔ بخت علی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہاں آنے والوں میں کبھی کمی نہیں ہوئی تھی۔ ہر آدمی سیدھے راستے سے حق رسی کیلئے جانے کی بجائے سردار کے ڈیرے کا شارٹ کٹ اختیار کرنا چاہتا تھا۔ سردار کے قدموں میں تحفوں کے نام پر رشوت

دھر کر کامیابی کا تعویذ حاصل کرتا اور خوشی خوشی چلا جاتا۔ کسی نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اپنے چھوٹے سے مفاد کو تحفظ دینے کیلئے وہ بھیڑیے کے ہونٹوں پر خون مل رہا ہے۔ خونی بھیڑیا خون پینے کا عادی ہو کر بنا تمیز کے بھیڑیں مارنے پر تُل جاتا تھا۔ سردار کو اُس کی عدم موجودگی میں فرعونیت کا طعنہ دینے والوں نے ہی اُسے انسان سے فرعون بنایا تھا۔

سردار نے ایک گھنٹے بعد وی آئی پی کمرے میں قدم رنجہ فرمایا۔ اپنے مخصوص شاہانہ انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''عالمگیر! بغیر اطلاع کے آئے ہو۔ خاص وجہ ہے؟''

وہ بولا۔ ''نہیں سردار! فون کے پری پیڈ کارڈ اور کچھ دوسری اشیاء خریدنے کیلئے شہر آیا تھا۔ سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔''

''کوئی چاء شاء پی ہے؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''عملے کا کیا حال ہے؟'' سردار کا اشارہ اُس کے گروپ میں شامل بشیر خان اور شبر وغیرہ کی طرف تھا۔

''سب ایک دم فِٹ ہیں۔'' عالمگیر نے کہا۔ ''ہم سب تمہارا حکم سن کر پریشان ہیں۔ رات بھر سوچا۔ اِس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ ہم سب مل کر بھی شوکت علی والے رقبے کی قیمت نہیں چکا سکتے۔ رقم تمہیں ہی دینا پڑے گی سردار!''

سردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''کوئی حال نہیں عالمگیر تمہارا بھی۔ بھلے آدمی! وہ تو میں نے غصے میں کہا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ پندرہ بیس لاکھ روپے تم کہاں سے دو گے۔ چھوٹی چھوٹی وارداتیں کر کے اپنا پیٹ پالتے ہو۔ اتنی بڑی واردات کرو گے تو قانون کی نظر میں آ جاؤ گے۔''

اُس نے سردار کے بدلے ہوئے رویے پر غور کیا۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ پل میں رَتی پل میں ماشا بننے والا فرعون اُس کی پذیرائی کر رہا تھا۔ بولا۔ ''تم اگر دو چار بار ناکام ہوئے ہو تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرا شاہ زور گھوڑا لنگڑا ہو گیا ہے۔ اَبھی میں نے تم سے بڑے کام لینا ہیں۔ تمہیں فضول کاموں میں الجھا کر میں تمہاری طاقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ انتخابات میں حریف کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پچھاڑنے سے بھی بڑا کوئی کام اُس سے یا اُس کے گروپ سے لیا جا سکتا تھا؟ بولا۔ ''سردار! میں سمجھا نہیں۔ تم جو کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔''

سردار ہنسنے لگ گیا۔ ہنستے ہنستے بولا۔ ''جب موقع آئے گا، کھل کر ہی کہوں گا۔ اشارہ کئے دیتا ہوں تاکہ تم قبل از وقت ذہنی طور پر تیار رہو۔ لوکل باڈیز کے انتخابات ہونے والے ہیں۔ اوپر سے حکم آیا ہے کہ اپنی پارٹی کے امیدواروں کو جتانا ہے۔ ابھی تو کینڈیڈیٹ ہی کھل کر سامنے نہیں آئے، جب دُشمن اور سجن اپنی اپنی بلوں سے باہر آئیں گے، تمہیں بھی اپنے اڈے سے باہر آنا ہوگا۔''

وہ سر ہلا کر مسکرانے لگا۔ سردار کی کہی ہوئی بات سمجھ کر پوری بات کی تہہ میں پہنچ چکا تھا۔ بولا۔ ''سردار! تم فکر ہی نہ کرو۔ اَب تو مجھے اِس میدان میں کھیلنے کیلئے اترنے کا بارہا تجربہ ہو چکا ہے۔''

اپنی سفید مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سردار سوچ میں گم ہو گیا۔ اُس نے ڈسٹرب نہیں کیا۔ کچھ توقف کے بعد سردار متفکرانہ انداز میں بڑبڑایا۔ ''میں نے اوپر والوں سے کہہ دیا ہے کہ نور پور یونین کونسل میں ناظم اور نائب ناظم میری صوابدید پر کھڑے کئے جائیں۔ وہ مان گئے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ بستی پر ملک غلام فرید کا پوری طرح ہولڈ ہے۔ سب لوگ اُس کے کہنے پر ہی ووٹ دیں گے۔ کوئی ایسا بندہ کھڑا کروں جو ملک فرید کو ناپسند نہ ہو۔''

وہ بولا۔ ''ملک فرید تمہیں پسند نہیں کرتا۔ اِس کے باوجود بستی والے تمہیں ووٹ دیتے ہیں۔ تمہارے کھڑے کئے ہوئے بندے کو ہی ضلعی اسمبلی میں پہنچائیں گے۔ ملک سے میں بخوبی نبٹ لوں گا۔''

سردار اُسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچ میں گم ہو گیا۔ ماتھے پر تردد کی غماز لکیریں سجائے بولا۔ ''سُنا ہے کہ ملک اپنا بندہ کھڑا کرنے کے چکر میں ہے۔ اُس کی مخالف پارٹی سے بات بھی ہو گئی ہے۔ ابھی تک یہ فائنل نہیں ہوا کہ وہ کسے کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ ناظم کیلئے جوڑی دار کسے بنائے گا۔ اگر وہ کھل کر اپنا امیدوار کھڑا کرتا ہے تو ہمارے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔''

عالمگیر مصنوعی بے فکری سے بولا۔ ''کیا مشکلات پیدا ہوں گی سردار! جسے بھی ملک فرید کھڑا کرے گا، میں اُسے سر میں ڈانگ مار کر بٹھا دوں گا۔''

سردار نے اُسے ڈانٹ دیا۔ "اوئے بس جوان! جانتا ہوں تمہیں۔ تم نہیں جانتے ہو کہ ملک غلام فرید کے پیچھے کون سی طاقت ہے۔"

اُسے منیرے قصائی کی بات یاد آئی۔ کریدتے ہوئے بولا۔ "اگر تم مجھے ملک غلام فرید کے بارے میں کھل کر بتلاؤ گے تو اِس میں تمہارا فائدہ ہوگا۔ میں ہاتھ بچا کر وار کروں گا۔"

"ملک فرید کا بھائی شیخوپورہ سے دو مرتبہ منتخب ہو کر وفاقی اسمبلی میں پہنچ چکا ہے۔ اِس مرتبہ اُس نے الیکشن میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اُس کے بیٹے نے باپ کے روایتی حریف نے پچھاڑ دیا۔ وہ پڑھا لکھا ہے مگر اِس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بالکل سیدھا سادھا آدمی ہے۔ اُس کے پاس تمہارے جیسوں کی بھی کمی نہیں۔ فطرتاً شر پسند نہ ہونے کے باوجود کشت و خون کا بازار گرم رکھتا ہے۔" سردار اُسے دھیمے لہجے میں بتلانے لگا۔ "کسی گھریلو معاملے پر اختلاف کے باعث ملک فرید کا اُس سے ملنا جلنا موقوف ہے مگر دونوں کے بیچ موجود خونی رشتے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مرتبہ لاہور میں میری اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس نے میرا ایک کام نکلوایا تھا۔ وہیں پر اُس نے کہا تھا کہ میں ملک فرید کا ہر طرح سے خیال رکھوں۔ اُسے کوئی گزند نہ پہنچاؤں۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ مجھے دھمکی دے رہا ہو کہ اگر فرید کو کچھ ہوا تو وہ یہاں آ کر میرا کچومر نکالنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ میں شیر ہوں مگر طاقت کے زعم میں عقل کی آنکھیں بند نہیں رکھتا۔ جانتا ہوں کہ وہ شیر پر ببر شیر ہے۔"

اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ سردار ٹھیک کہتا تھا۔ بکریوں کو نوچنے والے بھیڑیے کا شیر سے مقابلہ یک طرفہ نتائج لاتا ہے۔ دل میں شکر کیا کہ اپنا اور ملک کا قد ماپنے میں سردار کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوا تھا۔ بولا۔ "سردار! اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سامنے آ کر ملک پر وار نہیں کر سکتے۔ ایک صورت باقی ہے۔ وہ جس آدمی کو کھڑا کرتا ہے، اُسے جیتنے دیا جائے۔ جب جیت جائے تو اُس پر دباؤ ڈال کر اپنی پارٹی میں شامل کر لیا جائے۔"

سردار نے ستائشی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ایسے میں فلموں کے ولن کے جیسا دکھائی دینے لگا تھا۔ اٹھ کر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ٹہلنے لگا۔ ہاتھ پیچھے باندھ رکھے تھے۔ مونچھوں کو حسبِ عادت بل دیتے ہوئے اُس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ تھپکی دیتے ہوئے بولا۔ "واہ عالمگیر! یہ ہوئی نا بات۔ کیا تم پُر یقین ہو کہ ملک کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امیدوار کو جیتنے کے بعد تم اپنی پارٹی کی چھتری تلے لانے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟"

وہ سفاک انداز میں مسکرانے لگا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔ آنکھیں بول اُٹھیں۔ "دنیا میں تم سے بڑھ کر خود سر اور ناگ صفت کوئی شخص نہیں۔ تمہاری دُم پر پیر آتا ہے تو چیخ اُٹھتے ہو۔ تمہاری کمزوری پر ہاتھ ڈالوں تو تم بھی منہ کے بل آن گرو گے۔ یونین کونسل کے ناظم کی کیا اوقات ہے کہ دُم ہلاتا ہوا میرے پیچھے نہ چلے۔"

سردار کو اُس کا جواب مل گیا۔ ستائشی انداز میں اُسے دیکھ کر مسکراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ عالمگیر کو ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اشارہ مل چکا تھا۔ وہ اُٹھا اور کمرے سے نکل کر اپنی سوزوکی کی طرف بڑھ گیا۔

ٹھکانے پر پہنچا تو بشیر خان کو متفکر پایا۔ دریافت کرنے پر اُس نے بتلایا۔ "مجھے اُڑتی اُڑتی خبر ملی ہے کہ رفیع اللہ خان کا تبادلہ ہمارے تھانے میں ہو رہا ہے۔"

عالمگیر نے چونک کر پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

بشیر خان نے کہا۔ "مجھے اے ایس آئی محمد بخش نے فون پر بتایا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُس کے چارج لینے پر ہم سب لوگوں کو انڈر گراؤنڈ ہونا پڑے گا۔"

عالمگیر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ رفیع اللہ کو بخوبی جانتا تھا۔ گزشتہ چار سالوں سے دوسرے ضلعے کے ایک تھانے میں بطور ایس ایچ او تعینات تھا۔ محکمے میں اُسے "کالی بھیڑ" کا نام دیا جاتا تھا۔ لوگوں کے نزدیک ملک بھر میں سب سے زیادہ دیانت دار انسپکٹر قرار پاتا تھا۔ رشوت نہیں لیتا تھا۔ کسی سیاسی وڈیرے کی اجارہ داری کو قبول نہیں کرتا تھا اور نہ ہی مجرموں کو رُو رعائت دینے کا قائل تھا۔ اُس کی پشت پر اُس کا کزن تھا جو ڈی آئی جی کے عہدے پر فائز تھا۔ اِس لئے عام تو عام رہے، خاص لوگوں کو بھی قانون شکنی کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

وہ رفیع اللہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ اُسے اپنے سردار کے رسوخ پر کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ بکنے والے پولیس آفیسرز کے دم پر اُس کی مونچھوں کو بل آتا تھا۔ رفیع اللہ جیسے سرفروش پولیس آفیسر کے سامنے اُس کے اوپر تک کے تمام تعلقات بے معنی ثابت ہونے والے تھے۔ وہ بولا۔ "بشیر! وہ جہاں بھی گیا، ہر ایک کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہوا۔ ہمارے سردار جیسے طرم خان ہر حلقے میں موجود ہیں جو بدمعاشی اور بے ایمانی کی بیساکھی پر چل کر اسمبلی میں پہنچتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں پکڑوا کر رشوت کے عوض چھڑوانے

والے ووٹوں پر سوالیہ نشان بن کر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں چوڑیاں پہن کر بیٹھنا پڑے گا جب تک وہ یہاں سے چلا نہیں جائے گا۔"

کچھ سوچنے کے بعد اُس نے فون پر اے ایس آئی سے رابطہ کیا۔ "پیارے! کبھی خوشی کی خبر نہیں دیتے ہو، لگتا ہے کہ ڈراوے دینے پر محکمے نے تجھے تعینات کر دیا ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ سنبھل کر بولا۔ "عالمگیر! حکم کا یکہ ہمیشہ انڈر ورلڈ والوں کے پاس نہیں رہتا، کبھی ہمارے ہاتھ بھی لگ جاتا ہے۔ میری مانو تو اپنے پتے چھپا لو۔"

عالمگیر کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال سا تن گیا۔ بولا۔ "کوئی ایسا طریقہ بتلاؤ کہ وہ یہاں آنے کی بجائے کسی اور طرف بھیج دیا جائے۔ اُس کے آنے سے ہمارے ساتھ ساتھ تم سب اہلکار بھی مشکلات میں گھر جاؤ گے۔ کوئی طریقہ سوچو۔"

محمد بخش نے کہا۔ "بڑی سرکار نے اُسے یہاں پہنچنے سے روکنے کی ایک تدبیر کی ہے۔"

بڑی سرکار سے مراد، سردار فضل خان کی پارٹی کا سربراہ سردار مظفر علی خان تھا۔ مزید بتانے لگا۔ "اُس نے رفیع اللہ کے تھانے کے متعلقہ علاقے کے لوگوں میں اپنے کارندے بھیجے ہیں۔ وہ مقامی عوام کو ساتھ لے کر ہڑتال کر رہے ہیں۔ اُن کا مطالبہ ہے کہ رفیع اللہ کو اُن کے تھانے پر ہی تعینات رکھا جائے۔ تبادلہ نہ کیا جائے۔ دیکھیں کیا بنتا ہے؟"

سانپ کو گھیرنے کیلئے سپیرے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، عالمگیر یہ سوچ کر مسکرانے لگا۔ بڑی سرکار کی اِس گیم سے سانپ بھی مر جاتا، لاٹھی بھی بچ جاتی اور اُجلے لباس پر خون کے دھبے بھی نہ پڑتے۔ دو تین دنوں میں ہی اُوپر تک واویلا مچ گیا۔ ہر طرف رفیع اللہ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ پہلا انسپکٹر تھا جس کیلئے عوام سڑکوں پر نکل آئی تھی۔ بڑی سرکار کی گیم بڑی کامیابی سے چل رہی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اچانک شہر کے اجنبی لوگ سڑکوں پر نکل آتے تھے اور اپنے ساتھ عوام کو ملا کر جلوس کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ عوام نے یہ دھمکی بھی حکام بالا تک پہنچا دی تھی کہ اگر رفیع اللہ کا تبادلہ کیا گیا اور نیا انسپکٹر تعینات کیا گیا تو وہ تھانے کی عمارت کو آگ لگا دیں گے۔ سڑکوں پر جلتے ہوئے ٹائروں کا دھواں ایوانوں تک پہنچا تو ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔

عالمگیر سردار فضل خان کی ہمراہی میں بڑی سرکار کے دربار میں پیش تھا۔ سردار نے متفکرانہ انداز میں کہا۔ "انتخابات سر پر ہیں۔ ایسے میں رفیع اللہ کو ہمارے تھانے میں بھیجا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا رہا ہے۔ میری طرف سے پیشگی عذر قبول کر لیا جائے۔ پورے حلقے میں سے پارٹی کو کوئی سیٹ نہیں مل سکے گی۔"

بڑی سرکار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ایک تھانیدار سے ڈرتے ہوئے آپ کچھ عجیب سے لگتے ہیں۔ کیا ایک ایم پی اے ایک بگڑے ہوئے تھانیدار کے ہاتھ کاٹنے کی طاقت نہیں رکھتا؟...... میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔ کھل کر اُسے روکوں گا تو وہ میرے لئے مشکلات پیدا کرے گا۔ جہاں اُسے روکنا چاہتا ہوں، وہاں کے بڑے بھی اُس سے تنگ ہیں اور اُسے تھانے سے نکالنے کیلئے بہت اُوپر تک اَپروچ کئے بیٹھے ہیں۔ میرے پاس عوام کو کھڑا کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ میں کر چکا ہوں اور شکار کی رُغبت کیلئے چارہ ڈال کر بیٹھ گیا ہوں۔"

سردار نے پوچھا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُسے ہمارے تھانے کی بجائے کسی اور تھانے میں بھیج دیا جائے۔ بڑی سرکار! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ سمیت ہم سب لوگ جس طریقے سے سیٹ نکالتے ہیں، اُس طریقے پر پردہ ڈالنے والے یہی لوگ ہیں۔ ہم نے اِس بازی کو ہاتھ سے گنوایا تو سمجھ لیجئے گا کہ سیاست کی بساط بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ بڑے حلقوم والے اجارہ داروں کے گلوں میں ایمانداری کی ایک ہڈی پھنس گئی تھی۔ سردار بڑی سرکار کے کان کے قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "اگر کہیں تو اُسے پکا پکا ٹرانسفر کر دیں؟"

یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھیں عالمگیر پر جمی ہوئی تھیں۔ عالمگیر کی ریڑھ کی ہڈی میں کرنٹ کی طرح خوف کی سرد لہر سرایت کر گئی۔ دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ بڑی سرکار اِس منصوبے کی اجازت نہ دے۔ سردار مظفر علی خان اپنی عادت کے مطابق اوپر والے دانتوں کے نچلے سروں پر شہادت کی انگلی کی ٹھوکریں مارنے لگا۔ دونوں اپنے اپنے زاویوں سے امید بھری نگاہوں سے اُسے سوچ میں پڑا ہوا دیکھنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد وہ گھمبیر آواز میں گویا ہوا۔ "یہ میں نے بھی سوچا تھا۔ آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جیسے ہم لوگ اندروانداری ایک ہیں، ایسے ہی یہ نام نہاد ایماندار بھی ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہیں۔ رفیع اللہ کے پیچھے ایس ایس پی سلطان خان اور اُس کا ڈی آئی جی کزن اُس کی حفاظت کیلئے کمربستہ کھڑے ہیں۔ اُسے چھیڑ کر ہم کسی نئی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"

سردار فضل خان معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ رازدارانہ انداز برقرار رکھتے ہوئے بولا۔
''اپنا عالمگیر اتنی صفائی سے ہاتھ بچا کر......''

سردار مظفر نے ہاتھ اٹھا کر اُسے روکتے ہوئے کہا۔ ''نہیں سردار فضل خان! ہر گھی ٹیڑھی انگلیوں سے نہیں نکلتا۔ وہ اگلے ہفتے تمہارے علاقے کے تھانے کا چارج لینے پہنچ رہا ہے۔ عوامی ہڑتالیں اور جلسے جلوسوں کو اوپر والوں نے اہمیت نہیں دی ہے۔ اُس کی آمد پر تم دریا پار والوں کو اپنے حلقے میں مصروف کر دینا۔ رفیع اللہ کی تمام تر توجہ دریا پار والوں کی چھوٹی چھوٹی وارداتوں کو روکنے اور انہیں پکڑنے پر مرکوز رہے گی۔ عالمگیر اپنے کام پر پہلے سے زیادہ احتیاط سے لگا رہے گا۔''

سردار فضل بڑی سرکار کا ہم خیال تو نہیں بنا مگر ماننے کے سوائے کوئی چارہ نہ پا کر اثبات میں سر ہلاتا ہوا عالمگیر کے ساتھ اُٹھ آیا۔ راستے میں عالمگیر سے مخاطب ہوا۔
''سردار مظفر علی خان کو بھی ہم نے خواہ مخواہ ہی بڑی سرکار بنا رکھا ہے۔ وہ اِس مرتبے کا اہل نہیں ہے۔''

عالمگیر نے کہا۔ ''سردار! تم خواہ مخواہ ہر بات دل پر لے لیتے ہو۔ اگر پارٹی کو ہمارے مفادات کی فکر نہیں ہے تو ہمیں کیا پڑی ہے خود کو آگ میں جھونکنے کی۔ تم اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہو۔ نچلی سیٹوں پر پارٹی کامیاب ہوتی ہے یا نہیں، اِس سے ہمیں کیا لینا دینا۔''

سردار نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''خالی بندوق ہاتھ میں ہو تو صرف ٹھیکا بن سکتا ہے۔ گولی نہ ہو تو دشمن کو زیر نہیں کیا جا سکتا۔ نچلی سیٹوں پر اپنے بندے نہ ہوں تو اِن غریب غربوں کے پر نکل آتے ہیں اور یہ ہماری سجدہ گاہوں میں ماتھا ٹیکنے کیلئے نہیں آتے۔ ہمیں دونوں ہاتھوں میں برابر طاقت رکھنا پڑتی ہے۔ اوپر والے ہاتھ کی گرفت ختم ہو گی تو ہمیں اوپر سے کچھ نہیں ملے گا۔ نیچے والے ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں تو روٹی کو ترستے ہوئے لوگ ہمارے گریبان تک پہنچ جائیں گے۔''

عالمگیر بڑے غور سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ اِس اَن پڑھ شخص کو اپنا اقتدار بچائے رکھنے کے بڑے گُر آتے تھے۔ اتنی گہرائی تک کوئی ماہر سیاسیات بھی نہیں اُتر سکتا تھا جتنی گہرائی میں وہ اتر کر تیرنے لگتا تھا۔ بولا۔ ''سردار! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ملک فرید نے اپنے بھائی کے توسط سے رفیع اللہ کو یہاں منگوایا ہو۔ اُس کا یہ خیال ہو کہ ہم پر تھانے کا راستہ بند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر کے وہ اپنے امیدوار کو بہ آسانی کامیاب کروا لے گا۔''

سردار نے ہنکارا ابھرا۔ سوچ کر بولا۔ ''تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔''

گاڑی آگے چل رہی تھی۔ عالمگیر کا ذہن پچھلے انتخابات کی پُر ہجوم گلیوں میں دوڑنے لگا۔ واضح طور پر سردار کے حریف کی سیٹ نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ عین موقع پر اُس کی دُم پر عالمگیر نے ایسا پاؤں رکھا کہ اُسے انتخابات سے چھ دن قبل ہی عوامی جلسے میں سردار فضل کے حق میں دستبرداری کا اعلان کرنا پڑا تھا۔ تبھی تو بشیر خان نے اُسے کہا تھا۔ ''عالمگیر! یہ الیکشن سردار نے نہیں، تم نے جیتا ہے۔''

سردار اپنا سر سیٹ پر ٹیکے ہوئے آنکھیں موند کر گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ ایسی ہی کیفیت میں رہتے ہوئے بولا۔ ''مگر ملک کے اپنے بھائی سے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ اتنے معمولی سے کام کیلئے وہ اپنے بھائی کی مدد نہیں لے سکتا۔''

عالمگیر نے کہا۔ ''سردار! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ جہاں مفاد ہوتا ہے، وہاں اَنا اور ضمیر تھپک کر سلا دیے جاتے ہیں۔ تم بھی تو مخالفوں کے ڈیرے پر مطلب نکالنے کیلئے پہنچ جاتے ہو۔ جھک کر کام نکال لیتے ہو۔ دل کو سمجھانے کیلئے یہ بھی کہتے ہو کہ سیاست میں کوئی سجن نہیں ہوتا، کوئی دشمن نہیں ہوتا۔ وہ تو پھر اُس کا سگا بھائی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود نہ گیا ہو، اپنے بیٹے کو بھیج دیا ہو۔''

سردار نے اُسے استعجاب آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ لوگ کونین کی گولی شوگر میں لپیٹ کر کھلاتے ہیں۔ وہ شوگر کو کونین میں لپیٹ کر حلق میں ٹھونس رہا تھا۔ سر ہلاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ جوان آدمی ہے، یہ سمجھ نہیں سکتا کہ اس دنیا میں اپنے وجود کو قائم رکھنے کیلئے ضمیر اور ایمان کی قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔ دونوں میں سے ایک چیز ہی بچائی جا سکتی ہے۔ اقتدار یا ضمیر۔''

بقیہ سفر خاموشی سے کٹا۔ سردار الیکشن کے بارے میں سوچتا رہا۔ عالمگیر، رفیع اللہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ آج تک مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ کافی کچھ اُس کے بارے میں سُن ضرور رکھا تھا۔ جتنا کچھ سنا تھا، وہ حوصلے کی حویلی ڈھانے کیلئے کافی تھا۔ اُس نے تو یہاں تک سن رکھا تھا کہ وہ بڑی سرکار کو بھی اپنے اصولوں پر سودے بازی کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی اُس کے کارندوں کو خاطر میں لاتا ہے۔ ہاتھی کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر پٹخنے کی طاقت

رکھنے والا شیر کو کہاں دھاڑنے کا موقع دے گا۔ وہ بے دھیانی کے عالم میں سر کھجلانے لگا۔ بڑی سرکار اور سردار فضل کی طرح اُس کے اپنے بھی کچھ مقاصد تھے جو رفیع اللہ کی آمد پر خطرات کا شکار ہوتے دکھائی دینے لگے تھے۔

سردار کی کوٹھی سے نکلتے ہی وہ نور پور پہنچا۔ منیرے قصائی کو تلاش کرنے میں اُسے آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ ایک زمیندار کے گھر میں حقہ گڑگڑاتا ہوا مل گیا۔ اُسے دیکھ کر بولا۔ ”لگتا ہے تمہیں بھی رفیع اللہ کی آمد کا پتہ چل گیا ہے۔ یار عالمگیر! بڑا غضب ہوا۔“

وہ مسکرانے لگا۔ بھرم رکھنے کو بولا۔ ”سامنے آئے گا تو اُس کے بازوؤں کی طاقت کا اندازہ ہوگا۔ تم سناؤ۔ ملک سے بات ہوئی؟“

وہ بولا۔ ”ہاں! میں نے ملک کو مشورہ دیا تھا کہ وہ رقبہ بیچ دے۔ وہ پہلے تو مانا ہی نہیں، جب مانا تو اَڑ گیا کہ وہ رقبہ کسی نور پور کے ضرورت مند زمیندار کے ہاتھ بیچے گا، سردار فضل کو نہیں دے گا خواہ وہ دُگنی قیمت ہی کیوں نہ دے۔“

وہ مایوس ہو کر بولا۔ ”یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ سردار فضل خان ہر قیمت پر رقبہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

منیرے قصائی نے کہا۔ ”اُسے سمجھا کہ اِس ضد سے باز آجائے۔ اِس میں اُس کا ہی فائدہ ہے۔“

عالمگیر دل ہی دل میں بولا۔ ’اُسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ میرے بتلانے پر اُس کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔‘ منیرے قصائی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یہ تو پتہ ہوگا ہی کہ ملک بستی میں کس جوڑی کو الیکشن میں کھڑا کر رہا ہے؟“

منیرا ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی بڑی معنی خیز تھی۔ اپنا منہ اُس کے چہرے کے قریب لا کر بولا۔ ”چوہدری باسط علی اور شکور پٹھان کے علاوہ کس کو کھڑا کر سکتا ہے۔ پورا گاؤں چوہدری باسط کے رشتہ داروں پر مشتمل ہے جبکہ نور پور یونین کونسل کے حلقے میں جابجا پٹھان بیٹھے ہوئے ہیں جو برادری کی بنیاد پر شکور پٹھان کو ہی ووٹ دیں گے۔“

عالمگیر سوچ میں پڑ گیا۔ ہمیشہ راج کرنے والا سردار فضل خان مسائل میں گھرتا جارہا تھا۔ رفیع اللہ کے بعد چوہدری باسط کی مقامی سیاست کے اکھاڑے میں اُترنے کی خبر نے رہی سہی کسر نکال دی۔ سردار کا گزشتہ تین سالوں سے چوہدری باسط کے ساتھ بائیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایکڑ اراضی پر مقدمہ عدالت میں چلتا آرہا تھا۔ وہ کسی بھی طرح اراضی سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ مقدمے کا رخ بتلاتا تھا کہ سردار کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے بولا۔ ”منیرے! چوہدری باسط کا ناظم بننا گاؤں کیلئے بہت فائدہ مند ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بڑا جی دار اور غریب پرور بندہ ہے۔ گاؤں کی حالت بدل کے رکھ دے گا۔ مگر کیا ہی اچھا ہو کہ وہ سردار فضل کی پارٹی میں شامل ہو کر الیکشن لڑے۔“

منیرا اَن پڑھ آدمی تھا۔ حیران ہو کر بولا۔ ”اِس سے کیا فرق پڑے گا؟“

عالمگیر نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ تم اور میں دونوں بڑوں کے کارندے ہیں۔ بڑوں کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں مگر ہماری یاری پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ سچ کہتا ہوں۔ اگر چوہدری باسط سردار والی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لے تو اُسے اوپر سے بہت زیادہ فنڈز ملیں گے۔ اپوزیشن میں جانے سے وہ گاؤں کیلئے کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔“

بات منیرے کی سمجھ میں آ گئی۔ عالمگیر اُسے مطمئن کر کے بھی مطمئن نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کا ملک اِس باریکی پر ایمان نہیں لائے گا۔ اپوزیشن پارٹی کے لیڈروں سے اُس کے گہرے تعلقات تھے۔

منیرے سے بغل گیر ہو کر وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ سردار کو فون پر اطلاع دی۔ ”سردار! ملک فرید نے چوہدری باسط اور شکور پٹھان کو کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ دونوں امیدواروں کی لمبی چوڑی برادری حلقے میں مقیم ہے۔ وہ کسی طرح بھی ہارتے نظر نہیں آتے اور نہ ہی ہمارے پاس اُن کے مقابلے کے امیدوار موجود ہیں۔“

سردار کی پریشان آواز سنائی دی۔ ”یہ تو بہت بری خبر ہے۔ تم ایسا کرو کہ میری اور ملک فرید کی ملاقات کا بندوبست کرو۔ میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

اُس نے حامی بھرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

بشیر خان کھانا تیار کر چکا تھا۔ کھانا چارپائیوں پر چنتے ہوئے بولا۔ ”عالمگیر! انتخابات کے دنوں میں رفیع اللہ کا علاقے میں آنا بہت برا شگون ہے۔ اُسے اگر ہمارے گینگ کا پتہ چل گیا تو وہ کسی رُو رعائت کے بغیر ہمیں جیل بھجوا دے گا۔ تم نے اِس بارے میں کچھ سوچا

ہے؟''

نہ اُس نے کچھ سوچا تھا اور نہ ابھی اِس پر غور وخوض کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اپنی توجہ ضروری امور پر مرکوز کر رہا تھا۔ کامیابی کیلئے انتشارِ فکر سے بچنا لازمی ہوتا ہے۔ وہ بولا۔

''بشیر خان! تم اور شبر دونوں دریا پار کے جفادریوں سے رابطہ اُستوار کرنے کی کوشش کرو۔ انہیں رفیع اللہ خان کے بارے میں بتلائے بغیر اِس لائن پر لگاؤ کہ وہ دریا پار کر کے آئیں اور اِس علاقے میں چوریوں اور وارداتوں کا بازار گرم کریں۔ ہم اُن کی پس پردہ مدد کریں گے۔''

شبر استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔ ''عالمگیر! کبھی شیر نے اپنا شکار کتوں کے حوالے کیا ہے جو ہم اُنہیں یہاں بلوائیں؟''

وہ ہنس پڑا۔ سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔ ''شیر کے سامنے بھینس کھڑی ہو تو وہ اپنی یکسوئی سے لطف اندوز ہونے کیلئے کتوں کو ہرن کے پیچھے لگا کر چالاکی اور عقلمندی کا ثبوت دیتا ہے۔ بھینس گرانے کیلئے ہمیں ہرن کو کتوں کے حوالے کرنا ہوگا۔ رفیع اللہ کو الجھانے کیلئے اُنہیں آگے لانا ہوگا۔ ایسے میں ہم پوری توجہ کے ساتھ اپنا کام کر سکیں گے۔ چھوٹی موٹی وارداتیں الیکشن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ سمجھے؟''

وہ سمجھا، یا نہیں، اختلاف کی جرأت نہ کرتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ ''عالمگیر! تم بہت گہرے آدمی ہو۔ بڑے آدمیوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہو، پڑھے لکھے ہو، وہ سب سمجھتے ہو جس سے ہم آگاہ ہی نہیں ہوتے۔''

اُس نے بشیر خان سے کہا۔ ''شکر ہے کہ بڑی سرکار نے رفیع اللہ کے قتل کا حکم نہیں دیا۔ اگر اُس کی چرخی اِس طرف گھوم جاتی تو ہمارے لئے بہت بڑی مصیبت کھڑی ہو جاتا تھی۔''

بشیر خان نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ بڑے لوگ اپنا راستہ کھولنے کیلئے ہمیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔''

رات کو خود کو نیند کے حوالے کرتے ہوئے وہ چارپائی پر دراز ہو گیا۔ ہر روز کی طرح پھر میز پر عموداً کھڑی کی ہوئی ٹارچ کا سایہ دیوار پر لرزاں ہو گیا۔ اُس نے تہیہ کیا کہ آج لالٹین کی طرف منہ کر کے نہیں لیٹے گا۔ سرہانے کی طرف سے چارپائی کو اونچا کرنے کیلئے اُس نے دو اینٹیں پائیوں کے نیچے رکھ دیں۔ دل ہی دل میں لالٹین کو مخاطب کر کے طنزیہ انداز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سوچنے لگا۔ 'شعلے کو حرکت دے کر تم سمجھنے لگتی ہو کہ تم میں جان پڑ گئی ہے۔ نہیں...... مُردوں میں کبھی جان نہیں پڑتی۔ تم مُردہ ہو۔ تمہارے شعلے میں آ کر کھڑی ہونے والی بھی مُردہ ہے۔ اُس کی نصیحتیں کفن اوڑھ کر نہ ختم ہونے والی نیند میں غرق ہو چکی ہیں۔'

سوچ میں گم تھا کہ اچانک چونکنا پڑا۔ ٹارچ کے سائے میں اُس کی ماں آن کھڑی ہوئی۔ اُس پر دزدیدہ نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں صرف لپکتے ہوئے شعلے میں آ کر کھڑی ہو سکتی ہوں؟ غلط فہمی میں مبتلا ہو عالمگیر! علم دین بن کر زندگی گزارتے تو کبھی شعلوں سے نہ ڈرتے۔ میں کبھی شعلے اوڑھ کر تمہیں کچوکے دینے کیلئے نہ آتی۔ اَب بھی وقت ہے، سنبھل جاؤ۔ اِن فرعونوں کی دنیا سے نکل جاؤ اور دنیا کے کسی پرسکون گوشے میں جا کر علم کے پودوں کی آبیاری کرو۔''

وہ زِچ ہو کر بولا۔ ''اماں! تم نے اِن بڑوں کی دنیا سے بھاگ کر کیا پایا؟ ساری عمر آبلہ پا دوڑنے میں گزار دی۔ ایک پل کا چین نہیں پایا تم نے؟ مجھے دیکھو...... میں اِن کے حلق میں نوکیلی ہڈی بن کر چبھنے والا ہوں۔ طعنے دینے کی بجائے میری حوصلہ افزائی کرو۔ میں تمہاری روح میں لگی آگ کو انہی فرعونوں کے خون سے بجھا دوں گا۔''

وہ نفی میں سر ہلا کر تیز لہجے میں بولی۔ ''مجھے اِن کے ناپاک خون سے اپنی پاکیزہ آگ بجھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں روکنے آتی ہوں۔ جیسے میری انگلی تھام کر تم نے اپنا بچپن سکول میں گزارا، ایسے ہی میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ ایک خوبصورت اور تعمیری دنیا تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔''

اُس نے کروٹ بدل کر ماں کو اوجھل کر دیا۔ نظروں کے سامنے بند کھڑکی تھی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا ایک طاق کھول دیا۔ باہر کی طرف سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ چاند کی مدھم روشنی میں اُسے یوں لگا جیسے وہ جیل کی سلاخوں کے سامنے آن کھڑا ہوا ہو۔ دل کانپ اٹھا۔ جیل کے شب و روز یاد آنے لگے۔ پھر سوچا۔ 'جیل کی سلاخوں سے گرم ہوا کے جھونکے بیرک میں داخل ہو کر روح تک کو جھلسا دیتے تھے۔ ان سلاخوں سے آزاد، ٹھنڈی اور تازہ ہوا اندر آتی ہے۔ پھر بھی مجھے جنت اور جہنم کے فرق کا کیوں پتہ نہیں چلتا؟'

اُس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ سردی کے باوجود وہ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ کھڑکی سے در آتی ہوا بہت ٹھنڈی لگ رہی تھی۔ سکون کا لہر در لہر احساس روح تک اترتا ہوا محسوس

ہو رہا تھا۔ لطف کشیدگی کے مرحلے کو شبر کی غنودگی بھری آواز نے پایہ تکمیل تک نہیں پہنچنے دیا۔ وہ بڑبڑایا۔ ''اوں ہوں عالمگیر! کیوں ہمیں نمونیہ کرواتے ہو۔ کھڑکی بند کردو، بہت سردی ہو رہی ہے۔''

کھڑکی بند کر کے وہ ایک طویل سانس حلق میں اتارتے ہوئے سوچنے لگا۔ 'ہم سب ایک جیسے ماحول سے نکل کر اِس گورستانی حویلی میں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے تعاقب میں آگ کی لپٹیں مچلتی آ رہی ہیں مگر یہ اتنے پُرسکون کیوں رہتے ہیں؟ انہیں سردی کیوں لگتی ہے؟ مجھے کیوں نہیں لگتی؟ یہ سب ایک جیسے ہیں۔ میں اِن سے مختلف ہوں۔ اِس کا مطلب ہے کہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔ مجھے خود کو بدلنا ہوگا۔'

ایک جیسے حالات میں زندگی کا سفر طے نہیں ہوتا۔ ایک کروٹ پر تمام رات نہیں گزرتی۔ اُس نے تھک کر کروٹ بدلی تو نگاہوں کے سامنے پھر ٹارچ کا سایہ لہرانے لگا۔ اُس نے غصے سے ہاتھ مار کر ٹارچ کو نیچے گرادیا۔ ٹارچ اُس کی چارپائی کے پایے کے نیچے رکھی ہوئی اینٹ پر جا گری۔ اُس کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ یوں لگا جیسے اُس کے بدن کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ اٹھا اور ٹارچ کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ بشیر خان نے لحاف سے منہ نکال کر کہا۔ ''اوئے عالمگیر! خدا نے نہ جانے کس اضطراب کے عالم میں تجھے بنایا تھا کہ سوتے میں بھی تخریب کاری پھیلاتے رہتے ہو۔ کبھی تو سکون سے سو جایا کرو۔''

وہ شرمندہ ہو کر لحاف میں دبک گیا۔ شعلے یا سائے میں آنے والی اُس کے لحاف میں نہیں آئی۔ ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اُس کے جانے پر دروازے سے چپک کر کھڑی نیند کی دیوی کمرے میں داخل ہوئی اور وارفتہ بانہیں وَا کیے عالمگیر کے لحاف میں گھس گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا جاتا ہے کہ امیر زادیوں کی پُرتعیش زندگی تفکرات اور واہموں سے پاک ہوتی ہے۔ وہ جو چاہتی ہیں، خرید لیتی ہیں۔ دنیا بازار ہے۔ ہر چیز بکنے کیلئے شوکیسوں میں دھری جاتی ہے۔ مفلس رال ٹپکاتا، محرومیت بھری نگاہ سے دیکھتا آگے گزر جاتا ہے۔ پیسے والا اپنے دل کو للچائے بغیر خرید لیتا ہے۔ اُس کی خواہش درد کی صورت اختیار کرنے سے قبل ہی پوری ہو کر مٹ جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ سچ ہو۔ سیانے ٹھیک کہتے ہوں مگر شاہانہ کے اطراف میں نوٹوں کی گڈیوں نے ایک دوسرے سے جڑ کر دیوار کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اِس دیوار کے پار خواہشوں کا بازار تھا۔ وہ اِس دیوار کو پھلانگنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ ہر چیز کی دستیابی کا دعویٰ رکھنے والے بازار میں اُس کے جذبات کی آسودگی کا کوئی سامان بکاؤ نہیں تھا۔

اونچے شملے والے لوگوں کی کالونی میں واقع اپنے باپ کی پُرتعیش اور بڑے قد والی کوٹھی کے بڑے سے بیڈروم کی نیلی جذبات خیز روشنی میں وہ بیڈ پر نیم دراز ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ بڑے کہتے ہیں کہ شراب میں نشہ نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو سب سے پہلے اپنے پیندے کے بل پر بوتل ناچنے لگتی۔ ٹی وی کی ننھی سی سکرین میں سوائے متحرک تصویروں کے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ہوتا تو وہ بھی اپنے بال سفید کر بیٹھتا۔ کبھی لڑکھڑا کر گر پڑتا۔ کبھی کسی دوشیزہ کی جوانی کو منعکس کرتے ہوئے شور مچانے لگتا۔

بوتل پُرسکون تھی۔ پینے والی دھڑکن کی یک رُو سروں پر کمبل میں لپٹے پیروں میں انجانی پائل باندھے محوِ رقص تھی۔ دائیں پنڈلی پر بائیں پیر کا لمس بھی عجیب لگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ غضب کی سردی کے باوجود پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے

چمکنے لگے جن میں سکرین سے پھوٹنے والے رنگ منعکس ہوکر لرزنے لگے تھے۔ اُس نے جذبات آگیں سانس حلق میں اُتار کر کمبل کے نرم گداز کو سینے میں اُتارنے کی اپنی سی کوشش کرڈالی۔ چین نہیں آیا۔ ریموٹ سے ٹی وی آف کردیا۔ کمرے میں یک لخت اندھیرا پھیل گیا۔ نائٹ بلب کی نیلی روشنی ناکافی لگنے لگی۔

جوانی میں نہ تو دھڑکن پر قابو پایا جاسکتا ہے اور نہ ہی سانسوں کی بڑھتی گھٹتی رفتار پر دسترس قائم رہتی ہے۔ ٹی وی کا ننھا سا سرخ بلب روشن تھا۔ سکرین یوں مردہ تھی جیسے مرنے والے کی روح نے اچانک اُس کا ساتھ چھوڑ کر ٹھنڈا ٹھار کردیا ہو۔ مردہ سکرین اپنے آخری منظر کو اُس کی نگاہوں میں ٹھہرانے میں کامیاب ہوچکی تھی۔

وہ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے آہستگی سے اُٹھی، کھڑکی تک آئی اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی کھولنے کی ہمت نہ پڑی۔ باہر گہری کہر آلود رات طاری تھی۔ اطراف کے امیر زادوں کی کوٹھیوں پر سکوت طاری تھا۔ رنگ برنگے بلب روشن تھے جو خبر دے رہے تھے کہ مکینوں نے پُرحدت رات اوڑھ رکھی ہے۔ خبردار! کوئی جگانے کی کوشش نہ کرے۔ لٹیرے سونے والوں کی بے آرامی کو خاطر میں نہیں لایا کرتے۔ دیوار پھاند کر اندر داخل ہوجاتے ہیں۔ جو دن کی روشنی میں اپنے اونچے قد کے باعث سر کے بالوں تک ہاتھ نہیں پہنچنے دیتے، رات کی نیند میں زمین سے دوفٹ متوازن بلند لیٹے ہونے کے باعث بالوں سے پکڑ کر اُٹھا دیے جاتے ہیں۔

وہ بالوں سے پکڑ کر اُٹھائی نہیں گئی تھی۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کسی نے بستر سے نکلنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑبڑائی۔ "یہ اچانک مجھے کیا ہوجاتا ہے؟ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں۔ باپ کہتا ہے کہ میں خاص ہوں۔ میرے جیسی دنیا میں کوئی نہیں۔ پھر میری جوانی عام لڑکیوں کی طرح کیوں بے چین کرنے لگتی ہے۔"

اُس کے باپ نے یونیورسٹی میں بھیجتے ہوئے اُسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اُسے اپنے لئے جیون ساتھی چننے کی پوری آزادی حاصل ہے مگر آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوڑے کے ڈھیر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائے۔ سمجھا دیا گیا تھا کہ اُس کی زندگی میں اُترنے والے کو قبولیت کی سند صرف اس صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ اُس کا ہم پلہ ہو۔ بڑے نہیں، بہت بڑے خاندان کا چشم و چراغ ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یونیورسٹی میں انسانوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ بھیڑ میں سے کسی اپنے جیسے کو ٹٹول ٹٹول کر تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ تین ماہ سے آنکھوں پر پٹی باندھے ٹٹولنے میں مصروف تھی۔ انگلیاں چھلنے کو آگئی تھیں مگر کوئی لمس آشنائی کا جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ تنہائی کی ہر رات میں دل کو مٹھی میں جکڑ کر جگا دینے والا کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

بے دھیانی میں پردے کو سختی سے پکڑ کر جھول گئی۔ پردے کا ہینگر ٹوٹ گیا۔ وہ لہرا کر قالین پر دھپ سے گر گئی۔ پردہ اُس پر غریب کی چادر کی طرح گر کر سایہ فگن ہوگیا۔ اُس نے پردے کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئی۔ گرنے سے تھوڑی سی تکلیف کا احساس ہوا تھا مگر اِس کی جذباتی کیفیت پر احسان کرتے ہوئے وہ بھی مزہ دے گیا۔ آنکھیں موندے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

کافی دیر گزر گئی۔ تپتا ہوا بدن ٹھنڈا ہوا تو سردی لگنے لگی۔ اُٹھ کر کمبل میں گھس گئی۔ جی چاہتا تھا کہ ٹی وی آن کر کے بقیہ فلم دیکھے۔ بدن پہلی بار منکر ہوگیا۔ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ "اَب بہت ہوچکی ہے۔ جھوٹے منظر دکھا دکھا کر مجھے خوامخواہ آگ کی بھٹی میں جھونکتی رہتی ہو۔ آگ سے باہر نکال کر نچوڑنے لگتی ہو۔ میں اَب بہت ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ مجھے سونے دو۔"

نیند نہیں آئی تو دروازہ کھول کر متصلہ کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ اُس کی مستقل خدمت گزار رحمت بی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ دروازہ کھول کر بولی۔ "شانی بی بی! خیر تو ہے؟ اکیلے میں ڈر لگنے لگا ہے کیا؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ رحمت بی دوپٹہ درست کرتی ہوئی اُس کے ساتھ بیڈروم میں آگئی۔ وہ رحمت بی کے نیم بوڑھے بدن سے لپٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ چند لمحوں میں ہی یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ گٹھلی چوسنے سے نہ تو زبان کو ذائقہ ملتا ہے اور نہ ہی پیٹ بھرتا ہے۔ آم دسترس سے باہر تھا اس لئے وہ گٹھلی چوسنے لگی۔ رحمت بی اُس کے لرزتے بدن کو اپنے بدن میں چھپاتے ہوئے سوچنے لگی۔ "جوانی تو مجھ پر بھی آئی تھی۔ سوتے میں ڈرنے کی عادت مجھے بھی تھی مگر کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ ڈرے ہوئے بدن نے آگ پکڑ لی ہو۔ ڈر ٹھنڈا کرتا ہے، تپانے والا جذبہ کوئی اور ہی نام رکھتا ہے۔ اللہ خیر کرے!"

رحمت بی کے باپ نے اُس کی جوانی کو آگ پکڑنے سے پہلے ہی برف کی سِل پر

جمادیا تھا۔ وہ بمشکل اٹھارویں سن میں پہنچی تھی کہ باپ نے بیاہ کرا اپنے بھتیجے کے حوالے کردیا۔ علی محمد اُس وقت تیس کا تھا۔ غریبوں کے گھروں میں ایسی شادیوں کو بے جوڑ قرار نہیں دیا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے کہ دلہن کو دلہا سے دس پندرہ سال کم عمر ہی ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہی تو کہا جاتا ہے۔ غریب زادی کا بدن بہت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

وہ سوچنے لگی کہ سردار فضل کے ہاں کس چیز کی کمی ہے۔ کروڑوں روپے کا جہیز تیار پڑا ہے۔ برادری اُس کے دروازے پر آئے روز ماتھا ٹیکنے کیلئے آئی رہتی ہے۔ بیٹی بائیسویں سال میں قدم رکھ چکی ہے۔ چڑھتی جوانی کو محبت کی پان چڑھا کر میان میں رکھ دینا چاہیے ورنہ کسی سکندر کے ہاتھ میں آ کر قتل و غارت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اُس نے ایک مرتبہ دَبے دَبے لفظوں میں سردار سے اُس کی شادی کی بات چھیڑی تھی۔ سردار نے یہ کہہ کر اُس کی زباں بند کردی تھی کہ ابھی مناسب وقت نہیں آیا۔ جب آئے گا، شادی کردی جائے گی۔ چودہ سال تک شادی کی کڑاہی میں تیل کی طرح تڑکنے والی رحمت بی اُس کے وجود کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے پریشان ہو رہی تھی کہ مناسب وقت اور کیا ہوتا ہے؟

صبح دیر سے اُٹھی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر نیچے اُتر آئی۔ ڈرائیور اور باڈی گارڈ چوکس انداز میں کھڑے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اچٹتی ہوئی نگاہ دونوں پر ڈال کر، سلام کا جواب دے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بیک مرر میں جھانکنے سے ڈرائیور کی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ آج مرر ہلا ہوا تھا۔ بے دھیانی میں بیک مرر پر نگاہ پڑی تو اپنی ہی آنکھیں دکھائی دیں۔ ہیجانِ شب نے آنکھوں میں لال ڈورے نصب کردیے تھے۔ اُس کی سہیلیاں ستائش بھرے لہجے میں کہا کرتی تھیں۔ ”شانی ڈیئر! تمہاری آنکھیں بڑی مدھ بھری ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے تم نے پی رکھی ہے۔ آنکھوں میں جھانکنے والے پر بھی نشہ چڑھنے لگتا ہے۔ کون سا کاجل استعمال کرتی ہو؟“

وہ رات بھر آنکھوں میں چبھنے والے کاجل کا نام نہیں بتلا سکتی تھی۔ جھینپ کر منہ پھیر لیا کرتی تھی۔ دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ اُس نے ادا سے اپنی آنکھیں چھپائی ہیں۔ ایسا نہیں تھا، وہ دِل کی چوری کو چھپا کر مسکرایا کرتی تھی۔ کیمپس میں پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی اپنی مخصوص جگہ پر کھڑی کردی۔ اُس کیلئے دروازہ کھول کر بولا۔ ”شانی بی بی! آج کس وقت تک فارغ ہو جائیں گی؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بسوں کے ڈرائیور ہارن بجا کر اپنا فرض پورا کردیتے ہیں۔ کوئی آئے یا نہ آئے، اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ زرخرید ڈرائیور تھا۔ اپنی سواری کے مزاج پر چلنے کی تنخواہ وصول کرتا تھا۔ سردار فضل نے اُسے ایک اور فرض بھی سونپ رکھا تھا۔ شانی بی بی جہاں بھی جائے، جس سے ملے اور جو بھی کرے، پل پل کی رپورٹ سردار تک پہنچانے کا معاوضہ اُسے الگ سے ملتا تھا۔

اپنی مسلسل جاسوسی کا شانی کو بھی علم تھا۔ کوئی دل میں چوری کی نیت سے آج تک اُترا ہی نہیں تھا جس کو ڈرائیور کے چہرے پر فٹ باپ کی نگاہوں سے چھپانا مقصود ہوتا۔ اِس لئے اُسے کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ پھر آپوں آپ ہی جواں بدن سے گنج اُترنے لگی۔ گزشتہ چند دنوں سے ایک واردات چل رہی تھی۔

وہ ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”میں جلد ہی فارغ ہو جاؤں گی۔ ایک ڈیڑھ بجے تک۔ تم یہیں رہو۔“

وہ گراسی پلاٹوں کے وسط میں بنی ہوئی روش پر چلتی ہوئی اپنے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوگئی۔ سیکنڈ فلور پر جانے کیلئے زینوں پر رئیس سے قدم مل گئے۔ وہ اُس کے دائیں پہلو میں برابر قدم اُٹھاتے ہوئے زینے پھلانگ رہی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ”عورت کے شانہ بشانہ چلنے کی خبریں سنتے رہتے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ یقین ہوا کہ واقعی عورت مرد سے قدم ملا کر چلنے کی طاقت رکھتی ہے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”صدیوں سے دل سے دل ملا کر چلتی عورت پر مرد کو یقین نہیں آیا، تمہیں ایک دن میں کیسے آ گیا؟“

وہ لاجواب ہو کر طنزیہ انداز میں بولا۔ ”بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ باپ اپنے حریفوں کو گفتار میں لاجواب کردیتا ہے، تم اپنے حلیف کے ہونٹوں پر چپ کا قفل لگا دیتی ہو۔“

وہ ریلنگ پکڑ کر ہنسنے لگی۔ رئیس دل فگار نظارے کی زد پر بے خود ہونے لگا۔ بولا۔ ”اب کیا ہوا؟“

وہ خود پر قابو پاتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں، تم بڑے باپ کا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ بااختیار وزیر کے بھائی بھی ہو۔ جو جتنا چھوٹا ہوتا ہے، اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمہارے گھر میں دو بڑے موجود ہیں۔“

"یہ کیمپس ہے۔ یہاں ایسی باتیں کر کے ہم اپنا خاندانی قد چھوٹا کر بیٹھیں گے۔" آنکھیں چراتے ہوئے بولا۔ "کم آن! کلاس کا وقت ہو رہا ہے۔"

کاریڈور خاصا لمبا تھا۔ اُس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سوچنے لگی۔ "جو راستے دل سے نکل کر دل کی طرف جاتے ہیں، وہ اتنے مختصر کیوں ہوتے ہیں۔ اِس کاریڈور کو اتنا لمبا تو ہونا چاہیے تھا کہ چلتے چلتے زندگی کا سفر تمام ہو جاتا۔"

کاریڈور کا سفر ابھی باقی تھا مگر کلاس روم کے دروازے پر پہنچ کر رئیس رُک گیا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیڈیز فرسٹ!"

وہ شاہانہ انداز میں مسکراتی ہوئی قدم بڑھا کر کلاس روم میں داخل ہو گئی۔ کلاس میں عاماً سنجیدگی سے وقت گزارا کرتی تھی۔ حسبِ معمول اپنی نشست پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ "رئیس کو سال بھر سے دیکھتی آ رہی ہوں۔ عام دکھائی دینے والا آج بے سبب اچھا کیوں لگنے لگا ہے؟"

رئیس کی شخصیت پُرکشش تھی۔ اونچا لانبا قد...... گہری بھوری آنکھیں اور سلیقے سے سنواری ہوئی شخصیت لڑکیوں کے دل میں آئیڈیل کی طرح بس جاتی تھی۔ شانی کبھی اُس سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی روز بدلتی دوستوں کو دیکھ کر سوچا کرتی کہ اِن سب کو کیا ہو گیا ہے؟ کیوں یہ ایک ہرجائی صفت انسان کیلئے اپنی شخصیت پر انگلیاں اٹھوانا قبول کر لیتی ہیں؟......گزشتہ چند دنوں سے وہ بھی اُس میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ خراب بور والے نلکے میں پانی چڑھانے والا اُس کی آواز سے اندازہ لگا لیتا ہے کہ پانی آنے والا ہے۔ رئیس کائیاں مرد تھا۔ بھانپ گیا کہ نلکے کی نال پانی انڈیلنے والی ہے۔ چلو بڑھا کر کھڑا ہو گیا۔

آنکھ بچا کر کاغذ کی ایک چٹ اُس کے ڈیسک پر رکھتے ہوئے بولا۔

"جواب ضرور دینا۔"

اُس نے حیرانی سے دل کا سندیسہ لانے والی ننھی سی کاغذ کی چٹ کو دیکھا۔ لکھا تھا۔ "تمہاری گاڑی کا ڈرائیور اور باڈی گارڈ دونوں تمہارے تنخواہ دار ہیں یا تمہارے باپ کے؟"

وہ حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات آنکھوں میں لئے رئیس کو دیکھنے لگی۔ اطراف میں بیٹھنے والوں کی نظریں اُس پر گڑی ہوئی تھیں۔ دل ہی دل میں کوستے ہوئے بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پوری کلاس میں سفید کبوتر میری چھت پر اُتار کر تماشا بنا دیا اور کام کی بات کوئی لکھی ہی نہیں۔"

پرچی کو بے دردی سے پھاڑ کر پھینکتے ہوئے اپنی کھلی ہوئی کتاب پر جھک گئی۔ اپنے تاثرات سے اُس نے سب پر واضح کر دیا تھا کہ وہ ایسی لڑکی نہیں جو اُڑ کر صحن میں آنے والے کبوتر کو دیکھنے کیلئے اپنے قد سے جھک جاتی ہو۔ ایک ادا سے سر جھٹک کر سوچنے لگی۔

"میں نادان بھی ہوں۔ ایسی پرچی روانہ کرنے کا مقصد اپنی آمد کی اطلاع دینا ہوتا ہے۔ آنے والے کی ایسی اطلاع کو آڑے ہاتھوں نہیں، کھلے دل سے وصول کرنا پڑتا ہے۔ آج اُس نے سوال پوچھا ہے، کل سوال کے جواب میں دھڑکن کی تال پر جھومتے وجود کو سراہنے کیلئے آئے گا۔ برا کیا جو اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا۔"

کلاس سے جی اکتانے لگا تو بلا جواز اُٹھ کر باہر آ گئی۔ کاریڈور کے آخری سرے پر بنی ریلنگ کو تھام کر کھڑی ہو گئی۔ زمین پر چلتے اجلے اجلے لوگ فرسٹ فلور سے دیکھنے میں یوں لگ رہے تھے جیسے بونے قدم بوسی کیلئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہوں۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ رئیس اُس کے پیچھے چلتا ہوا ریلنگ کے پاس آ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ "معذرت چاہتا ہوں۔ کبھی کسی لڑکی سے دَب کر بات نہیں کی۔ ڈر کر پیار نہیں کیا۔ پہلی مرتبہ تمہارے سامنے اپنے بڑے قد کو چھوٹا پایا اور ایسی بچگانہ حرکت کر ڈالی۔"

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ لال ڈوروں والی آنکھوں میں ابھی تک خفگی لپٹیں لے رہی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بولی۔ "یہ کیسی ندامت ہے جس میں ہاتھ بھی جوڑے جاتے ہیں اور چہرے پر شرارت کے تاثرات بھی دکھائی دیتے ہیں؟"

وہ شرمسار ہو کر بولا۔ "میرے باپ نے مجھے کہا تھا کہ یونیورسٹی میں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ اپنے لئے دنیا جہان کے چہروں سے رنگ چرانا مگر ہمارے لئے صرف اور صرف اُس لڑکی کو پسند کر کے لانا جو ہمارے شایانِ شان خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ لڑکی تو بس لڑکی ہی ہوتی ہے۔ غریب ہو یا امیر۔ دونوں کے اجزائے ترکیبی ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ تم خوبصورت دکھائی دیتی تھیں مگر کلاس کی ہر لڑکی کی طرح۔ جب پتہ چلا کہ تم میرے ہم پلہ بھی ہو تو پھر عام دکھائی نہیں دیں۔ خاص

ہو کر دل کے خاص خانے میں براجمان ہو گئی ہو۔"

وہ مسکرائی۔ "تقریر کرنے کے دوران سانس لینا ضروری ہوتا ہے ورنہ علمیت دکھانے کے چکر میں آدمی تماشا بن جاتا ہے۔"

وہ شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تقریر نہیں کر رہا ہوں۔ اپنے حقیقی جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ کافی دنوں سے سوچ میں تھا کہ تم سے اظہار محبت کروں یا نہ کروں۔ آج اِس فیصلے پر پہنچا ہوں کہ سچ کو ایک بار چھپا لیا جائے تو عمر بھر جھوٹ کے پیچھے ننگے پیر بھاگنا پڑتا ہے اور سچ یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

وہ پہلی مرتبہ محبت کے اظہار کی وارفتہ لذت سے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ کئی مردوں نے اُس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی تھی۔ اِس کے باوجود سر سے پاؤں تک سرور میں ڈوب گئی۔ وہ اُس کی خاموشی کو اقرار جان کر گرم لوہے کو چوٹ لگانے لگا۔ "تم خفا ہو گئیں کہ میں نے چِٹ پر بے تکا سا سوال لکھ کر بھیجا اور کلاس میں تمہیں تماشا بنا دیا۔ تم سوال کو سمجھ ہی نہ پائیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ تمہارا ڈرائیور اور باڈی گارڈ کیا تمہارے راز کی حفاظت کرے گا یا وہ میری فلم بنا کر تمہارے باپ کے وی سی آر میں ڈال کر چلا دے گا۔ تم سمجھی نہیں یا تم نے سمجھنا چاہا ہی نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت......"

وہ ہاتھ اُٹھا اُس کی لمبی زبان کو لگام ڈالتے ہوئے بولی۔ "پلیز! کتنی لڑکیوں کو اِس تین دیواروں والے جنگلے میں پھنسانے کی کوشش کرو گے؟ مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش میں تمام عمر کا پچھتاوا لے کر کیمپس سے نکال دیے جاؤ گے۔"

محبوبہ محبت کی بجائے دھمکیوں کی زبان بولنے لگی تھی۔ وہ اُس سے کم تر نہیں تھا۔ سیر پر سوا سیر تھا مگر عشق کی بازی طاقت سے نہیں، ترکیب سے کھیلنا پڑتی ہے۔ مسکرانے لگا۔ پیٹھ موڑ کر بولا۔ "کیمپس سے تمہارا وجود چُرانے کے جرم میں نکال دیا گیا تو بھی غم نہیں ہوگا۔ جاتے جاتے تمہیں اپنی جیب میں ڈالتا جاؤں گا۔ مجھے دھمکیاں مت دو۔ میرے لئے تمہاری تازیانے کی طرح چلتی زبان ہی کافی ہے۔"

دل میں جوت جگا کر جانے لگا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا زینوں کی طرف جا رہا تھا۔ دل نے کچوکہ لگایا۔ 'نادان! تمہیں مجھ سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے۔ اُس نے پرچی میں دِل لپیٹ کر تمہارے ڈیسک پر رکھا تو تم سمجھ نہ پائیں۔ اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سچے جذبوں کا اظہار کیا تو دھمکیوں پر اُتر آئیں۔ کیوں؟ وہ بڑے ظرف کا مالک ہے۔ تم سے زیادہ رسوخ والے خاندان کا بیٹا ہونے کے باوجود دھمکیاں سن کر محبت کی زبان بولتا رہا۔ اُسے روک لو ورنہ کبھی پلٹ کر نہیں دیکھے گا۔'

اُس نے منہ کھولا۔ نام لے کر بلند آواز میں پکارنا چاہتی تھی مگر شرم آڑے آ گئی۔ دل کو کوسنے لگی۔ 'کیسے بدتمیز ہو تم۔ عورت کا گہنا اُس کی شرم ہوتی ہے۔ تم میری لاج پال چادر کو اُتار پھینک کر اپنی دنیا بسانا چاہتے ہو۔ وہ جاتا ہے تو جائے، مجھے کیا؟ پلٹنے والا ہوگا تو پلٹ آئے گا۔ نہ جھکنے والا ہوگا تو پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھے گا۔ ایسا خودسر مرد مجھے نہیں چاہیے۔ میں سردار فضل خان کی بیٹی شاہانہ ہوں۔ اپنے قدموں میں جھکے ہوئے مرد کے سر پر تاج کی طرح بیٹھوں گی۔'

وہ زینوں کے قریب پہنچ کر رُکا۔ چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ آہستگی سے پلٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا کہ ابھی پُرگداز سرخ سرخ ہونٹوں پر اُس کا نام پڑاؤ کی دعوت بن کر ابھرے گا اور وہ رُک جائے گا۔ اپنی اپنی مچانوں میں دُبکے ایک دوسرے کو نظریں جمائے دیکھتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پچھاڑنا چاہتے تھے۔ کوئی بھی سر جھکانے پر آمادہ نہ ہوا تو ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے۔ وہ ہونٹ بھینچ کر زینے اترنے لگا۔ پانچ زینے اتر کر ایک بار پھر ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑی شاہانہ کو دیکھنے لگا۔ ایسے میں اُس کی نظروں کی سیدھ میں شاہانہ کے پیر دکھائی دے رہے تھے۔ تب سمجھ میں آیا کہ نیچے اترنے سے مدمقابل کے پیروں کے برابر سَر آ جاتا ہے۔ ٹھٹک گیا۔ اَنا کو ٹھیس لگی۔ کچھ دیر کھڑا تلملاتا رہا پھر سر جھٹک کر تیز تیز قدموں سے نیچے اترتا گیا۔

کئی منٹوں تک ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑی کیمپس میں بنتے بچھڑتے جوڑوں کو دیکھتی رہی۔ اُس نے یہ بھی بڑی توجہ سے دیکھا کہ عنابی سوٹ میں ملبوس ایک تتلی چند لمحے ایک پھول پر بیٹھی رَس چوسنے کا لطف لیتی رہی، پھر اُڑ کر دوسرے پھول پر بیٹھ گئی۔ چمکتے بالوں والا لڑکا اُس کا ہاتھ تھامے گراسی پلاٹ میں ٹہل رہا تھا۔ دونوں کی آواز اُس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ ہلتے لبوں سے اندازہ لگانے لگی کہ دونوں محبت کا اظہار کرنے میں ایک دوسرے پر لفظوں کی برتری پانے کی جہت میں لگے ہوئے ہیں۔ سوچنے لگی کہ تتلی ایک پھول سے سیراب کیوں کر نہیں ہو پاتی؟ ایک کے بعد دوسرے پھول کے رنگ اُسے کیوں لبھانے

لگتے ہیں؟......صدیوں کی عورت کو اِس نکتے کی سمجھ نہیں آئی تھی، اُس پر آ گہی کا در کیوں کر کھل جاتا۔

پھر یہ حقیقی وڈیو کلپ بھی اُسے بور کرنے لگے۔ آہستہ روی سے چلتی ہوئی اپنی گاڑی تک آئی۔ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آدھا گھنٹہ سڑکوں پر گاڑی آہستہ رفتار سے چلاتے رہو۔ کوشش کرنا کہ کم بھیڑ والے راستوں سے گزرو۔''

ڈرائیور نے گاڑی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بی بی جی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ لیکچر نہیں ہوا۔ بیٹھ بیٹھ کر خاصی بور ہوگئی ہوں۔''

وہ پہلے بھی کبھی کبھار ایسا حکم جاری کر دیتی تھی۔ اُس نے گاڑی کو ایک سڑک پر ڈال دیا۔ اگلی سیٹ پر باڈی گارڈ اپنی گن تھامے چوکس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔ ''پاپا نے میری نگہداشت کیلئے باڈی گارڈ رکھ کر اطمینان حاصل کرلیا ہے۔ اتنی عمر گزار کر بھی اُسے پتہ نہیں چلتا کہ لڑکی کے بدن کی رکھوالی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ آنکھ کی شوخی سے پکڑی جاتی ہے اور دل کی دنیا سے اغوا ہوجاتی ہے۔ بدن تو مٹی کے ڈھیر کی صورت میں بے حرکت ایک جگہ پر پڑا رہتا ہے۔''

ایک گھنٹے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچ کر چینج کرنے لگی۔ رحمت بی نے حسبِ معمول اُس کے سر میں تیل ڈال کر مالش کی۔ اُسے سونے کا مشورہ دیتے ہوئے بیڈ پر چڑھا دیا۔

بولی۔ ''رحمت بی! ایک بات پوچھوں؟''

وہ مستفسر نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

وہ بولی۔ ''تم نے جوانی میں کسی سے محبت کی تھی؟''

رحمت بی چونک اُٹھی۔ دل میں بولی۔ ''یہ سوال کسی عورت سے کرنے کی ضرورت کیا ہے؟......کبھی کوئی دل محبت سے خالی بھی ہوا ہے جو مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ میں نے کبھی محبت کی ہے یا نہیں؟''

چند لمحے حیرت سے دیکھنے کے بعد بولی۔ ''شانی بی بی! یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''میں اِس لئے پوچھ رہی ہوں کہ جب آدمی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو اُس پر کیا گزرتی ہے؟ کس قسم کی بے چینی دماغ میں بھر جاتی ہے جسے محسوس کر کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندازہ لگایا جا سکے کہ محبت کی واردات ہوگئی ہے؟''

جہاندیدہ عورت تھی۔ چھوٹے گھر سے نکل کر بڑے گھر کے بھید کھلتے دیکھ رہی تھی۔ اُس پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے محبت کی ہے یا نہیں، تمہارا دماغ مجھے خراب ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔''

وہ ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے دوہری ہوگئی۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر بولی۔ ''واہ رحمت بی! کیا دل کی بوجھنے لگتی ہو۔ اَب یہ پوچھو کہ مجھے کس سے محبت ہوگئی ہے؟''

وہ اُٹھ کر دوپٹہ سنبھالتے ہوئے کمرے سے نکلنے لگی۔ دروازے پر رُک کر بولی۔ ''شانی بی بی! راز اپنی ذات تک محدود رہے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہتا ہے۔ زبان کی نوک پر آن بیٹھے تو ہر طرف سے آگ کی لپٹیں زمین سے اُٹھ کر آسمان کو چھونے لگتی ہیں۔ میں کم ذات ہوں۔ مجھے اپنے راز میں شریک مت کر۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر رحمت بی اُسے کوئی موقع دیے بغیر باہر نکل گئی۔ ڈر کر جاتے ہوئے سمجھا گئی۔ ''نادان لڑکی! محبت کی نہیں جاتی، ہوجاتی ہے۔ ہونی کو ہونے تک چھپائے رکھنا چاہیے ورنہ حالات خراب ہوجاتے ہیں۔''

❁❁❁

چاروں ملک فرید کے آراستہ مہمان خانے کے بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تواضع کے لوازمات ٹیبل پر ڈھیر ہوچکے تو ملک فرید نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ رحمت بن کر اُترے تو دل میں جگہ دی جاتی ہے، آنکھوں پر بیٹھایا جاتا ہے۔ میرے دل و نظر کے دروازے آپ کیلئے کھلے ہیں۔''

''ملک صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے۔'' سردار نے مصنوعی خوشی کو چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خوشی ہوئی کہ آپ میرے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہیں۔ بس سیاسی مصروفیات ہی مجھے آپ جیسے بڑے لوگوں سے دور رکھتی آئی ہیں وگرنہ کئی بار دل چاہا کہ آپ سے ملاقات کروں۔ آج خواہش پوری ہوگئی ہے۔''

ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد سردار فضل نے اپنے مقصد پر آتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ نور پور میں لوکل باڈیز کے انتخابات کیلئے ایسے بندے کو کھڑا کیا جائے جو عوام کی فلاح کا سچا جذبہ دل میں رکھتا ہو۔ اِس سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔''

"یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر میں یہ سمجھ نہیں پایا کہ اس سلسلے میں آپ کو میرے پاس آنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟" ملک فرید نے پُر اِستقلال لہجے میں کہا۔ "میں کوئی سیاسی آدمی تو ہوں نہیں اور نہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ پھر؟"

سردار نے کن انکھیوں سے عالمگیر کو دیکھا۔ گلا کھنکار کر بولا۔ "بات یہ ہے ملک صاحب! کہ آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ اپنے دل میں رکھے ہوئے غریب پروری کے سچے جذبے کو طاقت بناتے ہوئے مضبوط قدموں سے سیاست میں قدم رنجہ فرمائیں۔ سچی بات ہے کہ اگر آپ یہ الیکشن لڑیں تو نہ صرف بڑے مینڈیٹ سے جیتیں گے بلکہ یہاں کے لوگوں کو بھی بڑا آسرا مل جائے گا۔"

ملک فرید مسکرانے لگا۔ اُس کی مسکراہٹ سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لحاتی توقف کے بعد بولا۔ "یہ تو طے ہے کہ میں کبھی بھی سیاست میں نہیں آؤں گا۔ رہی بات عوامی فلاح کی...... تو اِس سلسلے میں گاؤں کے لوگوں نے ایک جسارت کی ہے جس پر میرا دِل خوش ہوا ہے۔ اپنا وہ چوہدری باسط ہے ناں! اُسے اور پٹھان برادری کے شکور خان کو لوگوں نے متفقہ طور پر الیکشن میں کھڑا کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دونوں بندے ہی کھانے والے نہیں ہیں۔"

سردار نے اپنی بساط بچھا دی۔ سر ہلا کر بولا۔ "بہت اچھا کیا نور پور کے لوگوں نے۔ اِس کے باوجود کہ چوہدری باسط سے میرے تعلقات اچھے نہیں ہیں، میں مانتا ہوں کہ وہ بہت اچھا عوامی نمائندہ ثابت ہوگا۔ ایک گزارش کرنا چاہوں گا کہ اُسے ہماری پارٹی کے پلیٹ فارم سے کھڑا کیجئے۔ تاکہ میں بھی کھلم کھلا اُس کی تائید اور مدد کرسکوں۔ دیکھیں ناں! سیاست کے بھی کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں جن پر مجبوراً ہمیں چلنا پڑتا ہے۔ اگر ہماری پارٹی کی قیادت اِس حلقے میں اپنا کوئی امیدوار کھڑا کرتی ہے تو مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی معاونت کرنا پڑے گی۔ اس سے ہم سب کا نقصان ہوگا اور تعلقات خراب ہوں گے۔"

سردار نے اپنی چال چل دی تھی۔ ایک پیادہ اگلی رو میں پہنچا دیا تھا۔ ملک نے دیکھا، غور کیا۔ اپنے پیادوں کا جائزہ لیا۔ پھر ہنکارا بھر کر بولا۔ "میں بات کی گہرائی میں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کو تعلقات قائم رکھنے کی خواہش ہے۔ اِس خواہش پر چل کر میرے غریب خانے پر آنے کو سراہتا ہوں مگر آپ کی پارٹی میں شمولیت کیلئے آپ کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑی سرکار کے قدموں میں سر رکھنا پڑے گا۔ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔"

اُسے شرمندگی کا احساس ہوا۔ بولا۔ "میں آپ کو پارٹی میں شمولیت کی دعوت نہیں دے رہا ہوں، میں تو چوہدری باسط اور پٹھان کو......"

ملک نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ایک ہی بات ہے سردار فضل خان! میں جانتا ہوں کہ عوام چاہے یا نہ چاہے، اُوپر والوں کے چاہنے پر بڑی سرکار نے ہی میدان مار لینا ہے۔ اُس سے ٹکر لے کر ہمارے جیتے ہوئے نمائندوں کو مساوی فنڈ نہیں ملے گا۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کی پارٹی میں شامل ہوکر دس کروڑ میں سے پچاس لاکھ تو مل ہی جائیں گے۔ اتنی تھوڑی رقم بھی ہمارے گاؤں کی ترقی کیلئے کافی ہے مگر یہاں کے عوام بڑی سرکار سے سخت نالاں ہیں۔ وہ اُس کے کھڑے کئے ہوئے بندے کو آگے نہیں لانا چاہتے۔"

سردار نے اپنے توپخانے کی پوزیشن بدلی۔ "آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ چوہدری باسط کو کسی بھی پارٹی کے شیڈ میں کھڑا نہیں کرتے۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں، آپ بھی کریں۔ جب وہ جیت جائے تو ہماری پارٹی میں شمولیت کا اعلان کردے۔ جیتنے کے بعد عوام کا کوئی اختیار نہیں رہے گا۔"

ملک فرید بڑے غور سے سردار کو دیکھنے لگا۔ بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔ سانپ نے کُنج اتار لی تھی۔ محتاط انداز میں بولا۔ "کیا یہ عوام کے ساتھ کھلا دھوکہ نہیں ہوگا؟"

سردار کہنا تو چاہتا تھا کہ "عوام کو کب کھلے دھوکے میں نہیں رکھا گیا؟ ہر کوئی سبز باغ دکھا کر اپنا اُلو سیدھا کرتا ہے اور پلٹ کر خبر نہیں لیتا۔ چوہدری باسط ایسا کرلے گا تو کیا جرم ہوگا؟" دل کی بات دل میں ہی رکھ کر بولا۔ "ہمیں اِس رخ سے نہیں سوچنا چاہیے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کس راستے پر چلنے سے ہمارے عوام کو مفاد حاصل ہوتا ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ اوپر والے کھاتے ہیں۔ نیچے والے بھی اپنا حصہ نکال لیتے ہیں۔ عوام کو کچھ نہیں ملتا۔ ہم عوام کو کچھ لے کر دینے کیلئے اگر اپنی خواہش اور مرضی کو دبا دیں تو بے ضمیری نہیں ہوگی۔ وہ جھوٹ ضرور بولنا چاہیے جس سے کسی غریب کا فائدہ ہوتا ہو۔"

ملک معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ جو کہنا نہیں چاہتا تھا، آنکھوں سے ہویدا ہونے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ مکڑا اپنا مطلب نکالنے کیلئے لہجے میں اتنی شیرینی گھول لیتا ہے کہ کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے دام میں آ جاتی ہے۔ پہلو بچا کر نکلتے ہوئے بولا۔ "میں آپ

کے خیالات کو تہہ دل سے سراہتا ہوں۔ مجھے اپنے دوستوں سے مشورہ کرنے کا وقت دیجئے۔ اللہ بھلی کرے گا۔"

"اوکے!" سردار نے کہا۔ "مجھے بھی کوئی جلدی نہیں۔ ہاں! ایک خوشخبری سنی ہے۔ پتہ چلا ہے کہ رفیع اللہ کا تبادلہ ہمارے تھانے میں ہو گیا ہے۔ یہاں کے لوفر سدھر جائیں گے۔"

ملک نے مصنوعی حیرانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا! مجھے پتہ نہیں چلا۔ سردار صاحب! ایک آدمی کی ایمانداری لاکھوں بے ایمانیوں کا راستہ نہیں روک سکتی۔ جب زنجیریں دروازوں پر لٹکانے والے شہنشاہ ہی ہاتھ کاٹنے پر لگے ہوئے ہوں تو وہ کیا کر سکے گا؟ پکڑ کر چالان کردے گا اور بس...... بااختیار مجرم قانونی پیچیدگیوں کا سہارا لے کر صاف نکل جائیں گے۔"

ادھر اُدھر کی کچھ رسمی باتوں کے بعد سردار نے پھر باتوں کے ریوڑ کو اپنے مفاد کی پگڈنڈی پر ہانک دیا۔ اُس کی ایک چال باقی تھی۔ وہ بھی چل دی۔ بولا۔ "ایک اور معاملہ بھی آپ سے ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔ وہ زمین جو آپ نے شوکت علی سے خریدی ہے، وہ اپنا جائز منافع رکھ کر مجھے دے دیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس میں سے چار کنال رقبہ میں گاؤں کی جنازہ گاہ کیلئے وقف کردوں۔ ایک زنانہ پرائمری سکول گاؤں کیلئے ناکافی ہے۔ ایک ایکڑ محکمہ تعلیم کو دے کر اُس پر سکول منظور کرانے کی کوشش کروں۔ کوئی علم نہیں کہ میری کون سی نیکی خدا کے ہاں منظور ہو جائے اور میں سرخرو ہو جاؤں۔"

چال بڑی جاندار تھی۔ ملک پہلو بدل کر رہ گیا۔

سردار نے مزید کہا۔ "اِسی ارادے سے میں نے شوکت علی سے بھی کہا تھا کہ وہ مارکیٹ ریٹ پر زمین مجھے بیچ دے۔ وہ نہیں مانا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ آپ جیسے ظرف والے آدمی کے ہاتھ رقبہ بیچ گیا۔ آپ میری بات کو سمجھ رہے ہیں ناں؟"

ملک نے دل ہی دل میں کہا۔ "دنیا کو احمق سمجھنے والے فرعون! سکول اور جنازہ گاہ بنانے کیلئے بندوق کے بل پر رقبہ نہیں خریدا جاتا۔ اگر ایسا کیا جائے تو خدا راضی ہونے کی بجائے ناراض ہوتا ہے۔"

جھوٹے کی بچھائی ہوئی بساط پر جھوٹے مہرے کو ہی بڑھانا پڑتا ہے۔ وہ دل پذیر لہجے میں بولا۔ "خوش کردیا سردار فضل خان! بہت اچھی سوچ رکھتے ہیں آپ۔ لیکن میری سمجھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں یہ نہیں آیا کہ اسی رقبے کے سامنے آپ کا سینکڑوں ایکڑ رقبہ پڑا ہے، آپ وہاں سکول اور جنازہ گاہ کیوں نہیں بنوا دیتے؟"

طمانچہ رخ موڑ کر اپنے منہ پر آن لگا۔ لاجواب ہو کر بولا۔

"اُس زمین کی لوکیشن ایسے کاموں کیلئے بہت آئیڈیل ہے۔ بہرحال! یہ الگ موضوع ہے۔ آپ اُس پیشکش پر توجہ دیجئے جو میں نے آپ کو دی ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ بڑی سرکار سے اپائنٹ منٹ ہے۔"

عالمگیر اور منیرا قصائی، سردار فضل خان کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کوٹھی سے باہر آ گئے۔ عالمگیر نے منیرے سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "کوشش کرنا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔ اِسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔"

منیرا سر ہلانے کے ساتھ ہاتھ بھی ہلانے لگا۔ "الوداع میرے ہمزاد! میرے دوست! الوداع!"

نور پور سے نکلتے ہوئے عالمگیر نے بشیر خان سے فون پر رابطہ کیا۔ دریافت کیا۔ "شبر اور خادم کو دریا پار بھیجا ہے یا نہیں؟"

دوسری طرف کی بات سن کر فون بند کرتے ہوئے سردار سے مخاطب ہوا۔ "سردار! بڑی سرکار کے حکم کے مطابق میں نے پار والے رسہ گیروں کو یہاں آنے کی دعوت شبر کے ہاتھ بھیج دی ہے۔ رفیع اللہ کو دریائی مگرمچھوں میں اتنا الجھا دوں گا کہ وہ ہم پر توجہ ہی نہ دے سکے۔"

سردار گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ "تم اپنے کام کے بارے میں بہتر جانتے ہو۔ میں ملک فرید کے بارے میں متفکر ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ میری بات مان لے گا۔"

عالمگیر نے کہا۔ "وہ مانے یا نہ مانے، چوہدری باسط کو میں اپنی راہ پر لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

سردار کا چہرہ پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ طویل اور پرخطر سیاسی سفر میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اُس کے چاروں طرف دشمنوں کی گھاتیں آباد ہو گئی ہوں۔ وہ ہار ماننے اور جھکنے والا بندہ نہیں تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو کر ایسی بساط بچھانا چاہتا تھا کہ اُس کے

تمام دشمن آپوں آپ پھنستے چلے جائیں۔ ایک ایک کر کے وہ سب کو نیچا دکھا سکتا تھا۔ مل کر آنے والوں کی مچانوں میں آگ لگانے کیلئے کوئی انوکھا لائحہ عمل تیار کرنا چاہتا تھا۔ نچلی سطح پر تھانے کی سیاست سے وہ دشمن کی جڑیں کھوکھلی کر دیا کرتا تھا۔ رفیع اللہ کے آنے سے یہ محاذ اُس کے ہاتھ سے نکلنے والا تھا۔ اپنے اوپر بیٹھے خدائی دعویداروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیک کر وہ اپنی سیاسی دکان پر سودا ختم نہیں ہونے دیتا تھا۔ سجدہ گاہ تک جانے کے راستے میں ملک فرید سینہ پھلا کر کھڑا ہونے والا تھا۔

فرعون کو بھی کبھی کبھی خدا کی یاد آ جایا کرتی تھی۔ اچھے پتوں کی خواہش میں وہ بھی خدا کے آگے جھک رہا تھا اور کیئے پر پشیمان ہوئے بغیر اپنا حق جتلا رہا تھا۔ ”اے پروردگار! تو جانتا ہے کہ یہ سب دشمن ایک ایک کر کے میرے سامنے آتے رہے ہیں اور منہ کی کھا کر پلٹتے رہے ہیں۔ اَب سارے مل کر شیر کو گرانا چاہتے ہیں۔“

دل میں خیال آیا کہ جہاں اختیارات نہیں چلتے، وہاں وہ رشوت کے ٹوکرے ہاتھوں میں سجائے پہنچ جاتا تھا اور کام نکلوانے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ اِس دربار میں اختیار نہیں چلتا، نہ ہی دھونس دھمکی کارگر ہوتی ہے۔ رشوت جھولی میں بھر کر گڑگڑانے لگا۔ ”سچے پروردگار! تم نے کبھی مجھے نیچا نہیں دکھلایا۔ اب کے بھی کامیابی کیلئے بھیک مانگنے تمہارے دَر پر آیا ہوں۔ مراد پانے پر حضرت بابا سائیں کے مزار پر دیگوں کی قطار سجا دوں گا۔ پورے علاقے میں تمہارے نام پر لنگر بانٹ دوں گا۔“

عالمگیر اُس کے بہکے ہوئے خیالات سے بے خبر آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سردار کی آواز پر چونکا۔ وہ ڈرائیور کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ ”عالمگیر کو کوٹھی پر چھوڑ کر مجھے بازار لے چلنا۔ بیٹی چھٹیاں گزار کر واپس جا رہی ہے۔ اُس کیلئے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔“

کچھ دیر بعد کار کوٹھی کے گیٹ پر رُک گئی۔ وہ اُترا اور سردار فضل خان کی بیٹی شاہانہ کے بارے میں سوچتا ہوا اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اُس نے دو تین مرتبہ شاہانہ کو اِس کوٹھی میں دیکھا تھا۔ ایک بار سردار اُسے اپنے زنان خانے میں بھی لے گیا تھا جہاں اُس کی شاہانہ سے رسمی سی ملاقات ہوئی تھی۔ غیر معمولی حسن کی مالکہ ہونے کے باوجود اُسے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ غرور اور بدتمیزی کے اعتبار سے وہ اپنے باپ سے بھی چند قدم آگے نکلتی دکھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دی تھی۔

اپنی ویران حویلی میں پہنچا تو پتہ چلا کہ دریا پار جانے والے ابھی تک نہیں پلٹے تھے۔ وہ کیکر کی مسواک کو دانتوں تلے چباتے ہوئے جنگل کی طرف نکل گیا۔ جنگلی گھاس کمر تک بلند تھی۔ کانٹوں سے بچتے بچاتے وہ دریا کے پتن پر پہنچ گیا۔ ذہنی طور پر کافی الجھا ہوا تھا۔ دریا کے خوبصورت منظر نے اُس کی توجہ بٹاتے ہوئے خطرات کی دنیا سے عارضی طور پر غافل کر دیا۔ وہ جوتے اتار کر پانی میں اتر گیا۔ ٹھنڈا اور شفاف پانی اُس کے اضطراب کو جذب کرنے لگا۔ پانی گھٹنوں تک پہنچا تو اُس نے پیش قدمی روکتے ہوئے منہ ہاتھ دھوئے۔ چلو میں پانی بھر کر سیر ہونے تک پیاس بجھائی۔ پھر پانی سے نکل کر کنارے پر آن بیٹھا۔ تاحد نگاہ کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہر طرف پانی...... دریائی مٹی کی بھینی بھینی مخصوص مہک...... درختوں کی سرگوشیاں...... مینڈکوں کی پانی میں چھلانگیں لگانے اور ٹرانے کی آوازیں اور...... کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہی دریا زندگی کو بچاتا ہے، جب اپنی بساط سے پاؤں پھیلاتا ہے تو موت اور تباہی بانٹنے لگتا ہے۔ انسان بھی دریا کی طرح تب تک پرسکون رہتا ہے جب تک اُس کے ظرف کے مطابق خدا اُسے دیتا رہتا ہے۔ جب متجاوز ہو جاتا ہے تو دوسروں کیلئے عذاب بن جاتا ہے۔ سردار بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔

اُس کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ دولت بے حد و حساب تھی۔ پچاس مربعوں کے قریب زرعی اراضی تھی جو اُس کی دولت میں ہر فصل پر بے تحاشا اضافہ کر دیتی تھی۔ انتخابی موسم پر لاکھوں روپے انویسٹ کر کے کروڑوں کی فصل آنے والے الیکشن تک کاٹتا رہتا تھا۔ ہر گاؤں میں اُس نے ایک ٹاؤٹ بنا رکھا تھا جو اُس کیلئے کماتا تھا۔ لومڑ کی طرح شیر کا جھوٹا کھا کر گریبان کھول کر گھوما کرتا تھا۔ اوپر سے نیچے تک ہتھیلی کیئے حرام کی بھیک مانگنے والے نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کس کیلئے یہ سب کچھ کر رہا تھا؟ ایک بیٹی کیلئے۔ حالانکہ وہ جتنا کچھ اکٹھا کر چکا تھا وہ دس بیٹوں کی دس نسلوں کیلئے کافی تھا۔ ہوس ختم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔

اُسے اپنی ماں یاد آ گئی۔ آدھا دِن گارمنٹ فیکٹری میں ملازمت کرتی۔ باقی دِن سلائی کڑھائی کر کے چند ٹکے جوڑتی۔ کچھ سے پیٹ بھر لیتی، کچھ سے تن ڈھانپ لیتی۔ کہیں سے بیٹے کیلئے یونیفارم مانگ لاتی تو کہیں سے اُس کے سکول کی فیس۔ کسی گھر سے سیکنڈ ہینڈ

کتابیں اٹھالاتی اور بیٹے کے سامنے رکھتے ہوئے کہتی۔ ''کتاب ایک دوبار پڑھ لی جائے تو اُس میں چھپے خزانے کم نہیں پڑتے۔ تم اِسے پورا سال خرچ کرنے کے بعد بھی اتنا لبریز ہی پاؤ گے۔''

ماں ٹھیک کہتی تھی۔ پورا سال پڑھنے کے بعد بھی اُس میں شامل لفظوں کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔

وہ سوچنے لگا۔ ''میری ماں اپنا اقتدار گنوا کر تمام عمر ایک بیٹے کو تعلیم دینے پر اکتفا کیے بیٹھی رہی۔ کرائے کے مکانوں میں رہتے ہوئے اُس کے دل میں کبھی بھی یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی کہ بھری دنیا میں اُس کا اپنا گھر بھی ہونا چاہیے۔ اُس نے علم کی سلطنت میں اپنے بیٹے کا گھر بنانے میں ہی عمر بِتا دی۔ اُس کے برعکس یہ کم بخت پوری دنیا کو اپنے قدموں میں جھکانے اور بیٹی کو پوری تحصیل کا مالک بنانے کیلئے ہر لمحہ جہنم کا ایندھن خریدنے میں برسرِ پیکار رہتا ہے۔ کیا کرے گا وہ اتنی دولت اپنی بیٹی کے قدموں میں ڈال کر؟''

اُس کا انہماک بڑھتا جا رہا تھا۔ کندھے پر ہاتھ کا بھاری لمس محسوس کر کے چونک پڑا۔ گردن موڑ کر دیکھا تو بشیر خان کو خود پر جھکے پایا۔ اُس کے بیٹھنے کیلئے پہلو میں جگہ بناتے ہوئے بولا۔ ''آؤ بشیر خان! لگتا ہے تم بھی میری طرح سکون کی تلاش میں اِدھر آ نکلے ہو۔''

وہ ہنسا۔ ''نہیں! میں تمہاری تلاش میں اِدھر آیا ہوں۔''

دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ظاہر ہے دونوں کی گفتگو کا موضوع رفیع اللہ، ملک فرید اور سردار فضل کی تکون ہی تھی۔

❀❀❀

اگلے دن اُس نے کلاس سے ناغہ کر لیا۔ دل لمبی تان کر سونے کو مچل رہا تھا۔ بغیر نیند کے لیٹے رہنے پر بدن نے اینٹھن پکڑ لی۔ لیٹنے کیلئے بدن کا تھکنا ضروری ہوتا ہے۔ کسلمندی کی حالت میں سی ڈی پلیئر میں فلم لگا کر بیٹھ گئی۔ ادھ دیکھی فلم جہاں سے چھوڑی تھی، وہیں سے چلا کر دیکھنے بیٹھ گئی۔ جذبات میں ہلچل مچانے والے مناظر آنکھوں کو خیرہ کرنے لگے۔ ہیرو میں رئیس کی شکل کی مشابہت تلاش کرنے لگی۔ ہیروئن کے لباس میں خود گھس بیٹھی۔ سوچنے لگی۔ ''فلم کو چلانے اور بند کرنے کا اختیار میری انگلیوں کو حاصل ہے۔ کاش کہ قسمت کا ریموٹ کنٹرول بھی میرے ہاتھ میں ہوتا۔ بٹن دبا کر رئیس کو اپنے پاس بلا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیتی۔ جی بھرتا تو واپس بھیج دیتی۔ ہمیشہ اپنے اختیار میں رکھتی۔''

ایسا سوچا جا سکتا ہے، کیا نہیں جا سکتا۔ سوچنے لگی۔ ''یہی فلم تھی جو پچھلی رات اُس کے تن بدن میں انگارے بھر رہی تھی۔ اَب ہیرو اور ہیروئن کی حرکتیں بہت گھٹیا لگ رہی ہیں۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ رات کے اندھیرے میں اور ہوتی ہوں، دن کے اجالے میں اور ہو جاتی ہوں۔''

دل کو لگنے والی بات ہے۔ جو کام رات کی تاریکی میں کیا جا سکتا ہے، وہ دن کے اجالے میں کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ وہ شرما رہی تھی اور خود کو ملامت کر رہی تھی کہ اُس نے یہ ڈسک کیوں چلائی۔ اُٹھی اور پلیئر بند کر دیا۔ ریموٹ سے کیبل کی نشریات چلاتے ہوئے چینل پر چینل بدلنے لگی۔ ذہن اضطراب پکڑ چکا تھا۔ کینو کے باغ میں سے کوئی کینو پسند نہیں آ رہا تھا۔ سپورٹس کے ایک چینل پر پیراکی کا میچ چل رہا تھا۔ مختلف رووٴں میں پیراک اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیلگوں پانی میں سرخ و سپید بدن بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ اُس نے ریموٹ کنٹرولر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر اچھال دیا اور پورے انہماک سے نیم برہنہ بدنوں کی کشمکش دیکھنے لگی۔ تب بات سمجھ میں آئی کہ عریانی سے نیم عریانی جذبات میں زیادہ ہلچل مچاتی ہے۔ جیتنے والا نیگرو تھا۔ تیسرے نمبر پر آنے والا انگریز تھا۔ چہرے کے خطوط میں مشرق کی آمیزش رکھتا تھا۔ پانی نچوڑتے ہوئے تالاب کی نگر پر کھڑا خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی اُسے دیکھ رہی تھی۔

اچانک اُس کی شکل بدلنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں اُسے یوں لگا جیسے ٹی وی کی سکرین میں سے رئیس جھانک کر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔ آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگی۔ جاگتی آنکھوں میں سپنا بھر گیا۔ بولی۔ ''عجیب چاہنے والے ہو، سامنے ہوتی ہوں تو پیٹھ موڑ کر چل دیتے ہو۔ دور ہوتی ہوں تو بہانے بہانے سے مجھے دیکھنے کیلئے پہنچ جاتے ہو۔ تمہیں دل تک لانے کیلئے پائنچہ پکڑاتی ہوں، تم پکڑ کر چھوڑ دیتے ہو۔ یہ نہیں جانتے ہو کہ عاشق گندم کے سوکھے خوشے کی طرح پائنچہ پکڑ کر دل تک پہنچ جاتے ہیں۔ تم انا پر میرے حسن کو قربان کر کے چل دیتے۔''

وہ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے ماضی کے طعنے دینے لگتی

ہو۔ اچانک سامنے آتا اور پارسائی کی قسمیں کھاتا تو تمہیں یقین آ جاتا کہ میں نے آج تک کسی عورت کو چھوا تک نہیں ہے۔ اب سال بھر تمہارے سامنے اپنے وجود کو ثابت کرتا رہا ہوں۔ تم مجھے فلرٹ کرنے والا سمجھتی ہو۔ کیا یہ نہیں جانتی ہو کہ کیمپس کی ہر لڑکی کے وجود میں میں تمہیں ہی تلاش کرتا رہا ہوں۔ میں بُرا ہوں تو تم بھی تو چھپ کر سامنے آتی ہو، سامنے آ کر چھپنے لگتی ہو۔"

وہ بے طرح شرمانے لگی۔ عورت کا حسن تعریف کی لو پر تپنے لگتا ہے۔ لو مسلسل چلنے لگے تو تپ کر آگ پکڑ لیتا ہے۔ آتشی عدسے سے گزرنے والی روشنی کو کورے کاغذ پر مرکوز کر دیا جائے تو ننھا سا شعلہ پیدا ہوتا ہے جو آن کی آن میں پورے کاغذ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ رئیس کی نگاہیں اُس پر مرکوز ہو چکی تھیں۔ وہ لوؤں تک تپ گئی۔ چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے لجا کر بولی۔ "ہائے اللہ! ایسے تو نہ دیکھو مجھے...... مجھے شرم آ رہی ہے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "دکھاؤ تو مجھے۔ کہاں شرم آ رہی ہے؟"

شرم پکڑانے والی شئے نہیں ہوتی، دکھانے والا رنگ ہوتا ہے۔ حسن فخر سے شرماتا ہے۔ چور ندامت سے شرماتا ہے۔ وہ عجیب چور تھا جو شرمانے کی بجائے پوری ڈھٹائی سے اُس کی شرم کے تمام تر رنگ چرانے آ گیا تھا۔ سرہانے کو بازوؤں میں بھینچ کر سینے سے لگانے لگی۔ یوں لگا جیسے تھکے ہوئے وجود کی ٹکور ہونے لگی ہو۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر چونک اُٹھی۔ رحمت بی ناشتے کی ٹرے لئے اندر داخل ہوئی۔ اُس پر نگاہ ڈال کر آہستگی سے بولی۔ "شانی بی بی! ناشتہ تیار ہے۔ اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔ تمہارے پاپا کا فون آیا تھا۔ میں نے بتایا کہ بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اِس لئے آج یونیورسٹی نہیں گئی۔ کہہ رہے تھے کہ جب جاگے تو فون پر میری بات کروا دینا۔ تم ناشتہ کر کے اُن سے بات کر لینا ورنہ پریشان رہیں گے۔"

وہ ہاتھ منہ دھوئے بغیر ناشتہ کرنے لگی۔ منہ چلانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چلانے لگی اور اپنے پاپا سے رابطہ کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ "آپ کیسے ہیں؟ ماما کیسی ہیں؟"

باپ کی پیار بھری آواز سنائی دی۔ "بیٹا! ہم دونوں کا ٹھیک ہونا تم پر منحصر ہوتا ہے۔ تم ٹھیک تو ہم بھی ٹھیک ورنہ بڑھاپا عود کر آتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "پاپا! مجھے بھی سیاسی بیانوں پر ٹرخانے لگے ہیں۔ میں جھوٹی خوشامد پر آپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو ووٹ نہیں دوں گی بلکہ ماما کے بیلٹ بکس سے جڑ کر کھڑی ہو جاؤں گی۔"

سردار فضل ہنسنے لگا۔ یقین ہو گیا کہ بیٹی بالکل ٹھیک ہے۔ بولا۔ "تمہارے اچھے مستقبل کیلئے دِل پر ہاتھ رکھ کر تمہیں لاہور بھیجا ہے۔ جب تک لاہور رہو گی دن گن گن کر وقت گزاروں گا۔ جب آ جاؤ گی تو تمہیں رخصت کرنے کیلئے دن گننے لگ جاؤں گا۔"

"ہائے پاپا! محبت بھی کرتے ہیں، بھگانے کے چکر میں بھی پڑ جاتے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ مجھے لاج آتی ہے۔" وہ اٹھلا کر بولی۔ "اگر میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں تو یہیں مر کھپ جاتی ہوں۔ گھر آ کر کیا کروں گی؟"

باپ کا دل آسودگی سے معمور ہو گیا۔ فون اپنی بیوی کو پکڑاتے ہوئے بولا۔ "لو بیٹا! اپنی ماں سے بھی بات کر لو۔ ہم باپ بیٹی کے بیچ میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔"

وہ بولی۔ "ماما! پاپا بھی تو ہم دونوں کے محبت بھرے کمرے میں بغیر دستک دیئے گھس آتے ہیں۔ اِن کی باتوں کا برا نہ منایا کریں۔"

ماں دعائیں دینے لگی۔ بولی۔ "تمہارے پاپا چلے گئے ہیں۔ بتلاؤ مجھے! کوئی ہم دونوں سے چُرا کر تمہیں دور لے جانے والا آیا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں آیا تو تمہیں میری بات ماننا پڑے گی۔ میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ تمہیں سردار اکرم خان کے بیٹے سرور خان کی انگوٹھی کا نگینہ بنا دوں گی۔ اگر تمہیں سرور خان پسند نہیں تو پھر تمہیں اپنے پاپا کی بات مجبوراً ماننا پڑے گی۔"

سردار اکرم خان اُس کی ماں کا بڑا بھائی تھا۔ علاقے کا معروف کاروباری شخص تھا۔ کاٹن جننگ کے کاروبار سے منسلک تھا۔ تین فیکٹریاں اور چند ایک کمپیوٹرائزڈ کانٹے اُس کے بیٹے سرور خان کی ملکیت تھے۔ اتنی مالیت کی جائیداد چھوٹے بیٹے کے نام بھی تھی۔ وہ بولی۔ "ماما! میں پھر کہتی ہوں کہ میں نہ تو آپ کی مرضی پر چلوں گی اور نہ ہی پاپا کی بات مانوں گی۔ اور ہاں! آپ کی اطلاع کیلئے عرض کرتی ہوں کہ میرا آئیڈیل مجھے دکھائی دینے لگا ہے۔ ابھی اُس کی شبیہہ دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہے۔ جب واضح ہو گی، آپ کو مطلع کر دوں گی۔ اور اب خدا حافظ!"

اُس نے ماما کا جواب سنے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ ابھی ہاتھ منہ تک نہیں پہنچا تھا کہ فون دھڑک اُٹھا۔ اُس نے سکرین پر آئے ہوئے نمبر کو دیکھا۔ مسکرانے لگی۔ ماما کال بیک

کررہی تھی۔ اُس نے گود میں پڑے ہوئے فون پر کال ریسیو کی اور لاؤڈر آن کر کے گود میں رکھ دیا۔ ماما کی آواز سنائی دی۔ ''بے وقوف لڑکی! اتنی اچھی خبر دینے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ جانتی ہو کہ جب تک مجھے تفصیل نہیں بتلاؤ گی، مجھے چین کی نیند نہیں آئے گی۔ شاباش! اب جلدی سے شروع ہو جاؤ۔''

اُس نے کن اکھیوں سے وارڈ روب میں ملبوسات کو ترتیب دینے میں مصروف رحمت بی کی طرف دیکھا۔ سر جھکا کر بولنے لگی۔ ''ماما! اُس کا نام رئیس ہے۔ میرے ڈیپارٹمنٹ میں پڑھتا ہے۔ امیر اور بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھ میں دلچسپی لیتا ہے۔ ابھی تک کھلا نہیں، کھلے گا تب آپ کو تفصیل سے بتلاؤں گی۔ آپ پاپا سے ابھی کوئی بات نہیں کریں گی۔''

ماما کچھ اور تفصیل چاہتی تھی۔ اُس کے پاس بتلانے کیلئے مزید کچھ نہیں تھا اِس لئے گفتگو میں تشنگی رہ گئی۔ فون بند کرتے ہوئے رحمت بی سے مخاطب ہوئی۔ ''تم میرے لئے چائے لے آؤ۔ ناشتے کو جی نہیں مان رہا۔''

رحمت بی چائے لانے کیلئے کچن میں چلی گئی۔ وہ اپنی ماما کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ شانی سے بہت پیار کرتی تھی۔ اکلوتی ہونے کے سبب وہ ماما اور پاپا کی آنکھوں کا تارا تھی۔ بیٹے کی خواہش میں اُس کے باپ نے تین شادیاں کی تھیں۔ دوسری بیوی بغیر کوئی بچہ جنے بیمار ہو کر مر گئی۔ تیسری چھ سات سال تک بانجھ رہی اور سردار کے طعنے جھیلتی رہی۔ ایک مرتبہ پھٹ پڑی اور کہنے لگی کہ دونوں ڈاکٹر کے پاس چل کر اپنا چیک اَپ کراتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بانجھ نہ ہو، سردار بانجھ پن کی حد تک کمزور ہو۔ سردار نے اُسے طلاق دے کر کوٹھی سے چلتا کر دیا۔ بیوی پاؤں سے جوتے کی مانند چپکی رہے تو اپنی اوقات میں رہتی ہے۔ تیسری بیوی پاؤں سے نکل کر سردار کے سر میں پڑنے لگی تو اُٹھا کر باہر پھینک دی گئی۔ تب سے دونوں میاں بیوی شاہانہ پر صبر کر کے بیٹھ گئے تھے۔

چائے پینے کے دوران اُس نے اپنی دوست سمیرا کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر پتہ چلا کہ وہ کیمپس میں موجود تھی۔ شانی کو چھیڑنے کیلئے بولی۔ ''تم آج کلاس میں نہیں آئی ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ کوئی عشق کی سچی کتاب پڑھانے کیلئے اپنے پیروں پر چل کر تمہارے پاس پہنچ گیا ہو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ہنسنے لگی۔ بولی۔ ''باتیں بناتی رہتی ہو۔ جانتی ہو کہ مجھے پڑھانے والا ابھی دنیا میں نہیں آیا۔ جب آئے گا تو سب سے پہلے تمہیں ہی بتلاؤں گی۔''

''جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے۔ عشق ہوتا ہے تو سب سے پہلے چھپنے اور چھپانے کا سبق ازبر کراتا ہے۔'' سمیرا نے کہا۔ ''کہو! کیسے فون کیا؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے فون رئیس کا نمبر لینے کیلئے کیا تھا۔ دل میں چھپا چور انگڑائی لے کر جاگ گیا۔ اُسے روکنے لگا کہ فون نمبر لینے سے سمیرا کھٹک جائے گی۔ تمہارے کلاس میں پہنچنے سے پہلے ہی وہ ہر ایک پر تمہاری کارگزاری کی رپورٹ کھول دے گی۔ الٹی سیدھی باتیں کرتی رہی، فون نمبر لینے کی ترکیب سوچتی رہی۔ سجھائی دیا تو بول پڑی۔ ''سمیرا! تمہارے پاس سر منیر واسطی صاحب کے نوٹس ہیں؟''

''تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟'' سمیرا دل کھول کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''جانتی تو ہو کہ میں اُن کا پیریڈ کیسے دل پر پتھر رکھ کر اٹینڈ کرتی ہوں۔ اُن کے نوٹس کیسے رکھوں گی؟''

وہ دل ہی دل میں خوش ہو کر بولی۔ ''مجھے ہر صورت میں وہ والے نوٹس آج ہی چاہئیں۔ کلاس میں کس کے پاس موجود ہوں گے؟''

سمیرا توقع کے مطابق بول پڑی۔ ''سر واسطی صاحب کے لاڈلے رئیس کے پاس ہی ہوں گے۔ کہو تو اُس سے دریافت کر دوں؟''

وہ بولی۔ ''اُسے تو منہ لگانا بھی بڑا دل گردے کا کام ہے۔ تم اِس طرح کرو کہ اُسے کہو کہ میرے فون پر رابطہ کرے۔ میں خود بات کرتی ہوں۔''

سمیرا نے حامی بھر لی۔ اُس کا کام ہو گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد ایک اجنبی نمبر سکرین پر جگمگانے لگا۔ دل رئیس کے نام پر دھڑک اُٹھا۔ جلدی سے فون آن کر کے بولی۔ ''جی کون؟''

''بہت غریب آدمی جو نام کا رئیس ہے۔'' رئیس کی شوخ آواز سنائی دی۔ ''سمیرا نے مجھے تمہارا نمبر دیتے ہوئے رابطہ کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ کہہ رہی تھی کہ تمہیں واسطی صاحب کے نوٹس درکار ہیں۔ میں تب ہی سمجھ گیا تھا کہ واسطی صاحب کو واسطہ بنایا جا رہا ہے۔''

وہ بولی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے واقعی اُن کے نوٹس کی ضرورت ہے۔''

وہ ہنسنے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی آواز سیدھی دل میں اترنے لگی۔ وہ بولی۔ ''اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

۔"اِس میں رونے کی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ ترکی بہ ترکی بولا۔ "تم شاید بھول گئی ہو کہ چند دن قبل تم نے سعدیہ سے نوٹس لے کر فوٹو اسٹیٹ کرائے تھے۔"

وہ کوئی بات بنانا چاہتی تھی مگر رئیس نے کوئی موقع نہ دیا۔ بولا۔ "پہلی مرتبہ مجھے واسطی صاحب پر پیار آ رہا ہے۔ بھلے جتنے بھی خشک ہیں، ایک بنجر زمین کو زرخیز بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اُن پر صدقے جاؤں، بیج ہاتھ میں لئے زرخیز دھرتی کی طرف بڑھنا چاہتا ہوں۔ کہو! کہاں آؤں؟ کہاں بیٹھ کر محبت کا بیج بوئیں؟"

وہ اُس کی زبان کو روکنا بھی چاہتی تھی، خوش بھی ہو رہی تھی۔ دل سے چاہتی تھی کہ وہ اِسی طرح بولتا رہے اور وہ سنتی رہے۔ ہنستے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ تم میرے اِس طرح رابطہ کرنے پر غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو۔ تکلیف دینے پر معذرت چاہتی ہوں۔ دوبارہ سعدیہ سے نوٹس لے لوں گی۔ تمہارا شکریہ!"

شانی نے بہ عجلت فون بند کر دیا۔ وہ ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ چند لمحے بعد دوبارہ کال آ گئی۔ اُس نے ریسیو کرنے کی بجائے کال منقطع کر دی۔ مسکراتے ہوئے اُس کا نمبر فون بک میں فیڈ کرنے لگی۔ فیڈنگ کے دوران بھی اُس کی کال آئی جسے اُس نے ریسیو نہیں کیا۔

فون ٹیبل پر رکھ کر انگڑائی لیتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تمکنت سے چلتی ہوئی قدِ آدم آئینے کے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ یوں لگا جیسے آئینے پر کوئی قیامت آ کر ٹھہر گئی ہو۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوجے میں پھنسا کر سر سے بلند کرتے ہوئے توت کی گیلی ٹہنی کی طرح لچک کھا گئی۔ ٹہنی سے جُڑی شاخیں لہرانے لگیں۔ انگلیوں کے جوڑوں سے کٹک کٹک کی ننھی ننھی آوازیں نکلیں۔ دل کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔

دل فگار انداز میں مسکرا کر پلٹی اور بیڈ پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ دونوں بانہیں پوری وسعت میں کھول کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ایسے وقت میں فون کی بیل بجنے لگی۔ وہ اُٹھنے کی بجائے کن اکھیوں سے دھڑکن کی تال پکڑنے والے ننھے سے جادوئی کبوتر کو دیکھنے لگی۔ کبوتر اُس کے چاہنے والے نے اپنی منڈیر سے اُڑا کر اُس کی دہلیز پر اُڑا بھیجا تھا۔ وہ بے تابی کو ہوا دیتے ہوئے سوچنے لگی۔ "میں نے نوٹس مانگے تھے، بار بار دستک دینے کی اجازت نہیں دی تھی۔"

اُس نے باتھ لیا۔ اپنی نوک پلک سنوارنے میں خاصا وقت صرف کیا۔ فون پر تھوڑے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھوڑے وقفے بعد دستک ہوتی رہی۔ دل کی تسلی کیلئے سکرین پر لکھے ہوئے نام کو پڑھ لیتی۔ رئیس کا نمبر فیڈ کرتے ہوئے اُس نے نمبر کو اپنے ہاتھوں سے۔ "رئیس" کا نام دیا تھا۔ اَب اپنے لکھے ہوئے حروف اُس کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے تھے۔

رحمت بی کو اُس نے بلا کر ڈرائیور اور باڈی گارڈ کو تیار کرنے کا حکم دیا۔ وہ شاپنگ کرنے کیلئے بازار جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بدن کو سلانے سے پہلے اچھی طرح تھکانا چاہتی تھی۔ تیار ہو کر پورچ میں آ گئی۔ ڈرائیور کو اچھی طرح سمجھا کر بیٹھ گئی۔ گاڑی مین گیٹ سے باہر نکلی تو وہ سرخ رنگ کی کار کو گیٹ کے قریب کھڑے دیکھ کر چونک پڑی۔ اِس کار کو ہر روز کیمپس میں دیکھا کرتی تھی۔ اُس کے قریب سے گزرنے پر اُس نے ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان رئیس کو دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ گھبرا کر ڈرائیور اور باڈی گارڈ کو دیکھنے لگی۔ شکر کیا کہ انہوں نے سرخ گاڑی پر توجہ نہ دی تھی۔ نظریں ملنے پر دل نشیں انداز میں مسکرانے لگا۔

وہ نظریں جھکا کر سوچنے لگی۔ دل میں فخر کی طمانیت پھیل گئی۔ چاہنے والا کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا تھا۔ دیوی کے درشن پانے کیلئے مندر کی سیڑھیوں پر براجمان ہو کر اپنی حیثیت اور خاندانی جاہ و حشمت کو مٹی میں رولتے ہوئے اچھا لگا تھا۔ جوانی خراج مانگتی ہے۔ حسن چاہے جانے کا اعتراف مانگتا ہے۔ چاہنے والے نے حسن کو خراج پیش کر کے جوانی کے منہ زور طوفان کو خوش آمدید کہہ دیا تھا۔

اُس نے غیر محسوس انداز میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اُسے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر نہال ہو گئی۔ کاریڈور میں پیچھے نہ مڑنے والا اُس کے قدموں پر قدم رکھ کر بے خود ہو کر چلا آ رہا تھا۔ آج پھر اُس کے دل نے چاہا تھا کہ بہتا دریا کبھی نہ رُکے، چلتا سفر یونہی چلتا رہے اور دھڑکن کی طرح محبوب اُس کی ذات سے چمٹا رہے۔ ہر سفر تمام ہو جاتا ہے۔ بازار آ گیا تھا۔ جگہ بنا کر گاڑی پارک کرتے ہوئے ڈرائیور نے گارڈ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا۔ شانی کے ساتھ گارڈ بھی اُتر آیا۔

وہ شاہانہ انداز میں چلتے ہوئے شاپنگ پلازے میں داخل ہو گئی۔ ایک قدم پیچھے رہ کر گارڈ اپنی گن سنبھالے چوکس انداز میں چلتا آ رہا تھا۔ پہلے سوچا کرتی تھی کہ گارڈ اور ڈرائیور کی موجودگی میں بندے کی شان بڑھتی ہے۔ لوگ شاہانہ تمکنت سے خائف ہو کر راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ چھچھورے منہ سے رال ٹپکاتے ہوئے بغلوں میں منہ چھپانے لگتے

تھے۔ آج یہ سب کچھ بُرا لگ رہا تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ گارڈ گاڑی میں بیٹھا رہے اور سرخ گاڑی والا اُس کے نقشِ پا پر چلتا ہوا اُس کے پہلو سے آن لگے۔ بس نہیں چلتا تھا۔ جانتی تھی کہ گارڈ اُس کی بات نہیں مانے گا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو رئیس کو آتے دیکھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر شاپنگ پلازہ میں داخل ہوگئی۔ آج حسبِ توقع خواتین کا رش حد سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ بہ مشکل راستہ بناتے ہوئے ایک دکان میں داخل ہوئی۔ گارڈ غیر محسوس انداز میں اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ کچھ چیزیں خرید کر گارڈ کو تھماتے ہوئے بولی۔ ''انہیں گاڑی میں رکھ آؤ۔ جلد واپس آ جانا، میں یہیں کھڑی ملوں گی۔''

گارڈ چند لمحے سوچتا رہا۔ ہاتھ بڑھا کر شاپنگ بیگ تھامتے ہوئے بولا۔ ''بی بی جی! آپ بے فکر ہو کر شاپنگ کریں۔ زیادہ وزن نہیں۔ میں اٹھا لیتا ہوں۔''

وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ ملبوسات سے اُس نے غیر ضروری طور پر چند سوٹ خریدے۔ پیک کرائے بغیر گارڈ کو تھما دیے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ سوٹ اٹھا کر چلتا ہوا تماشا بن گیا تھا۔ ایک دکان کے سامنے رُک کر بولا۔ ''آپ کاسمیٹکس خریدیں۔ میں سوٹ گاڑی میں رکھ کر آتا ہوں۔''

اُس نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔ وہ اوجھل ہوا تو رئیس لپک کر اُس کے قریب آ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ''پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ بڑے گھر کی لڑکی کا قرب پانے میں کتنی مشکل پیش آتی ہے۔ کہو! کیسی ہو؟''

وہ چند لمحے اُسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ جو کہنا چاہتی تھی وہ نامناسب لگتا تھا، جو نہیں کہنا چاہتی تھی وہ لبوں پر آ گیا۔ نظریں جھکا کر بولی۔ ''تم کیسے ہو؟''

وہ بولا۔ ''جلدی جلدی کہے دیتا ہوں۔ تمہارے بغیر ہر پل گراں گزرتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اگر مجھے محبت ہوگئی ہے تو اُس کا انجام کیا ہوگا؟ اگر محبت نہیں ہوئی تو دل میں اتنی بے چینی کیوں بھر گئی ہے کہ برسوں سے دیکھی بھالی چیزیں بھی اجنبی اور بے معانی دکھائی دینے لگی ہیں۔ اگر تم یہ سوچتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ فلرٹ کر رہا ہوں تو یقین دلانے کیلئے یہ پیشکش کرتا ہوں کہ چند دن میرے ساتھ چلو۔ مجھے پرکھو۔ تمہیں نہ تو چھوؤں گا، نہ اظہارِ محبت طلب کروں گا۔ دو اچھے دوستوں کی طرح ہم تب تک ملتے رہیں گے جب تک تم چاہو گی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ مسکرانے لگی۔ اُس نے بہت اچھی آفر کی تھی۔ دل سے صدا اُبھری۔ ''کیا سوچنے لگ گئی ہو؟ جس کے دِل میں میل اور کھوٹ ہوتا ہے، وہ ایسی باتیں نہیں کرتا اور نہ ہی خود پر پابندیاں عائد کرتا ہے۔ وہ تمہیں سچے دل سے چاہتا ہے۔ چاہت میں بندہ اپنے ہاتھ پیر باندھ سکتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''میں لاہور میں پڑھنے کیلئے آئی ہوں حالانکہ مجھے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے باپ نے میرے لئے اتنی دولت کما رکھی ہے کہ میری سات پشتوں کی فضول خرچیوں کا بہ آسانی بوجھ اٹھا سکتی ہے۔ تم پہلے اچھے نہیں لگتے تھے۔ سچ کہتی ہوں۔ دوستی میں جھوٹ سجتا نہیں۔ قریب آئے ہو تو دل تمہاری طرف کھنچنے لگا ہے۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تم چاہتے ہو مگر چاہنے والے نہیں ہو۔ چند دن بعد بھونرے کی طرح پھول بدلنے کے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ اِس کے باوجود تمہاری دوستی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو دھتکاروں گی نہیں۔ لاؤ ہاتھ بڑھاؤ۔ وعدہ کرو کہ میری مرضی کے بغیر مجھے ہاتھ تک نہ لگاؤ گے۔''

اُس نے جھٹ سے اپنا ہاتھ پیش کر دیا۔ دل میں بولا۔ ''اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر تم نے محبت کی پہلی بخشش عطاء کر دی ہے۔ ہاتھ پکڑ کر دل تک پہنچنا میرا کام ہے اور مجھے اپنا کام کرنا آتا ہے۔''

رئیس کے ہاتھ میں اُس کا نرم، ننھا اور پُرگداز ہاتھ ہفت اقلیم کی طرح آیا تھا جو لمبے لمبے ڈگ بھر کر آتے ہوئے گارڈ کی نظروں میں بھی آ گیا۔ گارڈ نے قریب پہنچ کر گھورتی نگاہیں اُس پر مرکوز کرتے ہوئے خاموش زبان میں سمجھایا۔ ''آج ہاتھ لگایا ہے، آئندہ ہاتھ لگاؤ گے تو پھر تمام عمر ہاتھ ملتے رہو گے۔''

شانی نے جلدی سے اُسے مخاطب کر کے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ ''یہ میرا کلاس فیلو ہے۔'' پھر رئیس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''گڈ بائی مسٹر رئیس! کلاس میں ملاقات ہوگی۔ شاپنگ میں میری مدد کی تو کوئی ضرورت نہیں ناں!''

وہ ہاتھ لہرا کر بائے کہتا ہوا ایک دکان میں گھس گیا۔ شانی گارڈ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ دل میں تھوڑی سی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ گارڈ نے اُسے رئیس کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ گھر جاتے ہی وہ پہلا کام یہی کرے گا کہ اُس کے باپ کو آگاہ کرے گا کہ ایک لڑکے نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کے فرض کو بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے۔

جوتے چیک کرتے ہوئے اُس کی توجہ رئیس پر مرکوز رہی۔ سیلز مین جس جوتے کی تعریف کرتا، وہ اُسے پیک کرنے کا آرڈر دے دیتی۔

پانچ چھ جوڑے خریدنے کے بعد وہ شوز سٹور سے باہر نکل آئی۔ اُس کی شاپنگ مکمل ہوچکی تھی۔ ایک دو دکانوں پر بلاضرورت ٹھہر کر اشیاء چیک کرتی رہی۔ پھر اِس کام میں بھی بوریت ہونے لگی تو اُس نے گارڈ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ پلازے سے باہر نکلی تو خود کو بے پناہ بھیڑ میں پاکر جھنجلا گئی۔ لوگ چلتے ہوئے دوسروں پر دھیان دینے کے عادی نہیں تھے۔

اچانک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا۔ یوں لگا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ اُس نے کانوں پر سختی سے اپنے ہاتھ رکھے۔ چند قدموں کے فاصلے پر پلازے کی بالائی منزل کی بیرونی دیوار گری تھی جس کے نیچے کئی آدمی آ گئے تھے۔ دھکم پیل اور شوروغوغا نے قیامت کا منظر بنا دیا۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ دھماکہ کہاں ہوا ہے اور کس سمت میں جانا ہے۔ وہ ایک طرف کو بھاگ کھڑی ہوئی۔ ٹھوکر لگی تو منہ کے بل جا گری۔ جلدی سے اُٹھ کر بھاگنے لگی۔ شور میں ایک ہی بات سنائی دے رہی تھی کہ کہیں بم پھٹا تھا اور بیسیوں بندے گرگئے تھے۔ گرنے والوں میں کتنے مرے تھے، کتنے بچے تھے، یہ پتہ نہیں چلتا تھا۔ دل کو ذرا تیز دھڑکا رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا بم بھی پھٹ سکتا تھا۔

کسی کے مرنے سے گورکن سمیت کئی بندوں کی روزی بن آتی ہے۔ بم پھٹنے سے پھیلی بھگدڑ سے مفاد کشید کرنے والوں کی چاندی ہوگئی۔ کوئی دکانداروں کے گلوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا تو کسی کے ہاتھ میں گرنے پڑنے والوں کے موبائل دَبے ہوئے تھے۔

چند ہی لمحوں میں وہ پلازے سے کافی دور نکل آئی۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ خوف، درد اور تھکن سے بے حال ہو کر رُک گئی۔ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ ایسے میں اُس کے پہلو میں کوئی نوکدار چیز چبھ گئی۔ اُس نے گھبرا کر پہلو میں دیکھا۔ گرم اونی چادر میں ملبوس ایک خوفناک شکل والا آدمی اُس سے لگ کر کھڑا تھا۔ اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ سراسیمہ نگاہوں سے بائیں طرف دیکھا۔ رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ ویسا ہی ایک اور شخص راستہ روک کر کھڑا تھا۔ سہمی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ پہلو میں ریوالور کی نوک چبھونے والے چادر پوش نے سرگوشی کے سے انداز میں نہایت سفاک لہجے میں کہا۔ ’’اُس گاڑی کی طرف چلو ورنہ کلیجے میں گولی اتار دوں گا۔‘‘

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یوں لگا جیسے اُس کے قدموں نے اُس کا وزن اٹھانے سے انکار کردیا ہو۔ خوفزدہ نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ باڈی گارڈ اور ڈرائیور کہیں دکھائی نہیں دیے۔ بم پھٹنے سے پھیلنے والی بھگدڑ میں اوجھل ہوگئے تھے۔

وہ لہرا کر گرنے لگی تو چادر پوش نے کمر میں بازو حمائل کر کے سنبھال لیا۔ چند لمحوں بعد وہ گاڑی کی سیٹوں کے درمیان فرش میں بے ہوش پڑی ان دیکھی منزل کی طرف جارہی تھی۔ ہوش میں رہتے ہوئے گرد کو لباس پر لگنے نہیں دیتی تھی۔ بے ہوش ہو کر اغوا کرنے والوں کے جوتوں تلے دَبی ہوئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عالمگیر عالم کو خبر ملی تھی کہ رفیع اللہ پندرہ دن بعد یہاں پہنچنے والا ہے۔ انتخابات میں ابھی ایک ماہ پڑا تھا۔ وہ مضطرب ہو گیا۔ بشیر خان سے سر جوڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کے آنے سے پہلے پہلے ہی اپنے کام کے مشکل مراحل طے کر لے۔ یہ تعین نہ ہو پایا کہ وہ کام کا آغاز کہاں سے کریں۔ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ سردار فضل کا فون آ گیا۔ اُس نے فون اٹینڈ کیا۔ سردار نے فوری طور پر اُسے اپنی کوٹھی میں طلب کیا تھا۔

آدھے گھنٹے میں وہ گاڑی دوڑاتا ہوا سردار کے پاس پہنچ گیا۔ سردار کو غصے کی حالت میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ پوچھا۔ ''سردار! خیر تو ہے؟''

سردار نے اُسے بڑے سفاک لہجے میں کہا۔ ''ہمارے پاس وقت کم ہے۔ بڑی سرکار کا حکم ہے کہ فوری طور پر چوہدری باسط کو اپنی پارٹی میں شامل کیا جائے۔ میں اور بڑی سرکار دونوں ملک فرید کے پاس گئے تھے۔ اُسے لے کر چوہدری باسط کے ڈیرے پر بھی گئے جہاں بیٹھ کر ڈیڑھ گھنٹے تک مذاکرات ہوئے۔ ان دونوں نے ہماری تمام آفرز کو ٹھکرا کر نہائت سخت رویہ اپنایا۔ بڑی سرکار کا حکم ہے فوری طور پر ایکشن لیا جائے اور چوہدری باسط کو رام کیا جائے۔''

وہ بولا۔ ''میں اور بشیر خان بھی اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رفیع اللہ کی آمد سے پہلے ہمیں اپنا کام نبٹا لینا چاہیے۔ اُس نے چارج لے لیا تو پھر ہمارے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔''

سردار فضل اُس کے قریب صوفے میں بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں کروٹیں بدلتی ہوئے بے چینی دیکھ کر عالمگیر نے پوچھا۔ ''بڑی سرکار نے ایکشن کیلئے کوئی لائحہ عمل بھی دیا

ہوگا۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھے کوئی راہ سجھا دو۔ پتہ نہیں کیا ہوا ہے میرے ذہن کو کہ صحیح طریقے سے کام ہی نہیں کر رہا۔''

سردار چند لمحے اُسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ کسی فیصلے پر پہنچ کر بولا۔ ''ہم دونوں نے ایک پروگرام ترتیب دیا ہے۔ اُسے پایہ تکمیل تک تم لوگوں نے پہنچانا ہے۔ کامیابی کی صورت میں بڑی سرکار کے خصوصی انعام کے مستحق ہو جاؤ گے۔''

وہ بیزاری سے بولا۔ ''سردار! مجھے انعام کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ میں اپنے کام کو سرانجام دیتے ہوئے تمہارے سوا کسی کی ہمدردی یا انعام کا لالچ دل میں نہیں رکھتا۔ تم کام بتاؤ۔''

''چوہدری باسط کی دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹا کوئی نہیں۔'' سردار صوفے میں کھسک کر اُس کے قریب آ گیا۔ دیواروں کے کانوں سے بھی اپنی آواز کو چھپانا چاہتا تھا۔ بولا۔ ''دونوں بڑی سرکار کے شہر کے گرلز کالج میں جاتی ہیں۔ ایک پڑھتی ہے، دوسری پڑھاتی ہے۔ اُن میں سے ایک کو اٹھا کر بڑی سرکار کے خفیہ اڈے پر لے جانا ہوگا جہاں اُس کو پانچ چھ گھنٹے رکھنا ہوگا۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟''

وہ سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھا تو دریافت کرنے لگا۔ ''اِس سے ہمیں کیا فائدہ ملے گا؟''

سردار نے ایک آنکھ میچ کر معنی خیز انداز میں کہا۔ ''موج میلہ کرنا۔ جوانی کے بھوکے گھوڑے کو چارہ ڈالنا۔ جو جی میں آئے کرنا مگر یہ دھیان رکھنا کہ جو بھی کرنا، اُسے وڈیو کیمرے کی آنکھ میں اِس طرح محفوظ کر لینا کہ چوہدری باسط کی دُم پر ہمارا پاؤں پکا پکا ٹھہر جائے۔ ملک فرید کی جھولی سے نکال کر چوہدری باسط کو اپنے قدموں میں بیٹھانے کیلئے وڈیو کیسٹ کا ایک منظر ہی کافی ثابت ہونا چاہیے۔ اغوا کا پتہ چلنے سے قبل اُسے آزاد کر دو گے۔''

اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں سردار فضل کو دیکھنے لگا۔ بڑھاپے نے سر منہ سفید کر دیا تھا مگر من کے اندر چھپی ہوئی خباثت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ بیٹھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سردار! یہ فیئر نہیں ہوگا۔ چوہدری باسط کی بیٹی کا ہماری سیاست سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ کوئی اور طریقہ سوچو۔''

سردار ہتھے سے اکھڑ گیا۔ زہر خند لہجے میں بولا۔ ''سیاست میں ضمیر اور غیرت نام کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ ہم کسی کو پکڑواتے ہیں پھر اُسے چھڑوانے کے پیسے بٹورتے ہیں۔ غریبوں

کی غربت کو اُن کے منہ پر مار کر اُن کے منہ سے نوالہ چھین لیتے ہیں، زکوٰۃ کی رقم کے پہلے حقدار ہم ہوتے ہیں، تم جو کچھ کرتے پھر رہے ہو، کیا یہ جائز ہے؟ کیا ضمیر اِن کاموں کی اجازت دیتا ہے؟ ...... ہرگز نہیں۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ چوہدری باسط کی کوئی کمزوری ہاتھ لگنے والی نہیں ہے۔ دیو کی جان جس مینا میں اَٹکی ہوئی ہے، اُسی کو گردن سے دبوچ کر دیو کو قدموں میں سرنگوں کرنا پڑے گا۔ عزت ہاتھ میں آنے پر وہ کوئی قانونی چارہ جوئی کرنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔''

وہ چند منٹ تک مزاحمت کرتے ہوئے اُسے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ نہیں مانا تو عالمگیر کو ہی ماننا پڑا۔ طوعاً و کرہاً حامی بھر کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ بشیر خان کو سردار کا حکم سنایا۔ کچھ دیر کے بعد پانچوں سر جوڑ کر بیٹھے صلاح و مشورہ کر رہے تھے۔ بشیر خان سمیت بھی چوہدری باسط کی شہ رگ پر پوری قوت سے پنجہ جمانے کے حق میں تھے۔ عالمگیر اُن کے جذبات سمجھتا تھا۔ گنگا اشنان کرتے ہوئے دیوی کے درشن ملتے دکھائی دیتے تھے اس لئے سبھی پرجوش تھے۔

کچھ ہی دیر میں سردار کا حکم ماننے کا فیصلہ ہوگیا۔ بشیر خان نے کہا۔ ''اِس مرتبہ پہلے کی طرح نہیں ہوگا کہ تم شکار کو بھگا کر فائرنگ کرنے لگو اور سردار کی آنکھوں میں دھول جھونک دو۔ یہ یاد رکھنا کہ اِس مرتبہ شکار کی ہمیں بھی ضرورت ہے۔''

اُسے دِلی طور پر چوہدری باسط کی بیٹی سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اُس کی زندگی میں ایسے کئی واقعات رونما ہو چکے تھے۔ وہ صرف رفیع اللہ سے ڈر رہا تھا۔ مبادا کہ ملک فرید اِس معاملے میں کود کر رفیع اللہ کو چارج لینے سے پہلے گھسیٹ لے۔ اُسے بڑی سرکار کے اثر و رسوخ کا بھی بخوبی علم تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اِس ضلع میں کوئی مائی کا لال ایسا نہیں جو بڑی سرکار کو پھلانگ کر اُسے گرفت میں لے سکتا ہو مگر ایماندار آفیسر کا شکنجہ بہت مضبوط ہوتا ہے۔

سردار نے اُسے بڑی سرکار سے رابطہ کرنے اور ڈکٹیشن لینے کی ہدایت بھی کی تھی۔ اُس نے نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر مؤدب لہجے میں بولا۔ ''سردار فضل خان نے آپ سے رابطہ کرنے کا حکم دیا تھا۔''

سردار مظفر علی خان کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تم کل کسی وقت میری کوٹھی پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آجاؤ۔ میں شیرو کو پابند کر دوں گا۔ وہ بھی یہیں ملے گا۔ تم دونوں بیٹھ کر پروگرام ترتیب دے لینا۔ یہ خیال رکھنا کہ کل رات تک یا پرسوں تک یہ کام مکمل ہو جانا چاہیے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

اُس نے اوکے کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ زیرِ لب بڑی سرکار کو گالیاں دیتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ ''تمہارے باپ کے پاس بھی زیادہ وقت نہیں تھا کمینے آدمی! ہمت کرو اور مردوں کی طرح آگے بڑھ کر چوہدری باسط اور ملک فرید پر ہاتھ ڈالو تو جانوں۔ سازشیوں کی طرح ایک غیر متعلق اور معصوم لڑکی پر بھوکے بھیڑیے چھوڑ کر تماشہ دیکھنا چاہتے ہو۔ تف ہے تمہاری مردانگی پر!''

بشیر خان مسکرانے لگا۔ پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے بولا۔ ''کبھی کبھی شیر کو ذائقہ بدلنے کیلئے نرم نرم گھاس پر منہ بھی مار لینا چاہیے۔ اکثر شکاری جانور ہاضمہ درست رکھنے کیلئے چارہ کھاتے رہتے ہیں۔''

وہ بیزاری سے بولا۔ ''تمہاری ضد پر ہتھیار ڈال کر میں یہ گندا کام کرنے چلا ہوں ورنہ اُن کی خاطر یہ ظلم کبھی نہ کرتا۔''

بشیر خان دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ اُس نے خاموشی کی زبان میں اُسے طعنہ دیا تھا۔ ''ابے او عالمگیر! میرے نام پر ظلم کرو یا سردار کے حکم پر۔ جرم کی تعزیر ایک سی ہے۔ چوری لکھ کی ہو یا ککھ کی...... دفعہ ایک ہی لگتی ہے۔''

رات سنسان حویلی میں اُتر آئی۔ آج اُس کا دل بجھا بجھا سا تھا۔ کسی گہری سوچ میں غرق چارپائی پر لالٹین کی لرزتی لو پر نگاہیں جمائے لیٹا تھا۔ کافی دیر گزر گئی، آنے والی نہیں آئی تو اُس کی کمی محسوس کرنے لگا۔ وہ آتی تھی تو دل کو گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ آج نہ آنے پر دل ہول کھائے جا رہا تھا۔ وہ بند ہونٹوں کے عقب میں چلا اُٹھا۔ ''آج میرا مغز چاٹنے کیلئے تمہارے پاس وقت نہیں ہے؟''

اچانک وہ سفید عکس لہرا گیا۔ اُس نے سنا کہ ماں غمزدہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''علم دین سے عالمگیر بننے والے! اگر تم نے پڑھا ہوتا تو کبھی بھی کسی عورت پر ہاتھ اُٹھانے کی ہمت نہ کرتے۔ روز کہتے ہو کہ فرعون کیلئے موسیٰ بن کر اِس راہ پر چل نکلے ہو۔ بتلاؤ! کیا تم ایک بُرے انسان کو فرعون نہیں بنا رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''اماں! تم فکر نہ کرو۔ میں ایک طرف جرم کرتا ہوں، دوسری طرف نیکی بھی کرتا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں کہ تم کس نیکی کی طرف اشارہ کر رہے ہو۔'' ماں کا دکھ میں بجھا ہوا لہجہ بھیگنے لگا تھا۔ ''وہ بھی عورت ہے۔ تم ایک طرف نہیں، دونوں طرف ظلم کرنے چلے ہو۔ میں کہتی ہوں کہ لوٹ آؤ۔ خود کو قانون کے حوالے کر کے خدا سے معافی مانگو۔ ہوسکتا ہے تمہارے آنسو اُس ذاتِ بابرکت کو پسند آ جائیں اور وہ تمہیں تمہارے گناہوں سمیت بخش دے۔''

وہ ہنسنے لگا۔ وہ بولی۔ ''غور کر علم دین! تمہاری ہنسی میں بھی فرعونیت عود کر آئی ہے۔''

وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ اُس کے ساتھی جاگ گئے۔ اُسے یوں ہذیانی انداز میں ہنستے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ اُس کی چارپائی پر بیٹھ کر اُسے جھنجوڑنے لگے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ دماغ نے گرمی پکڑ لی ہے۔ کوئی سرسام بتلا رہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے پورے حواس میں تھا۔ بیٹے کی توجہ بٹتے دیکھ کر ماں اوجھل ہو گئی۔ سمجھانے والی بات سمجھا گئی تھی۔ جسے اپنے پیچھے لگانا چاہتی تھی، وہ غچہ دے کر نکل گیا تھا۔

پانی پیا، بشیر خان نے دودھ گرم کر کے پلایا۔ کچھ دیر تک سر درد کا بہانہ کرتا رہا پھر لحاف میں دبک کر سو گیا۔ ابھی اُسے اگلے دن کیلئے پلاننگ کرنا تھی۔ سردار فضل اور سردار مظفر کیلئے چوہدری باسط کی عزت کے آسمان کا تارا توڑ کر لانا تھا۔ اُس کے نزدیک یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اپنی ماں کو چپ کرانا مشکل دکھائی دیتا تھا۔

صبح اُس نے شبر علی کو اپنے ساتھ چلنے پر تیار کیا۔ نکلنا ہی چاہتا تھا کہ سردار کا فون آ گیا۔ اُس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے سردار؟ اتنی تڑکے فون کر رہے ہو لگتا ہے آنکھ کھلتے ہی میں یاد آ گیا ہوں۔''

سردار قہقہہ لگا کر بولا۔ ''ابھی بڑی سرکار کا فون آیا تھا۔ اُس نے تمہیں یاد کیا ہے۔ میں نے تمہیں یاددہانی کرانے کیلئے رابطہ کیا ہے۔''

وہ کال منقطع کرنے والے بٹن پر انگلی رکھ کر بولا۔ ''میں اور شبر نکل ہی رہے ہیں۔''

شہر میں پہنچے۔ ہر طرف ریل پیل دیکھ کر عالمگیر سوچ میں پڑ گیا۔ لوگ چلتے ہوئے تھکتے نہیں تھے۔ صبح چلتے تھے، شام چلتے تھے۔ نہ جانے ان کا انجام کیا تھا۔ یہ ضلعی ہیڈکوارٹر تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سردار فضل کے شہر سے کافی بڑا تھا۔ رواں دواں ٹریفک کے بیچ میں رستہ بناتے ہوئے وہ سردار مظفر کی محل نما کوٹھی پر پہنچے۔ کوٹھی کو دیکھ کر مغل شہنشاہوں کی یاد تازہ ہونے لگتی تھی۔ کوٹھی کے عین سامنے لڑکوں کا کالج واقع تھا جہاں اَن گنت نوجوان بیروزگاری کا عذاب جھیلنے کیلئے تربیت حاصل کرتے تھے۔

خاص کمرے میں بڑی سرکار اور شیرو اُن کے منتظر تھے۔ تواضع کے بعد بڑی سرکار نے کسی کو بالخصوص مخاطب کئے بغیر کہا۔ ''آج تم لوگ تمام انتظامات مکمل کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم صبح اپنا کام کر دکھاؤ۔''

عالمگیر نے کہا۔ ''اِس کام میں اتنی عجلت کیوں برتی جا رہی ہے؟ ابھی انتخابات میں پورا مہینہ باقی ہے۔ عجلت ہمارے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔''

شیرو نے کہا۔ ''تم نے صرف ایک تحصیل کو کور کرنا ہے۔ ہمارے لئے پورے ضلع کو نتھ ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی چند دن فرصت کے ہیں، بعد میں ہمارے پاس وقت نہیں ہوگا۔''

اُس نے سر ہلا کر خاموشی اختیار کر لی۔ وہ، شبر اور شیرو تینوں مل کر پروگرام بنانے لگے۔ آدھے گھنٹے میں پروگرام تشکیل پا چکا تو تینوں بڑی سرکار کے خاص کمرے سے نکل کر شہر کے مغربی حصے میں واقع ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ چوہدری باسط کی لڑکی کو اغوا کر کے یہاں لایا جانا تھا۔ شبر نے مشورہ دیا۔ ''عالمگیر! ایک کی بجائے دونوں لڑکیوں کو اغوا کرنا پڑے گا۔ دونوں اکٹھے کالج میں آتی ہیں۔ ایک کو اغوا کیا گیا تو دوسری چند منٹوں میں ہی آسمان سر پر اُٹھا لے گی۔''

ان سے بہت بڑی غلطی سرزد ہونے والی تھی۔ ستائشی نظروں سے شبر کو دیکھتے ہوئے شیرو نے کہا۔ ''ویل ڈن شبر! تم لاجواب انسان ہو۔ اِس طرف تو ہم نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔''

''ہمارے منصوبے میں ایک اور بہت بڑی خامی موجود ہے۔ وڈیو بنانے کیلئے لڑکی کا آمادہ ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ جبر ظاہر ہوتا ہے جو مغویہ کو بےقصور ثابت کر دیتا ہے۔'' شبر نے سوچ کر کہا۔ ''بڑی بہن کو چھوٹی کے نام پر بلیک میل کر کے ہم اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ دونوں کو اغوا کرنا اِس لحاظ سے بھی ضروری ہے۔''

عالمگیر اُس کا ہم خیال ہو گیا۔

واردات کیلئے وہ نہ صرف پلاننگ کر رہے تھے بلکہ انتظام و انصرام میں بھی مسلسل جُتے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے بڑا بے داغ منصوبہ تشکیل دے لیا تھا۔ شام کو جب اوکے کی رپورٹ ملی تو عالمگیر نے شبر کو اپنے ٹھکانے پر بھیج دیا اور سمجھا دیا کہ وہ بشیر خان کے علاوہ باقی افراد کو شہر میں بھیج دے۔ اُس کے نقش پا پر چلتے ہوئے شیرو نے بھی اُن بندوں کو ٹھکانے پر بلا لیا تھا جو بہت کم منظر عام پر آئے تھے۔

شکاریوں نے مچان باندھ لی تھی۔ اُن کے جال میں پھنسنے والی بے خبری میں اپنی بہن کے ساتھ گھر سے کالج جانے کیلئے نکل آئی تھی۔ دنیا پہلے جیسی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں بہنیں کلائیوں پر وقت دیکھتے ہوئے ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع ویگن اسٹینڈ پر پہنچ گئیں۔ چھوٹی بولی۔ ''باجی! آج سردی کل سے کہیں زیادہ ہے۔ چھٹی کر لیتیں تو اچھا تھا۔ مزے سے صحن میں بیٹھ کر دھوپ تاپتے ہوئے مونگ پھلی کھاتیں۔''

بڑی نے مسکرا کر کہا۔ ''بلاوجہ چھٹی کرنے سے بندہ اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے ایک قدم کو کھو بیٹھتا ہے۔''

ایک ویگن آ کر اُن کے پاس رُک گئی تھی۔ چند ایک سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمیشہ خالی نشست دو چار ویگنیں گزار کر ملتی تھی۔ وہ لپک کر اُس میں سوار ہو گئیں۔ کنڈیکٹر نے گیٹ بند کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔ ''چل اُستاد! گاڑی کو جہاز بنا دے ورنہ پچھلی گاڑی کراس کر کے سٹینڈ پر پہلا نمبر حاصل کر لے گی۔''

ڈرائیور کو ایکسی لیٹر پر پاؤں کا وزن بڑھانے کا معقول جواز ہاتھ لگ گیا۔ گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔ اپنی اپنی نشستوں پر براجمان مسافر چادروں کی بکلوں میں سے جھانک کر ایک دوسرے کو معنی خیز اشارے کرنے لگے۔ بغیر کسی رکاوٹ کے انہوں نے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ شہر میں داخل ہو کر گاڑی اجنبی راستے پر مڑی تو دونوں بہنوں کو پریشانی لاحق ہوئی۔ بڑی نے پوچھا۔ ''ہم نے کالج اسٹاپ پر اُترنا ہے۔ یہ کس طرف جا رہے ہو تم؟''

ڈرائیور نے پیچھے دیکھے بغیر کہا۔ ''بی بی! بے فکر بیٹھی رہو۔ اِدھر پولیس والے کھڑے چالان کر رہے ہیں۔ ہم شہر کا چکر کاٹ کر تمہیں کالج اور دوسرے مسافروں کو ویگن اسٹینڈ پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچا دیں گے۔ کوئی اغوا تھوڑی کر رہے ہیں۔''

مسافروں نے ملا جلا قہقہہ لگایا۔ دونوں بہنوں کو سنانے کیلئے ٹریفک پولیس والوں پر طنز کرنے لگے۔ وہ مطمئن ہو گئیں۔ جب اچانک ویگن موڑ کاٹ کر بڑی سی کوٹھی کے کھلے مین گیٹ میں داخل ہوئی تو دونوں خوفزدہ ہو کر ارد گرد دیکھنے لگیں۔ چھوٹی چلائی۔ ''یہ تم ہمیں کہاں لے کر آ گئے ہو؟ گاڑی روکو اور ہمیں یہیں اُتار دو۔''

اُنہیں حالات کی سنگینی کو پوری طرح سمجھنے تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ شکاریوں کی تپتی ہوئی ہنڈیا میں ہرنیوں کا گوشت اتر چکا تھا۔ ایک نے گیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کئی ہاتھ اُس پر لپک پڑے۔ آن کی آن میں انہیں دبوچ کر اندر لے جایا گیا۔ وہ اِس طرح ہاتھ لگی تھیں کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیا تھا۔

لوہے کے پایوں والی چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھے عالمگیر اور شیرو نے کھلے دروازے کے پار دیکھا۔ اُن کے کارندے دونوں لڑکیوں کو گھسیٹتے ہوئے کوریڈور کے آخری سرے پر واقع بڑے کمرے میں لے گئے تھے جہاں اُن کے سواگت کیلئے تمام تر انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ شیرو نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''شبر علی غضب کا منصوبہ ساز بندہ ہے۔ سواریاں ویگن پر چڑھ کے کالج پہنچیں۔ کالج میں پڑھائی کرنے کے بعد ویگن میں سوار ہو کر اُپنے سٹاپ پر اُتر گئیں۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو گی کہ آج پڑھایا جانے والا سبق پہلے جیسا نہیں تھا۔''

عالمگیر مسکرا کر اپنی عادت کے مطابق دانتوں سے ناخن کاٹنے لگا۔ بظاہر مطمئن دکھائی دینے والا عالمگیر اندر ہی اندر شدید اضطراب کا شکار ہو چکا تھا۔ چند منٹوں کے بعد شیرو کے ایک کارندے نے اندر جھانک کر دیکھا اور آہستگی سے کہا۔ ''استاد شیرو! ڈھاٹے باندھ کر لوکیشن چیک کر لو تا کہ ہم اپنا کام شروع کریں۔''

دونوں نے اپنے چہرے ماہرانہ انداز میں چھپائے اور بڑے کمرے میں آ گئے۔ دروازے میں کھڑے ہو کر دونوں نے مشاقانہ نگاہوں سے پورے کمرے پر نگاہ دوڑائی۔ کمرے کے آخری سرے پر چھوٹی بہن کو کھڑی چارپائی کے ساتھ نائیلون کی رسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود گردن موڑ کر کمرے میں ہونے والی کاروائی کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بڑی بہن کمرے کے وسط میں رکھے بڑے سے بیڈ کے وسط میں بیٹھی ہچکیاں

لے رہی تھی۔ وڈیو کیمرہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر دونوں آگاہ تھے کہ کہیں چھپے ہوئے کیمرے کی آنکھ کمرے کی نقل و حرکت کو ہمیشہ کیلئے محفوظ کر رہی ہوگی۔

عالمگیر کے ایک ساتھی نے اشارہ پاتے ہوئے اپنی کاروائی کا آغاز کیا۔ بیڈ کے پاس آ کر کہا۔ ''اے لڑکی! تم دونوں اِس وقت پوری طرح ہمارے شکنجے میں ہو۔ ہم تمہیں گولی بھی مار سکتے ہیں۔ مگر تمہیں قتل کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔''

وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا جو بھی مقصد ہو، قتل سے کسی طور کم نہیں ہوگا۔ کیا چاہتے ہو؟''

وہ سفاکی سے بولا۔ ''ہم صرف تمہیں چاہتے ہیں۔ تمہاری بہن پیٹھ کئے کھڑی ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گی تو وہ محفوظ رہے گی۔ اُس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔'' دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن لہراتے ہوئے اُسے ڈرانے کیلئے اپنا لہجہ سخت کر کے بولا۔ ''اگر تم تعاون نہیں کرو گی، جیسا ہم کہیں گے ویسا نہیں کرو گی تو یہ سوچ لو کہ ہم اپنا کام کر کے ہی رہیں گے۔ اس صورت میں تم دونوں پر عذاب نازل ہو جائے گا۔ چند منٹ دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تم یا تم دونوں؟''

وہ روتے ہوئے منتیں کرنے لگی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''خدا کا خوف کھاؤ۔ میرا باپ دل کا مریض ہے۔ اُسے جب اِس قیامت کا پتہ چلے گا تو وہ جان دے دے گا۔''

گن بردار بولا۔ ''میں نے تمہیں بتلایا ہے کہ اگر تم تعاون کرو گی تو تمہارے باپ کو پتہ تک نہیں چلے گا۔''

وہ سوچنے لگی۔ ''اتنا بڑا حادثہ چھپائے سے نہیں چھپتا۔ آج یا کل...... ابا کو پتہ چل جائے گا۔ تب کیا ہوگا؟''

آنسو خشک ہو گئے۔ سوچنے لگی۔ ''جو اتنا بڑا قدم اٹھا چکے ہیں وہ جُڑے ہاتھوں کو دیکھ کر انہیں چھوڑ نہیں دیں گے۔ میں اکڑ دکھاؤں گی تو یہ درندے میرے ساتھ ساتھ میری چھوٹی بہن کو بھی اُدھیڑ دیں گے۔ دونوں کے مرنے سے بہتر ہے کہ ایک مر جائے۔ میں بڑی ہوں۔ مجھے ہی ذلت کی گہری کھائی میں اُترنا ہوگا۔''

عالمگیر اور شیرو مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔ اپنے کمرے میں بیٹھ کر شیرو نے کہا۔ ''بڑی لڑکی خاصی عقلمند دکھائی دیتی ہے۔ چھوٹی کو بچانے کیلئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعاون پر آمادہ ہو جائے گی۔''

وہ آہ نما طویل سانس سینے میں اُتار کر بولا۔ ''شیرو استاد! مشکل سوال کے مقابلے میں آسان سوال رکھا جائے تو بندہ سر جھکا کر آسان سوال حل کرنے لگتا ہے۔ اُس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ نہ جانے ہمارے سامنے کیسا پرچہ حل کرنے کیلئے رکھا جائے گا۔''

شیرو ہنسنے لگا۔ اُس کے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولا۔ ''ہمارے ہاتھوں میں پرچہ تھما کر ہاتھ قلم کر دیے گئے ہیں۔ قلم ڈیسک پر دھرا ہے اور ہم خالی شانے لئے کمرہ امتحان میں ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے ہیں۔ ہم پر جرائم کا بوجھ اتنا لد چکا ہے کہ جب بھی پکڑے گئے، پولیس مقابلے میں پار کر دیے جائیں گے یا عدالت ہمیں سزائے موت دے دے گی۔ ہماری جان خطرے میں ہے اس لئے ہم ہر کسی کی جان اور عزت کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہیں۔''

بڑے کمرے سے کچھ مشکوک آوازیں برآمد ہو رہی تھیں جو انہیں تسلی دے رہی تھیں کہ اُن کا مشن بغیر کسی کٹھنائی کے پایہ تکمیل تک پہنچ رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد دونوں اُٹھ کر کوٹھی کے لان میں آ کر بیٹھ گئے۔ اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے دونوں بڑے معزز دکھائی دے رہے تھے۔ زمانہ کمرے میں بپا ہونے والی قیامت سے بے خبر اپنی مستی میں مگن تھا۔

جب ویگن لڑکیوں کو مصنوعی مسافروں کے جلو میں لے کر روانہ ہو رہی تھی تو عالمگیر اور شیرو دونوں اُس طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ ویگن کے انجن کی آواز سے اندازہ ہوا کہ جانے والے جا چکے ہیں۔ شیرو کا ایک کارندہ اُن کے پاس آیا۔ دو وڈیو کیسٹیں اُن کے سامنے پڑے لوہے کے پائپ والی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''استاد عالمگیر! ایک میں ملک فرید کی کوٹھی کی وڈیو اور سیپ شارٹ ہیں۔ دوسری میں ......''

بات ادھوری چھوڑ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ عالمگیر نے شیرو کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میں آج رات ہی لاہور کیلئے نکل جاؤں گا۔ دونوں فلموں کی ایڈیٹنگ اس انداز میں کراؤں گا کہ دیکھنے والے کو یہی پتہ چلے کہ ملک فرید کی کوٹھی کے کمرے میں یہ کارروائی کی گئی ہے۔ چند دن لگ جائیں گے اِس کام میں۔''

شیرو بولا۔ ''یہ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ میرے ذمہ لگایا گیا کام کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔'' اپنے کارندے کی طرف منہ کر کے پوچھنے لگا۔ ''تم نے فلم لڑکیوں کو

دکھادی تھی؟"

وہ بولا۔ "بڑی کو دکھائی تھی۔ اُسے سمجھا بھی دیا تھا کہ اگر کسی کو کچھ بتانے کی کوشش کی تو اِس فلم کی کاپیاں گاؤں بھر میں پھیلا دی جائیں گی۔"

عالمگیر دونوں کیسٹیں اٹھائے ہاتھ لہراتا ہوا کوٹھی سے نکل آیا۔ اُس کی گاڑی بڑی سرکار کی کوٹھی میں کھڑی تھی۔ وہاں تک اُسے رکشا پکڑ کر جانا تھا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اُس نے سردار کو فون پر مشن میں کامیابی پر مبارکباد دے دی تھی۔ سردار کی آواز سن کر ہی اُس نے اندازہ لگالیا تھا کہ اُس کے روم روم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

ویگن سے اپنے اسٹاپ پر اُترنے والی دونوں لڑکیاں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہی تھیں۔ آج جو پڑھا تھا، وہ دنیا کے کسی بھی نصاب میں لکھا ہوا نہیں تھا۔ بڑی بہن نقاہت سے قدم گھسیٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ "جی چاہتا ہے کہ زمین شق ہو جائے اور میں اُس میں چوٹی تک اُتر جاؤں۔ پڑھانے گئی تھی، غلاظت کی پوٹلی بن کر واپس آئی ہوں۔ علم کی شمع روشن کرنے کیلئے گھر سے نکلی تھی، ایسی آگ بدن میں بھر لائی ہوں جو مرتے دم تک سکھ کا سانس نہیں لینے دے گی۔ شکر ہے کہ پڑھنے کیلئے میرے ساتھ جانے والی بخیر و عافیت لوٹی ہے۔"

چھوٹی سوچ رہی تھی۔ "دیکھا نہیں مگر محسوس بہت کچھ کیا ہے۔ میرے لئے باجی نے اپنی عزت کی قربانی دے کر مجھے ہمیشہ کیلئے خرید لیا ہے۔ کاش! ہم دونوں دھوپ سینکنے کیلئے صحن میں چارپائیاں بچھا کر پڑی رہتیں اور یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ ہائے اللہ! یہ کیسی قیامت ہم دونوں پر ٹوٹ پڑی ہے جس سے پوری دنیا بے خبر ہے۔"

یکبارگی دونوں کے دل سے دعا نکلی کہ دنیا جس طرح بے خبر ہے، ایسے ہی قیامت تک بے خبر رہے ورنہ کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

❁❁❁

ڈرائیور اور باڈی گارڈ دونوں نے شاپنگ سنٹر سے متصلہ تمام علاقہ کنگھال مارا تھا مگر بی بی کا کہیں پتہ نہ چلا۔ پولیس کی گاڑیاں جابہ جا پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے کئی پولیس والوں سے بھی دریافت کیا مگر کوئی سراغ ہاتھ نہ آیا۔ رحمت بی کو اس امید پر فون کیا کہ ہوسکتا ہے وہ رکشا یا ٹیکسی پکڑ کر گھر پہنچ گئی ہو۔ وہ گھر نہیں پہنچی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں کی حالت خراب ہونے لگی۔ ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ڈرائیور نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بی بی کو زمین نگل گئی یا آسمان؟ دو گھنٹوں میں ہم نے پورا علاقہ چھان مارا ہے۔ سردار ہمیں کچا چبا ڈالے گا جب اُسے پتہ چلے گا کہ بی بی غائب ہوگئی ہے۔"

گارڈ نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں تھانے اور ہسپتال چیک کرنا چاہئیں۔ امید ہے کہ کہیں نہ کہیں ہمیں بی بی مل جائے گی۔ اگر نہ ملی، تب سردار کو اطلاع کر دیں گے۔"

ڈرائیور چاہتا تھا کہ فوری طور پر سردار کو فون پر مطلع کر دینا چاہیے۔ گارڈ اِس حق میں نہیں تھا۔ دونوں نے اطراف کے ہسپتالوں اور تھانوں سے رابطہ کیا مگر ناکامی ہوئی۔ نامراد ہو کر کوٹھی پر پہنچے۔ تب تک چار گھنٹے بیت چکے تھے۔ رحمت بی نے انہیں بتلایا کہ بی بی کوٹھی پر نہیں پہنچی۔ وہ دونوں سر پیٹ کر رہ گئے۔ ڈرائیور نے فکر آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ سردار کو فون کر کے مطلع کر دیتے ہیں۔ اب وہ اِس بات پر بھی خفا ہوگا کہ ہم نے فون کرنے میں اتنی تاخیر کیوں کی۔"

رحمت بی کو ابھی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس نہیں تھا۔ اُن کی باتیں سن کر سراسیمہ نگاہوں سے باری باری دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔ گارڈ نے اُسے شاپنگ سنٹر میں ہونے والے دھماکے اور بی بی کے نہ سمجھ میں آنے والے غیاب کے بارے میں تفصیل سے بتلایا۔ وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ سر پیٹنے لگی اور انہیں کوسنے لگی۔ "تم پر سردار ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے۔ حرام کھلاتا ہے۔ صرف اِس لئے کہ تم بی بی کی حفاظت کرو۔ تم اُسے کسی مصیبت میں ڈال کر ہیجڑوں کی طرح تالیاں بجاتے گھر آ گئے ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے اور وہ جہاں سے بھی ملے، لے کر آؤ ورنہ......"

ورنہ کے آگے والا کام سردار کا تھا۔ تینوں کو اپنی ہڈیاں ٹوٹتی دکھائی دے رہی تھیں۔ احمقوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ ایسے میں فکسڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔ یوں لگا جیسے کانوں کے قریب کوئی بم پھٹ گیا ہوں۔ دونوں اُچھل پڑے۔ گارڈ نے کمرے میں جا کر سی ایل آئی پر درج نمبر پڑھا۔ خون نچڑ کر آنکھوں میں آ گیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "سردار کا فون ہے۔ آ کر سنو!"

رحمت بی اور ڈرائیور اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں پڑ

رہی تھی کہ وہ سردار کا فون اٹینڈ کرتا۔ بیل تھک کر خاموش ہوگئی تو وقتی طور پر یوں محسوس ہوا جیسے قیامت آ کر وارننگ دے کر چلی گئی ہو۔ رحمت بی نے بڑی ونڈو کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ دونوں کو امید بندھی کہ ہوسکتا ہے بی بی آ گئی ہو۔ رحمت بی کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر دونوں کے منہ لٹک گئے۔ فون پھر جاگ پڑا تھا۔ گارڈ نے طوعاً و کرہاً فون اُٹھایا۔ سردار کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”کیا سب لوگ مر گئے ہو؟ فون کیوں نہیں اُٹھاتے؟“

وہ بولا۔ ”جج......جی سردار!“

آواز گلے میں ہی کہیں پھنس کر رہ گئی تھی۔ سردار نے ڈپٹتے ہوئے کہا۔ ”رحمت بی کدھر ہے؟ اُسے بتلاؤ کہ سردار کا فون ہے۔“

۔”جی ایک منٹ! ابھی بلواتا ہوں۔“ یہ کہہ کر گارڈ سہمی ہوئی نگاہوں سے رحمت بی کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک مین گیٹ پر ہارن بج اُٹھا۔ سردار کے فون کو ہولڈ پر منتظر رکھ کر تینوں بجلی کی سرعت سے گیٹ پر بھاگ گئے۔ گارڈ نے گیٹ کھولا۔ باہر ہسپتال کی ایمبولینس کھڑی تھی۔ تینوں کے دل دھک سے رہ گئے۔ اگلی نشست سے سفید کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی اُتر کر اُن کی جانب آیا۔ قریب آ کر بولا۔ ”سردار فضل خان کی کوٹھی یہی ہے؟“

تینوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گارڈ نے پوچھا۔ ”خیر تو ہے ناں؟“

وہ بولا۔ ”بالکل خیریت ہے۔ سردار فضل خان کی بیٹی دھماکہ سن کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ ایک رفاحی ادارے نے اُسے اُٹھا کر ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ ہوش میں آنے پر اُسے لے آئے ہیں۔“

اُسی دوران ایمبولینس کا پچھلا گیٹ کھلا۔ شانی بی بی ڈگمگاتے قدموں سے چلتی ہوئی اُن کی طرف آنے لگی۔ تینوں بھاگ کر اُس تک پہنچے۔ ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔ بخیریت پا کر اطمینان کا سانس لینے لگے۔ ڈرائیور نے کچھ نوٹ ایمبولینس سے برآمد ہونے والے سفید پوش کو تھمائے اور وہ سب بہ عجلت کوٹھی میں داخل ہوگئے۔ ان میں سے کسی نے یہ پوچھنے اور دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی کہ ایمبولینس کس ہسپتال سے آئی تھی۔ شانی بی بی کو کمرے میں پہنچا کر تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ رحمت بی نے اُسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے پوچھا۔ ”بی بی! اب طبیعت کیسی ہے؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں ٹھیک ہوں۔“

وہ تینوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ رحمت بی کو سردار کا فون یاد آ گیا۔ بھاگتی ہوئی کمرے میں پہنچی۔ فون اُٹھایا اور جلدی سے بولی۔ ”سردار! معاف کرنا۔ میں بی بی کا سر دبانے میں مصروف تھی۔ وہ سوئی ہے تو میں فون سننے کیلئے آئی ہوں۔“

سردار نے غصے سے کہا۔ ”میں پندرہ منٹ سے فون تھام کر بیٹھا ہوں۔ خدا جانے تم لوگوں کو عقل کب آئے گی۔ شانی ٹھیک تو ہے ناں؟“

اُس نے بات بنائی۔ ”اُسے سر میں درد تھا۔ مجھے کہنے لگی کہ سر دبا دو۔ میں اُس کے سرہانے بیٹھی تھی کہ آپ کا فون آ گیا۔ آپ جانتے تو ہیں کہ وہ اپنی مرضی کرتی ہے۔ میں نے کہا بھی کہ سردار صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ وہ کہنے لگی کہ جب میں سو جاؤں تب جا کر فون سننا۔“

سردار زیرِ لب مسکرانے لگا۔ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بولا۔ ”وہ جاگے تو اُسے کہنا کہ اپنے پاپا کو فون کرے۔ احمق نہیں کی!“

فون بند ہوگیا۔ رحمت بی نے سکون کا سانس لیا۔ دونوں کو مخاطب کر کے بولی۔ ”میرا منہ کیا دیکھتے ہو؟ جاؤ! ڈاکٹر کو لے کر آؤ اور بی بی کا چیک اپ کراؤ۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ابھی تک خوفزدہ ہے۔“

دونوں نے جانے میں کوئی سستی نہیں دکھائی۔ اُن کو بھگا کر رحمت بی شانی بی بی کے کمرے میں آئی۔ وہ بیڈ پر آڑھی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے اُس کے بے ترتیب جسم کو گھسیٹ کر سیدھا کیا۔ سر کے نیچے سرہانہ رکھا اور کمر تک کمبل اوڑھا دیا۔ سر دباتے ہوئے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔ ایسے میں اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ رحمت بی کو غور سے دیکھنے لگی۔ بولی۔ ”یوں لگتا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ تم خواب ہو؟ اگر خواب ہو تو میری نظروں سے اوجھل ہو جاؤ۔ اگر حقیقت ہو تو میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے یقین دلاؤ۔“

لہجہ بکھرا ہوا تھا۔ رحمت بی کا دل ہول کھانے لگا۔ اُس کی آنکھوں پر پیار سے ہاتھ پھیر کر بولی۔ ”میری جان! تم ہوش میں ہو۔ جاگ رہی ہو۔ میں تمہارے پاس بیٹھی ہوں۔

تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بم دھماکے میں تجھے رَتی بھر چوٹ بھی نہیں آئی۔"

وہ آنکھیں کھولے سوچنے لگی۔ بم دھماکہ؟

مسکرانے لگی۔ نسبتاً بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "لگتا ہے تم خواب دیکھ رہی ہو۔ میں جاگ رہی ہوں۔ ہائے! اتنا عجیب خواب دیکھا ہے میں نے کہ ابھی تک یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے خواب میں ہی پڑی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ بیڈ میں اُٹھ بیٹھی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ یقین آ گیا کہ اپنی خواب گاہ میں بیٹھی ہوئی ہے۔ رحمت بی کی گود میں سر رکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔ ایسے میں گارڈ اور ڈرائیور ڈاکٹر کو لے آئے۔ ڈاکٹر نے اُسے چیک کیا۔ اُس سے کچھ دریافت بھی کیا۔ وہ بولی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ عجیب سا خواب دیکھا ہے۔ دل پھر وہی خواب دیکھنا چاہتا ہے۔ آپ کے پاس کوئی ایسا ٹیکہ ہے جو مجھے واپس اُس خواب میں لے جا سکتا ہے تو مجھے لگا دیں۔"

ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ "ہاں بیٹی! ایسا ایک ٹیکہ ہے جو تمہیں اپنی من چاہی دنیا میں واپس لے جا سکتا ہے۔ لاؤ! بازو اِدھر کرو۔"

اُس نے میڈیکل باکس میں سے ایک ایمپیول نکالا۔ سرنج بھر کر اُس کے بازو کی وین میں انجیکٹ کر دیا۔ گارڈ سے مخاطب ہوا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بے ہوش رہی ہے۔ بے ہوشی میں خواب دیکھتی رہی ہے۔ میں نے اِسے سکون آور دوا دے دی ہے۔ یہ گولیاں کھلا دیں اور اِسے آرام کرنے دیں۔ جب سو کر اُٹھے گی تو بالکل فریش اور تندرست ہو گی۔"

چند ٹیبلٹ دے کر، فیس بٹور کر وہ چلا گیا۔ تینوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ آئی ہوئی قیامت اُلٹے پیروں پلٹ گئی تھی۔ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تینوں اپنی اپنی دنیا میں سمٹ گئے۔

دوا اپنا رنگ دکھانے لگی۔ وہ خود کو ہوا میں اُڑتا محسوس کرنے لگی۔ روٹھے ہوئے خواب کو غنودگی میں آوازیں دینے لگی۔ ادھوری نیند میں بڑبڑانے لگی۔ "اے! تم بھی رئیس کی طرح میری طرف پلٹ آؤ۔ مجھے اپنی بانہوں میں لے کر مجھے یقین دلاؤ کہ میں دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہوں۔ مجھے بتلاؤ کہ مجھے فتح کرنے کیلئے اَب بھی زمانہ جنگیں لڑ سکتا ہے۔ لوٹ آؤ میرے مَن چاہے خواب......"

کبھی کبھی خواب لوٹ آتے ہیں۔ اُس سے ایک بار کا دیکھا ہوا خواب ناراض دکھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیتا تھا۔ نہیں پلٹا۔ رگوں میں اُترنے والی سکون آور دوا نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ وہ ننھے ننھے خراٹے لینے لگی۔ رحمت بی نے ایک دو مرتبہ دروازہ کھول کر اُسے دیکھا۔ تسلی پا کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگی۔ "شکر ہے کہ میں نے سردار کا فون نہیں اُٹھایا۔ اللہ نے بی بی کو بہ حفظ و امان عین موقع پر بھیج دیا ورنہ سردار نے ہم تینوں کی کھال کھینچ کر بھس بھر دینا تھا۔"

بعض قیامتیں نوازش کا روپ دھار کر آتی ہیں، بعض عافیت کے کپڑوں میں ملبوس ہو کر آتی ہیں۔ آ کر چلی جاتی ہیں اور انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ جب دبے پاؤں گزر جانے والی آندھی کے اثرات دیکھتا ہے تو سوچنے لگ جاتا ہے کہ یہ کب اور کیسے ہو گیا؟...... ایسے میں اُسے کوئی دکھائی نہیں دیتا جو اُسے بتلا دے کہ کس نے کیا کر دیا ہے۔

دن چڑھ آیا تھا۔ راحت بی کئی مرتبہ اُسے جگانے کیلئے کمرے میں آئی مگر ہمت نہ پا کر لوٹ گئی۔ موبائل فون بے جان تھا۔ دل کی طرح دھڑکنے کے علاوہ کوئی کام نہیں جانتا تھا۔ اُسے نہیں پتہ تھا کہ خوابیدہ حسن کو بیدار کرنے کی کیا سزا مل سکتی ہے۔ وہ چیخ اُٹھا۔ شانی نے اُٹھ کر اُسے دیکھا۔ جسارت پر خفا ہو کر آنکھیں ملنے لگی۔ اُس کی بے رخی پر بھی فون خاموش نہیں ہوا تو اُس نے لپک کر اُسے اُٹھا لیا۔ فون پر۔ "پاپا" کا لفظ جگمگا رہا تھا۔ اُس نے سر جھٹک کر بکھرے ہوئے بالوں کو کمر پر ڈالا اور فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔ "ہائے پاپا! اتنی مزے کی نیند آئی ہوئی تھی کہ آپ نے جگا کر مزہ کرکرا کر دیا۔"

سردار کی متفکر آواز سنائی دی۔ "بیٹی! خیریت تو ہے ناں؟ اتنی دیر گئے تک سو رہی ہو۔ کیا یونیورسٹی نہیں جانا تھا؟"

وہ ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ باپ کی آواز آئی۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے؟ سیدھی طرح بتاؤ کہ اَب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

وہ بمشکل خود پر قابو پا کر بولی۔ "پاپا! آپ بھی بڑے عجیب ہیں۔ کیا میں اتوار کے دن کیمپس پہنچ جایا کروں؟"

باپ جھینپ کر ہنسنے لگا۔ بولا۔ "اچھا! بوڑھے باپ پر ایسے ہنسنے والی کو اتنا پتہ تو ہونا چاہیے کہ میں کل شام سے اَب تک کئی مرتبہ فون کر چکا ہوں۔ جب پوچھو، پتہ چلتا ہے کہ بی بی صاحبہ سو رہی ہیں۔ سونے کے علاوہ بھی کوئی کام کر لیا کرو۔"

وہ ریسیور کو چوم کر بولی۔ ''مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ میرے لئے پریشان ہو رہے ہیں۔ بازار میں ایک بم پھٹا تھا۔ اُس سے ڈر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ سر میں کچھ درد تھا۔ ڈاکٹر نے دوا دی اور میں مزے سے سو گئی۔ اب جاگی ہوں۔''

باپ پریشان ہو گیا۔ کرید کرید کر پوچھنے لگا۔ باپ کے بعد ماں نے بھی تفصیل دریافت کی۔ پھر مطمئن ہو کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ رحمت بی چائے کی پیالی لئے کھڑی تھی۔ اُس سے پیالی پکڑتے ہوئے بولی۔ ''رحمت بی! آج کیا دن ہے؟''

رحمت بی نے کہا۔ ''آج منگل ہے۔''

وہ ہنسنے لگی۔ پیالی ہاتھ میں لرزنے لگی۔ پیالی رکھ کر ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ رحمت بی نے ہنسنے کی وجہ دریافت کی تو وہ بولی۔ ''پاپا نے بھی مان لیا کہ آج اتوار ہے...... میں پاگل ہوں، وہ بھی پاگل ہیں۔ ہائے رحمت بی! خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے؟''

رحمت بی عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کچن میں ناشتہ تیار کرنے کیلئے چلی گئی۔ وہ چائے پینے لگی۔ منہ کا ذائقہ کڑوا تھا۔ پہلے چند گھونٹ بے مزہ لگے۔ پھر چائے مزہ دینے لگی۔ آخری گھونٹ حلق میں اُتار کر بیڈ سے اُتری۔ ٹانگیں وزن سہار نہ سکیں۔ قالین پر دھپ کر کے گر گئی۔ بیڈ کے فوم پر ہاتھ رکھ کر اُٹھی اور سوچنے لگی۔ ''آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا۔ آج کیوں ہونے لگا ہے؟''

سہارا لے کر کھڑی ہوئی۔ احساس ہوا کہ بدن کا عضو عضو عجیب سی شکست و ریخت کا شکار ہو چکا ہے۔ خواب اتنے جاندار نہیں ہوتے کہ جاگنے پر بھی اپنے اثرات چھوڑ جائیں۔ اُسے خواب پوری طرح یاد نہیں رہا تھا۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ رئیس اُس پر جھکا ہوا اُس کے حسن کی تابنا کیوں کو اپنی نگاہوں میں، اپنے وجود میں جذب کر رہا تھا۔ سوچنے لگی کہ وہ رئیس سے کہاں ملی تھی؟ یاد نہ آیا۔ یاد کرنے کی کوشش میں یہ یقین بھی جاتا رہا کہ اُسے توڑنے پھوڑنے والا رئیس ہی تھا یا کوئی اور۔ باتھ روم کی طرف جانے لگی تو واضح طور پر لڑکھڑا گئی۔ سر چکرانے لگا۔ سوچنے لگی کہ ڈاکٹر کے لگائے ہوئے انجکشن کا اثر ابھی تک گیا نہیں۔ خود کو فریش کرنے کیلئے اُس نے باتھ لینے کا ارادہ کیا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

بالوں کو تولیے میں لپیٹ کر لباس تبدیل کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ ''یہ کیسی کمزوری بدن سے چمٹ گئی ہے؟ جسم میں کہیں دُکھن نہیں ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے تمام کی تمام ہڈیاں چور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چور کر دی گئی ہوں۔ کچھ ایسا ہوا ہے جس کا مجھے پتہ نہیں چل رہا۔'' پھر خود ہی اپنے خیالات کی نفی کرنے لگی۔ کبھی نشہ آور انجکشن نہیں لگوایا تھا۔ کبھی ڈر کر بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ سوچنے لگی۔ ''ہو سکتا ہے کہ نشے کا ٹیکہ لگوانے کے بعد ایسا ہی محسوس ہوتا ہو۔ ڈر کر بے ہوش ہونے والا ہوش میں آنے پر ایسا ہی محسوس کرتا ہو......''

ناشتہ کرنے اور تیار ہونے تک وہ کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ سر جھٹک کر بار بار بھٹکتی ہوئی ذہنی رو کو قابو میں لانے کی کوشش کرتی رہی تاوقتیکہ ہیجان ٹھہر نہیں گیا۔ ٹہلتے ہوئے لان میں آ گئی۔ کرسی میں بیٹھ کر فون پر رئیس سے رابطہ کرنے لگی۔ متعدد بار کی کوششوں پر بھی رابطہ نہیں ہوا تو جھنجلا کر پھولوں سے الجھنے لگی۔ گلاب کا پیلا پھول توڑ کر پتی پتی کر کے گھاس کے فرش پر بکھیر دیا۔ بے دردی سے پاؤں تلے روندتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ ''بے زبان چیز مردہ ہوتی ہے۔ تم کیسے مُردے ہو کہ ہر گزرنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہو۔ قریب آنے پر دھتکارنے لگتے ہو۔''

پھر رئیس کا نمبر ملانا چاہتی تھی کہ کوئی چنچل میوزک کی تال پر بولنے والے طوطے کی طرح اُس کے ہاتھ پر آن بیٹھا۔ اُس نے چونک کر نمبر کو دیکھا۔ اجنبی نمبر دیکھ کر چونک اُٹھی۔ آن کر کے بولی۔ ''جی فرمائیے! کون صاحب لائن پر ہیں؟''

دوسری طرف سے گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی جان بوجھ کر آواز بدلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اجنبی بن کر کان میں سرگوشی کرنے والا کہہ رہا تھا۔ ''شاہانہ فضل! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ غور سے میری بات سنو۔''

وہ بولی۔ ''مگر آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''میں کون ہوں، یہ بتلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ تم مجھے نہیں جانتی ہو۔'' اُس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ''میں کیا کہنا چاہتا ہوں، یہی بتلانے کیلئے میں نے فون کیا ہے۔ کل تمہاری زندگی سے تین چار گھنٹے چرائے جا چکے ہیں۔ اتنی صفائی سے کہ تمہیں خبر تک نہیں ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد تمہیں کوریئر کے ذریعے ایک پارسل ملے گا۔ اُس میں سے ایک وڈیو ڈسک برآمد ہو گی۔ تمہارے چرائے ہوئے چند گھنٹے اُس میں محفوظ ہیں۔ وصول کر کے دیکھ سکتی ہو۔''

وہ ٹھٹک گئی۔ بات اُس کے خانے میں کہیں نہیں بیٹھی تھی۔ حیرت و استعجاب کے عالم میں بولی۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں۔ آپ جو کہنا چاہتے ہیں، وہ کھل کر کہیں۔''

وہ بولا۔ ”تم اُس فلم کو بالکل تنہائی میں دیکھنا۔ نہ سمجھ میں آنے والی بات سمجھ میں آجائے گی۔ دیکھنے کے بعد اُسے توڑ دینا اور کسی سے تذکرہ نہ کرنا ورنہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔“

وہ پریشانی سے فون کو کان سے ہٹا کر سکرین کو گھورنے لگی۔ خیال آنے پر جلدی سے کان سے لگایا مگر بولنے والا خاموش ہو چکا تھا۔ اُس نے جلدی سے کال بیک کا بٹن پش کر کے موبائل فون کان سے لگایا۔ ریکارڈ شدہ نسوانی آواز بتلانے لگی کہ مطلوبہ نمبر بند ہے۔ جھنجلا کر بار بار ری کال کا بٹن پش کرنے لگی۔ تھک کر کرسی میں گر گئی۔ تب بات سمجھ میں آئی کہ جانے والا بار بار بلانے سے بھی پلٹ کر قریب نہیں آتا۔

گارڈ کو بلا کر ہدایت کی کہ جونہی کوئی پارسل آئے، فوری طور پر اُس کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ کمرے میں آ کر سوچنے لگی۔ کیا ہو چکا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ دونوں باتیں سمجھ میں نہ آنے والی تھیں۔ اپنی ذہنی کیفیات پر غور کرنے لگی۔ دل نے کہا۔ ”طبیعت میں جو سرور بھرا ہوا تھا، وہ بلاوجہ نہیں تھا۔ دنیا میں بغیر اپنے مفاد کے، کوئی بھی کچھ نہیں دیتا۔ تمہارے ساتھ کچھ ہو چکا ہے۔ خواب دینے والے نے تم سے کوئی بہت بڑی حقیقت چھین لی ہے۔“

سر تھام کر بیٹھ گئی۔ دل دھڑکنے لگا۔ گارڈ نے اُسے سفید لفافہ لا کر دیا تو چونک اُٹھی۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں غرق ہو کر لفافے کو دیکھنے لگی۔ جس نے اتنا تردد کیا تھا، وہ اُسے کوئی گیت مالا یا انڈین فلم دکھانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لرزتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ پلاسٹک کی پیکنگ میں ایک وی سی ڈی برآمد ہوئی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بندہ اپنی جانب اُٹھی ہوئی گن سے اتنا خائف نہیں ہوتا جتنا کسی غیر مضر شئے کو دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ نہ جانے اِس چمکتی ہوئی تھالی میں کیسی سیاہی بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنی دوستوں سے بارہا سی ڈی لے کر آئی تھی۔ رات کی تنہائی میں دیکھ کر پسینے سے شرابور ہو چکی تھی۔ نظر کی لمحاتی تسکین کیلئے وہ تمام رات کیلئے اپنے بدن اور ذہن کو بے چین کر بیٹھتی تھی۔ دیکھنے میں یہ بھی ویسی ہی دکھائی دے رہی تھی مگر...... اِس میں بھری ہوئی بے چینی پوری زندگی پر مسلط ہونے والی تھی۔

رحمت بی کو چائے کا حکم دیا۔ سی ڈی پلیئر آن کر کے ڈسک چلا دی۔ ٹی وی پر ڈسک کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ریڈ کئے جانے کا پیغام درج تھا۔ اُس نے دروازے کی طرف دیکھ کر پلیئر بند کر دیا۔ چائے آ گئی۔ پینے کے دوران اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ رحمت بی کے جانے کے بعد اُس نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ دروازہ بند ہوا، آنکھ کی کھڑکی کھل گئی۔

سکرین پر چند کوٹھیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ کیمرہ زوم کرتے ہوئے ایک کوٹھی پر آن ٹھہرا۔ چند لمحے منظر ساکت رہا۔ پھر زومنگ شروع ہو گئی۔ کوٹھی کے ایک کمرے کے دروازے کو چند سیکنڈ تک دکھایا گیا۔ اُس کا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ یہ بہر حال طے تھا کہ اُس نے فلم میں دکھائی جانے والی کوٹھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دروازے پر کیمرے کی آنکھ ٹھہری ہوئی تھی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

منظر بدل گیا۔ اَب اُس کمرے کا اندرونی منظر دکھایا جا رہا تھا۔ وہ ٹھٹک گئی۔ سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی مسہری بچھی ہوئی تھی۔ اُس پر وہ خود ہی براجمان تھی۔ اُس نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ سچ اُس کے سامنے سینہ تان کر کھڑا تھا۔ وہ اُٹھ کر ٹی وی کے قریب آ گئی۔ یہ یقین کرنا پڑا کہ سکرین پر چمکتا ہوا چہرا اُسی کا ہی تھا۔ لباس بھی وہی تھا جو پہن کر شاپنگ کیلئے گھر سے نکلی تھی۔

اُسے حیرانی ہوئی کہ وہ بے ہوش نہیں تھی، لیٹی ہوئی نہیں تھی بلکہ اپنے وزن کو پوری طرح سہار کر بیٹھی تھی۔ پھر کیمرے کے لینز اور اُس کے وجود کے درمیان سفید لباس والا حائل ہو گیا۔ اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا مگر وضع قطع سے بخوبی پتہ چلتا تھا کہ دروازے میں داخل ہونے والا شخص ہی کیمرے کے سامنے سے گزرا ہے۔

پھر آواز بھی سنائی دینے لگی۔ بلاشبہ اُسی کی آواز ٹی وی پر سنائی دی تھی۔ یہاں تک حیرانی ہی حیرانی تھی۔ اُس کے آگے پریشانی ہی پریشانی تھی۔ جو منظر وہ دیکھ کر ساری رات کیلئے بے چین ہو جایا کرتی تھی، صبح اُٹھنے پر بدن ٹوٹا پھوٹا محسوس ہوتا تھا، وہی منظر اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اُس نے بار بار پاز کر کے، ریورس کر کے دیکھا۔ لہجہ، شکل اور آنکھیں بتلاتی تھیں کہ وہ نشے کی حالت میں تھی۔ نشہ شراب کا بھی ہو سکتا تھا، کسی دوا کا بھی...... مگر لطف کشید کرنے کے لمحات نے اُسے ندامت اور پریشانی کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیا تھا۔

منظر پر منظر بدلتے رہے۔ فلم کے ہیرو کی شکل اُس کیلئے یکسر اجنبی تھی۔ اُس نے کبھی اُسے نہیں دیکھا تھا۔ ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ کیمرہ سمٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ پھر زوم کرتا ہوا کوٹھی سے نکل گیا۔ وہ بہت دیر تک پھٹی پھٹی نگاہوں سے سی ڈی پلیئر بنانے والی کمپنی کا مونوگرام ٹی وی سکرین پر دیکھتی رہی۔ دکھائے جانے والے منظر نے اُس کی رگوں سے خون کی آخری بوند تک نچوڑ ڈالی تھی۔ اب فون کرنے والے کی بات سمجھ میں آئی تھی۔ اُس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ سی ڈی پلیئر میں سے ڈسک نکال لے۔ پیشانی پر آئے پسینے کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے دراز ہوگئی۔ نظریں رُکے ہوئے پنکھے کے پروں پر جم گئیں۔ یوں لگنے لگا جیسے پنکھا چل پڑا ہو۔ بڑبڑائی۔ ”ہائے اللہ! یہ سب کچھ کیسے ہوگیا ہے؟ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میری عمر بھر کی سنبھال کر رکھی ہوئی پونجی یوں لٹ کر اشتہار بن گئی اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ اَب جبکہ مجھے بم پھٹنے اور ہوش میں آنے کے دوران ہونے والے علاج کا پتہ چل چکا ہے تو زمین پھٹی کیوں نہیں؟ قیامت کیوں نہیں آئی؟...... ہائے! میرے باپ کو پتہ چلے گا تو اُس پر کیا بیتے گی؟ وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق ہی نہیں رہے گا۔“

یہ نہیں جانتی تھی کہ منہ دکھانے کے لائق تو وہ پہلے ہی نہیں تھا۔ شیر کی طرح خونخوار آنکھیں گاڑ کر انسانوں کی رائے کو زمین میں گاڑ دیا کرتا تھا۔ سوچنے لگی۔ ”شیر جیسی آنکھ رکھنے والے کی آنکھوں سے یوں دیدہ دلیری سے سرمہ چرانے والا اور فلم بنا کر ثبوت دینے والا کون ہے؟ مجھ پر یہ ظلم کا پہاڑ کیوں توڑا گیا ہے؟“

ہر بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتی۔ اُسے جو سمجھایا گیا تھا، اتنا ہی اُسے ازبر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بیڈ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ دھڑکتے دل سے پھر سی ڈی پلیئر کو آن کر دیا۔ اَب وہ کوئی کلیو ڈھونڈ رہی تھی۔ بار بار منظر بدل کر جائزہ لے رہی تھی۔ آشنائی کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ سب کچھ اجنبی تھا۔ سوچنے لگی۔ ”کاش! اِس فلم میں میں ہیروئن نہ ہوتی۔“

ایسی خواہشیں بھاڑ میں جانے کیلئے ہوتی ہیں۔ جو ہو چکا تھا، وہ دعا سے بدلنے والا نہیں تھا۔ ڈسک نکال کر توڑنے لگی تھی کہ سوچ میں پڑ گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اُس نے ڈسک کو سنبھال کر رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اُسے اپنی الماری کے خفیہ خانے میں رکھ دیا۔ الماری بند کر کے بیڈ پر گر گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں تھا کہ وہ کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رحمت بی نے کھانا لگانے کی اطلاع دی۔ اُس نے کہا۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم لوگ کھالو۔ میرے لئے چائے بنا کر لے آؤ۔“

ایسی پریشانی میں کیا کھایا پیا جا سکتا ہے؟...... وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے کوئی قصور نہیں کیا تھا۔ کوئی غلطی نہیں کی تھی مگر اُسے بہت بڑی سزا دی جا چکی تھی۔ جس نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا اور اس کام پر اتنا خرچ کیا تھا، بلاوجہ نہیں کیا تھا۔ سوچنے لگی کہ اُس سے کیا طلب کیا جائے گا؟ کیا اُسے ہر روز ایسے ہی مسہری پر سجانے کیلئے یہ منصوبہ بنایا گیا تھا؟ دل نے کہا۔ ”ایک پرشباب اور جان کش لڑکی سے اور کیا طلب کیا جا سکتا ہے؟ تمہیں ہر روز اِسی صلیب پر لٹکنا پڑے گا۔ تم نے اپنے لئے جیتے جاگتے جہنم خرید لیا ہے۔“

وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ دماغ بہت تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ سوچا۔ ”مجھے پاپا کو بتا دینا چاہیے۔ اُن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ اتنی بڑی گستاخی کرنے والے کو پاتال سے بھی کھینچ لانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ وہ اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

ٹھٹک گئی۔ لمبے ہاتھ پاتال تک پہنچنے سے پہلے اُس کی گردن ناپیں گے۔ اُس سے پوچھا جائے گا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی مجرم قرار دی جاتی کیونکہ فلم دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ گن پوائنٹ پر نہ تو لائی گئی تھی اور نہ ہی جبراً سب کچھ کیا گیا تھا۔ پاپا اُس سے بہت پیار کرتے تھے۔ یہ بھی جانتی تھی کہ جتنا پیار کیا جاتا ہے، نفرت بھی اتنی زیادہ ہوتی ہے۔ سر جھٹک کر فون اٹھا کر پاپا کا نمبر میموری سے نکالنے لگی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ جو بھی ہو، مجھے پاپا کو مطلع کرنا چاہیے۔ ہر روز بے غیرتی اور بے حیائی کی سیج پر سجنے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ پھانسی کے پھندے پر جھول جائے۔ کال کرنا ہی چاہتی تھی کہ اُس کا فون گنگنا اُٹھا۔ سکرین پر ڈسک بھیجنے والے کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ کال ریسیو کرتے ہوئے بولی۔ ”میں بول رہی ہوں۔ کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟“

سپیکر سے وہی گھٹی گھٹی آواز برآمد ہوئی۔ ”تم نے فلم دیکھ لی ہوگی اور اب ہمیں دل ہی دل میں داد دے رہی ہوگی کہ ہم نے کتنے اچھے منظر کو ہمیشہ کیلئے محفوظ کر لیا ہے۔“

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ”یہ حرکت تم لوگوں کو بہت مہنگی پڑے گی۔ بہرحال! بتاؤ۔ کیا کہنے کیلئے فون کیا ہے تم نے؟“

وہ بولا۔ ”صرف یہی کہنے کیلئے کہ ہم نہیں چاہتے کہ یہ فلم ری پکچرائز کی جائے اور نہ ہی

"ہم تمہیں بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "تو پھر کیا کرنے کیلئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے؟"

"صرف اور صرف تمہارا غرور توڑنے کیلئے۔" اُس نے عام سے لہجے میں کہا۔ "فلم اِس لئے بنائی ہے تاکہ تم کسی سے اِس کا تذکرہ نہ کرسکو۔ ڈسک اور اِس ڈرامے کو پوری طرح فراموش کردو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ گڈبائی!"

وہ ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی۔ کال بیک کرنے کا نتیجہ حسبِ سابق برآمد ہوا۔ فون بند کردیا گیا تھا یا سیلولر سِم نکال دی گئی تھی۔ وہ سر تھام کر رہ گئی۔ اُس کی دسترس میں سوائے دُکھی ہونے کے کچھ بھی نہ رہا تھا۔ پاپا کو فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے سوچنے لگی۔ "ایسا ممکن تو نہیں ہے کہ مجھے اغوا کرنے والوں کا کوئی اور مقصد نہ ہو، مگر مجھے ابھی بلی کے تھیلے سے باہر نکلنے کا انتظار کرنا چاہیے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عالمگیر رات کو فلموں کی ایڈیٹنگ کروا کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ طویل سفر اور لاہور میں درپیش آنے والی بے تحاشا مصروفیت نے اُسے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اُس نے بشیر خان کو تاکید کردی تھی کہ اُسے ہرگز جگایا نہ جائے۔ گیارہ بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ تیار ہونے میں کچھ وقت لگا۔ کھانا کھا کر سردار کی حویلی میں پہنچ گیا۔ سردار اُسے دیکھ کر اپنے فطری جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ "سنا بھئی عالمگیر! لاہور سے خوشخبری لایا ہے۔ لاؤ اپنا بنایا ہوا شاہکار دکھاؤ۔ تمہارے کھلے ہوئے گل کو دیکھیں۔"

اُس نے صوفے میں ٹانگیں پسار کر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "کام مکمل کرا کر لایا ہوں مگر میں اِسے دیکھنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔"

سردار کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ تپ کر بولا۔ "تم کون ہوتے ہو مجھے اجازت دینے یا نہ دینے والے۔ ادھر لاؤ۔ میں ابھی دیکھ کر تمہیں واپس کردیتا ہوں۔"

اُس نے ڈسک والا ہاتھ پیچھے کرلیا۔ سختی سے بولا۔ "سردار! میں نے کہہ دیا ہے۔ تم خواہ غصہ دکھاؤ یا تڑیاں لگاؤ۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پہلی بار تمہارے حکم پر ناپسندیدہ کام کیا ہے۔ اَب نہیں کروں گا۔"

سردار چند لمحے اُسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ "ایک تو تمہارے قاعدے قانون بھی عجیب ہیں۔ جو چیز تم نے بنائی ہے، متعدد بار دیکھی ہے، مجھے دکھاتے ہوئے تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔ چلو یونہی سہی۔ ہمیں آم کھانے سے غرض ہے۔ وہ تم لے ہی آئے ہو۔"

وہ بولا۔ "کیا خیال ہے سردار؟ چوہدری باسط اِسے دیکھ کر سپر ڈال دے گا؟"

"واہ عالمگیر واہ!" سردار فضل نے استہزائیہ انداز میں ہاتھ نچا کر کہا۔ "یہ کوئی معمو
بات ہے جو وہ سر اکڑائے کھڑا رہے گا۔ اُس کے خاندان کی عزت پر بٹہ لگ جائے گا۔
اُس نے ہماری پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کی۔"

عالمگیر نے کہا۔ "یہ دھیان میں رکھنا کہ اگر اُس نے فلم دیکھنے کے باوجود ہمارا مطا
نہیں مانا تو میں اِسے نشر نہیں کرنے دوں گا۔ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ جو فصل پک
جائے، وہی کاٹنی پڑتی ہے۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو ناں؟"

سردار سمجھ سکتا تھا اگر سمجھنے کی کوشش کرتا۔ وہ مکاری سے بولا۔ "بھئی ہم نے ڈراوا ہی
ہے، بلیک میل کر کے اُس کی گردن کا سریہ نکالنا ہے۔ اُس کی بیٹی کو بدنام کرنے سے ہمیں
کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

چائے پی کر عالمگیر نے اپنا فون سیٹ نکالا۔ سامنے والی جیب سے کاغذ میں لپٹی ایک
سیلولر سم نکالی۔ اُسے فٹ کر کے چوہدری باسط کا نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہونے پر ہونٹوں کو بگاڑ
کر عجیب سے لہجے میں بولنے لگا۔ "چوہدری باسط! میں تمہارا خیر خواہ بول رہا ہوں۔ کل تمہیں
کوریئر کے ذریعے تمہیں ایک لفافہ ملے گا۔ اُس میں ایک وڈیو ڈسک ہوگی۔ اُسے بڑا
توجہ سے دیکھ کر توڑ دینا۔"

دوسری طرف سے کچھ کہا جانے لگا۔ سردار پوری توجہ سے عالمگیر کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے
لفظوں کے ساتھ ساتھ ہی اُس کے چہرے کے تاثرات معنی خیز انداز میں بدل رہے تھے۔
وہ بولا۔ "چوہدری! یہ بتلانا کوئی ضروری نہیں ہے۔ جو کہہ رہا ہوں، اُسے توجہ سے سنو۔ تم کل
تین بجے تک ڈسک تنہائی میں بیٹھ کر دیکھ لینا۔ میں چار بجے اِسی نمبر پر رابطہ کروں گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔ کھول کر سم باہر نکال لی اور کاغذ کی چٹ میں لپیٹ کر
جیب میں ڈال لی۔ مسکرا کر سردار سے مخاطب ہوا۔ "لو سردار! سمجھو تمہارا کام تو ہو ہی گیا۔
اِس کام پر پچاس ساٹھ ہزار روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ یہ رقم میں نے بشیر خان سے لی تھی۔
اُس نے کل گھر جانا ہے اِس لئے مہربانی کر کے مجھے دے دو۔"

سردار جانتا تھا کہ وہ بے ایمانی کر رہا ہے۔ اُسے بے ایمان کہہ کر جھٹلا نہیں سکتا
تھا۔ لاکھوں کا منافع حاصل کرنے کیلئے لاکھوں ہی انویسٹ کرنا پڑتے ہیں۔ گھر کے اندر
گیا۔ غریب ووٹر کو چند نوالے نہ دے سکنے والا چند منٹوں کے بعد بڑے نوٹوں کی ایک گڈی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اٹھائے کمرے میں داخل ہوا اور اُس کے سامنے میز پر پھینک کر بولا۔ "اتنے پیسے شیر و اُستاد
نے بڑی سرکار سے اینٹھ لئے ہوں گے۔ پر تم لوگوں کا پیٹ بھرے گا تو ہمارا کام ہوگا۔
پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔ باقی خود رکھ لینا۔"

اُس نے پیسے اٹھا کر کوٹ کی جیب میں اُڑس لئے۔ ہاتھ ملا کر باہر نکل آیا۔ اُس کے
چہرے پر عجیب معنی خیز سی مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ سوزوکی کے انجن کو اسٹارٹ کرتے ہوئے
بڑبڑایا۔ "بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں سردار فضل خان! پنڈ میں ایک کی چادر سَر سے
سرک جائے تو سب کے سر ننگے ہو جاتے ہیں۔"

ٹھکانے پر پہنچ کر اُس نے ڈسک کو لفافے میں پیک کیا۔ ایک کارندے کو دے کر شہر
روانہ کر دیا۔ شہر سے ہی لفافہ کوریئر سروس کے ذریعے چوہدری باسط کے گھر پہنچنا تھا۔ چائے
پی رہا تھا جب سردار نے فون پر حکم دیا کہ وہ فوری طور پر بڑی سرکار سے فون پر رابطہ کرے۔
اُس نے بڑی سرکار کا نمبر ملایا اور بولا۔ "جی بڑی سرکار! کیا حکم ہے؟"
انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "حکم میرے آقا! چراغ کا جن حاضر ہے۔"
بڑی سرکار کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "لاہور کے حالات کیسے ہیں؟"
وہ بولا۔ "سب کچھ ٹھیک ہے۔ اپوزیشن والے دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلے
کی طرح ہمارے بڑے کسی کو گھاس نہیں ڈال رہے۔"

سردار مظفر علی خان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "گھاس ڈالنے سے گھوڑے کا پیٹ بھر
جاتا ہے اور اُس کی سرکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بھوکا رکھ کر ہی اُسے سر جھکانے پر مجبور کیا
جا سکتا ہے۔ اچھا چھوڑو اِس فضول تذکرے کو، سناؤ! تمہارے مشن کا کیا بنا؟"

اُس نے تفصیلی رپورٹ دی۔ بڑی سرکار نے مطمئن ہو کر رابطے میں رہنے کا حکم صادر
کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ بشیر خان اُس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا، بولا۔ "عالمگیر!
ہر کام ٹھیک ٹھاک انداز سے ہو چکا ہے۔ واردات کو کئی دن گزر چکے ہیں۔ ابھی تک لڑکیوں
نے اپنے لب نہیں کھولے۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "عزت دار لڑکیوں کو لب کھولنے پر مجبور کر بھی دیا جائے تو بھی وہ اپنی
بے حیائی کو ہونٹوں پر نہیں لاتیں، رسی کے پھندے میں جھول جاتی ہیں۔"
بشیر خان نے تائید کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شبر علی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ چوہدری زیادہ سے زیادہ انتخابات میں حصہ لینے پر رضامند ہوگا۔ وہ کبھی بھی بڑی سرکار کی پارٹی جائن نہیں کرے گا۔ دیکھ لینا!''

بشیر خان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''دیکھ لیں گے بھئی! کرّ وفر والا بندہ ہے۔ پگڑی پر داغ دیکھ کر فوراً سیاست کی پگڑی بدل لے گا۔''

شبر علی نے ترکی بہ ترکی کہا۔ 'یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پگڑی کو چولھے میں پھینک کر تمام عمر ننگے سر پھرنے کا تہیہ کر لے۔'

اچانک جیسے سردی کی ایک لہر عالمگیر کے تن بدن میں پھر گئی۔ اُس کے دل میں خیال آیا تھا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پگڑی پر لگا داغ دیکھ کر چوہدری اپنا سر ہی کچل دے...... نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!'' منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ایسی باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں، سمجھنے کی ہوتی ہیں۔ یہاں کوئی سمجھنے والا نہیں تھا۔

اگلے دن چار بجے تک انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ حسبِ عادت دریا کی طرف نکل گیا۔ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر دریا میں ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کرنے لگا۔ چند ہی منٹوں میں دریا کی سطح سے منعکس ہونے والی سرخی مائل کرنوں نے اُس کی آنکھوں کو تھکا دیا۔ وہ رخساروں تک ڈھلک آنے والے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''جب تک علم دین تھا، سکون میں تھا۔ جب سے عالمگیر بنا ہوں، پیروں کے آبلوں نے کہیں ٹک کر بیٹھنے نہیں دیا۔ ماں ٹھیک کہتی تھی۔ سیدھے راستے پر چلنے والے ہمیشہ سکھی رہتے ہیں۔ انگلیاں ٹیڑھی کر کے گھی نکالنے والوں کے راستے بھی ٹیڑھے اور پر پیچ ہو جایا کرتے ہیں۔''

ماں شاید یاد کیے جانے کے انتظار میں ہی کھڑی تھی۔ فوراً نظروں کے سامنے آ گئی۔ آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ غمزدہ دکھائی دیتی تھی۔ ملامت کرنے کے سے انداز میں بولی۔ ''تمہیں خدا نے بہن نہیں دی۔ تمہارے ہاتھوں کی لمبائی میں اتنا اضافہ کرنے سے پہلے ہی تم سے تمہاری ماں بھی چھین لی اور تمہیں دنیا کے تمام رشتوں سے آزاد کر دیا۔ شیطان کا بھی دنیا میں کوئی سگا نہیں ہے۔ اگر کوئی ہوتا تو کہیں نہ کہیں اُسے سر جھکانا پڑ جاتا۔ تم بھی انسان سے شیطان بن گئے ہو۔ تمہاری رسّی بھی دراز کر دی گئی ہے۔''

سوچنے لگا کہ یہ آج ماں کو کیا ہو گیا ہے؟ اُسے شیطان قرار دیتے ہوئے اُسے یہ خیال بھی نہیں رہا تھا کہ اُسے شیطان کہہ کر خود کو شیطان کی ماں قرار دینے لگی تھی۔ وہ بڑبڑایا۔ ''تم

نے بھیڑ کو نہیں، شیر کو جنم دیا تھا۔ شیر گھاس نہیں کھاتا۔ تمہیں مجھ پر فخر ہونا چاہیے کہ میں شیر بن کر بھی ہرنوں اور بھیڑ بکریوں کا بدن نہیں پھاڑتا۔ درندوں کی کھوہ میں گھس کر اُنہی کے اسلحے سے اُنہی کا ماس کھاتا ہوں۔ ڈاکو کو لوٹنا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔''

''ارے واہ!'' ماں نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر کہا۔ ''بت حرام نہیں ہوتا، بت کی پرستش حرام ہوتی ہے۔ تم سے یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ برے کو قتل کرنے پر کوئی قدغن عائد نہیں ہوتی، قتل کرنا جرم ہے۔ تم نے ایک نہیں، دو بے قصور اور معصوم لڑکیوں کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ کیا اُن کا جرم یہی تھا کہ وہ بڑے لوگوں کی بیٹیاں تھیں؟ خدا بھی برے کے گناہوں کی سزا اُس کی اولاد کو نہیں دیتا۔ تم کون ہوتے ہو ایسا کرنے والے؟''

وہ بے بسی سے بولا۔ ''ماں! ایسا کرنے پر میرا ضمیر مطمئن نہیں تھا۔ اِس غلاظت کو منہ لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر تم فکر نہ کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اُن کی زندگی تباہ نہیں ہونے دوں گا۔''

وہ پیٹھ موڑ کر ہٹنے لگی۔ جاتے ہوئے بولی۔ ''تم کہتے ہو کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کہتی ہوں کہ ابھی تو شروعات ہیں۔ تو نہیں جانتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اگر انسان کو مستقبل کی آگہی مل جائے تو وہ بدل جائے۔ اُس کی دنیا ہی بدل جائے۔ ہر بار کی طرح تمہیں نصیحت کرتی ہوں کہ بڑھتے ہوئے قدموں کو پیچھے کھینچ لو۔ ورنہ قیامت تک پچھتاتے رہو گے۔''

وہ آنکھیں جمائے، نظر کی آخری حد تک دور جاتے وجود کو دیکھتا رہا۔ ہر بار کی طرح ماں ڈراؤنی باتیں کر کے رخصت ہو گئی تھی۔ سر جھٹک کر سوچنے لگا۔ ''ماں ٹھیک کہتی ہے...... مگر میں بھی غلط نہیں کر رہا ہوں۔ وہ اَن پڑھ اور گوشہ نشین عورت تھی، میں جوان جہان مرد ہوں۔ برا بھلا جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ کیا کر رہا ہوں اور مجھے اپنے مقاصد کے حصول کیلئے کیا کرنا چاہیے۔''

دریا میں مچھیروں کی ایک کشتی الٹے رخ پر جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ چار سیاہ بدن جناتی چپوؤں پر جان مار رہے تھے۔ اُن کے بدن کے بالائی نصف حصے ننگے تھے جو سورج کی کمزور کرنوں میں چمک کر عجیب دکھائی دے رہے تھے۔ جب کشتی عین اُس مقام پر پہنچی جہاں پر عالمگیر کی نگاہیں دریا کے مرتعش پانی میں ڈوبتے ہوئے سورج پر جمی ہوئی تھیں تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یکبارگی اُسے یوں لگا جیسے کشتی میں آگ بھڑک اُٹھی ہو۔ وہ بغیر کوئی وقت ضائع کئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ نگاہوں کا زاویہ بدلا تو اپنی احمقانہ سوچ پر بے ساختہ مسکرا دیا۔ کشتی صحیح سلامت آگے بڑھ گئی تھی جبکہ سورج دریا اور اُفق دونوں میں ڈوب کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

وہ کاہلی سے اُٹھا اور حویلی میں آ گیا۔ ایک قطار میں بنے ہوئے کمروں کے آگے بنے ہوئے سالخوردہ برآمدے میں چلتا ہوا آخری کمرے کے دروازے تک آیا۔ بشیر خان کو آواز دی۔ قریب آنے پر اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بشیر خان! میں اس کمرے میں مصروف ہوں۔ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔''

بشیر خان نے سر ہلایا۔ پوچھا۔ ''کیا تمہیں چائے کی ضرورت پڑے گی؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''یار! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔''

وہ چلا گیا۔ عالمگیر کمرے میں داخل ہوا۔ کھڑکی کھول کر اندھیرے کو بھگایا اور ایک دیوار کے ساتھ لگی چارپائی پر براجمان ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ چند لمحے خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھا فرش کو گھورتا رہا۔ سر جھٹک کر کسی فیصلے پر پہنچا۔ اُسے یاد آ گیا تھا کہ اُس نے ایک خاص فون کرنے کیلئے تنہائی چاہی تھی۔

فون سیٹ کی سم بدلی۔ نمبر ملا کر فون کان سے لگا لیا۔ لہروں کے دوش پر سفر کرتی ہوئی شانی بی بی کی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''ہیلو! تم مجھ سے بات کرنے کے بعد فون بند کر دیتے ہو۔ یعنی جب سنانا چاہتے ہو، سنا لیتے ہو اور جب میں سنانا چاہتی ہوں تو کان بند کر لیتے ہو۔ کیوں؟''

وہ بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔ ''تمہارے پاس بتلانے کیلئے کچھ نہیں ہوتا۔ میں تمہیں آنے والے حالات سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''تم میرے مخلص ہرگز نہیں ہو۔ پھر بھی تمہاری بات سن لیتی ہوں۔ کہو!''

اُس نے کہا۔ ''بار بار فلم کا تذکرہ کر کے تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم اپنے دشمن تک پہنچ سکو۔ تمہیں علم ہونا چاہیے کہ کون تمہارا مفاد چاہتا ہے، کون تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑنا چاہتا۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ اُس کی جوانی سے چند گھنٹے چرانے والا مطالبہ اُس کے سامنے رکھنے والا ہے۔ اتنا تو اُسے علم تھا ہی کہ اُسے اغوا کر کے لے جا

والے نے کسی بہت بڑے مقصد کیلئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ توقف کے بعد بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ اس حد تک پست ذہنیت رکھنے والے مجرم پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔ تم بھی ایسے ہی ہو۔ یہ نہیں جانتی کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ یہ سوچ سوچ کر تمام رات جاگتی رہتی ہوں۔ تم مجھے اِس پریشانی سے نکال کیوں نہیں دیتے؟''

وہ زیرِ لب مسکرانے لگا۔ سوچنے لگا کہ مچھلی کے حلق میں کانٹا چبھ گیا ہے۔ بولا۔ ''میرا تم سے کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ میرے بڑے تم سے کچھ چاہتے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں؟ یہ مجھے علم نہیں ہے۔ جب وہ منہ کھولیں گے، میں تمہیں مطلع کر دوں گا۔''

وہ زِچ ہو کر بولی۔ ''تمہارے بڑے جب منہ کھولیں گے، تب کھولیں گے۔ میں ابھی کھولے دیتی ہوں۔ وہ حرامزادے ہیں۔ انہیں بتلا دینا کہ میں معمولی باپ کی بیٹی نہیں ہوں۔ ان کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گی اور سڑکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر ان کے کئے کی سزا دوں گی۔''

وہ بے ہنگم انداز میں ہنسنے لگا۔ کانٹا حلق میں چبھ جائے تو مچھلی اُسے اگلنے کیلئے تڑپنے لگتی ہے۔ اپنا پورا زور صرف کرتی ہے۔ وہ بھی پھڑپھڑا رہی تھی۔ تلملا کر کہہ رہی تھی۔ ''تم اتنی بدتمیزی سے ہنس کر میرا مذاق اُڑا رہے ہو۔ یہ حرکت تمہیں اور تمہارے مالکوں کو بہت مہنگی پڑے گی۔''

وہ بولا۔ ''مس شاہانہ فضل! میں نے سونا، ہیرا اور دنیا بھر کی تمام چمکتی ہوئی چیزوں کو دیکھا ہے۔ تمہیں دیکھنے کے بعد پتہ چلا کہ آنکھیں صرف جیتے جاگتے چمکتے وجود کو دیکھ کر ہی خیرہ ہوتی ہیں۔ اِس نظارے کی کتنی قیمت چکانا پڑتی ہے، مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ تم اپنی پرواہ کرو۔''

اُس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ عالمگیر کے طعنے سنے۔ مجبوراً سن رہی تھی۔ اُکتا کر بولی۔ ''کوئی کارآمد بات کرنا چاہتے ہو تو کرو ورنہ میں فون بند کر رہی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''او کے! میں تمہیں بتلانا چاہتا تھا کہ میری چنگیر میں روٹی ڈالنے والے کا قد تمہارے باپ سے کہیں بڑا ہے۔ اس زعم میں مبتلا ہو کر کوئی احمقانہ حرکت نہ کر ڈالنا۔ تمہارا ایم پی اے باپ میرے بڑوں کو سر جھکا کر سلام کرتا ہے۔''

وہ کریدنے لگی۔ پوچھنے لگی کہ عالمگیر کے پیچھے کس بڑے کا ہاتھ ہے۔ اُس کے تجسس کو

ہوا دینے کے بعد بولا۔ ''میرا ملک بہت بڑا آدمی ہے۔ بااختیار سیاسی اکابر اُس کے
ڈیرے پر اجازتیں لینے کیلئے حاضری دیتے رہتے ہیں۔ وہ بے عہدہ ہو کر عہدے باز
ہے۔ میرا دوسرا بڑا بہت بڑے عہدے پر براجمان ہے۔ اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر ہر اُس
کرسی تک پہنچ جاتا ہے، جس پر بیٹھنا چاہتا ہے۔''

وہ اکتا کر بولی۔ ''تعریفیں ہی کرتے جاؤ گے یا کسی کا نام بھی لو گے؟''

وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ بولا۔ ''بڑی بھولی بنتی ہو۔ جو پوچھنا چاہتی ہو، میں وہ بتانا
نہیں چاہتا۔''

''تو پھر فون کس لئے کیا ہے؟''

''یہ پوچھنے کیلئے کہ کیا تم نے کسی کو اپنے راز میں شریک کیا ہے؟''

''نہیں......مگر ضرورت پڑنے پر ایسا ہی کروں گی۔''

''میرا مشورہ یہی ہے کہ جب تک کبوتر تمہارے ہاتھ میں رہے گا، تب تک خط بند
رہے گا۔'' وہ بولا۔ ''اُڑا بیٹھو گی تو عمر بھر پچھتاووں کو گلے لگاتی پھرو گی۔ اور ہاں! تمہارے
باپ نے بھی ایک کتا پال رکھا ہے۔ بھلا سا نام ہے اُس کا۔''

سوچنے کی اداکاری کرنے لگا۔ وہ بے تاب ہو کر بولی۔ ''ہاں! تم کسی کتے کا ذکر
کر رہے تھے۔''

وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ ''یاد آیا......عالمگیر......جانتی ہو اُسے؟''

''ہاں!'' وہ چونک کر نفریں لہجے میں بولی۔ ''وہ تمہاری طرح کا ہی کتا ہے۔ شکاری
پر کاٹنے کو دوڑ پڑتا ہے۔ پچکارنے پر دُم ہلا کر وفاداری کا یقین دلانے لگتا ہے۔''

وہ اپنا غصہ دباتے ہوئے بولا۔ ''اُس اُلو کے پٹھے کو ہوا بھی نہ لگنے دینا ورنہ نتائج کی تم
ذمہ دار ہو گی۔''

وہ ڈرنے کی بجائے ہنسنے لگ گئی۔ طعنہ دینے کے انداز میں بولی۔ ''کیوں؟ اُس سے
ڈرتے ہو؟''

وہ پچھاڑ کھانے کے سے انداز میں بات اُچکتے ہوئے بولا۔ ''بے وقوف لڑکی! ابھی
تمہیں پہلے بھی کہا ہے کہ تمہارا باپ اور اُس کے چیلے ابھی تک قد میں ہمارے ٹخنوں
اونچے نہیں ہوئے۔ جو کہا ہے، اُس پر توجہ دو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ فون بند کر کے زیرِ لب معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ سم
بدل کر سردار فضل سے بات کرنے لگا۔ ''سردار! مجھے لاہور میں اپنے ایک پرانے سنگتی نے
اطلاع دی ہے کہ شانی بی بی یونیورسٹی میں پڑھنے والے کسی رئیس نامی لڑکے میں انٹرسٹ
لے رہی ہے۔''

''تو پھر؟'' سردار نے چونک کر پوچھا۔

''میں نے اپنے دوست کے ذمہ لگایا ہے کہ وہ رئیس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں
مکمل تفصیلات حاصل کر کے مجھے رپورٹ دے۔'' عالمگیر نے آواز نرم رکھ کر کہا۔ ''ممکن
ہے کہ وہ فراڈیا ہو اور تمہاری جائیداد ہڑپ کرنے کے چکر میں شانی بی بی کے پیچھے پڑا ہو۔''

فون خاموش رہا۔ سردار کی دکھتی رگ پر ہاتھ پڑا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''تم
نے ٹھیک کیا۔ جونہی رپورٹ ملے، مجھ تک پہنچا دینا۔ ایک بات کا دھیان رکھنا کہ شانی بی بی
کو پتہ نہ چلے ورنہ وہ ناراض ہو جائے گی۔''

اُس نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر
آئی۔ ایسی چمک چیتے کی آنکھوں میں شکار کے قریب آنے پر ابھرتی ہے۔ بشیر خان چائے
دینے کیلئے کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے یوں بیٹھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بولا۔ ''کہیں دل تو
نہیں لگا بیٹھے؟''

وہ نفی میں سر ہلا کر لمبی آہ سینے میں اتارتے ہوئے بولا۔ ''او نہیں یار! اپنی قسمت میں کسی
حسینہ کی دراز سیاہ زلف نہیں ہے، گناہ کی نہ ختم ہونے والی اندھیری رات ہے۔''

بشیر خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چائے کی پیالی کو چارپائی کے بڑے سر والے پائے
پر رکھ کر الٹے قدموں کمرے سے نکل گیا۔ اُس کے جانے کے بعد عالمگیر پھر کسی اتھاہ سوچ
میں غرق ہو گیا۔

طالب علم کو امتحان میں اپنا لکھا ہوا یاد ہوتا ہے۔ نتیجے کا پتہ ہوتا ہے پھر بھی نتیجہ برآمد
ہونے کے دنوں میں انتظار اور کشمکش مل کر اُس کے ذہن و بدن میں اضطراب بھر دیتے
ہیں۔ اُس نے یہ مضطرب دن بڑی مشکل سے گزارا۔ دو بجے کے قریب اُس کی بے چینی
میں شدید اضافہ ہو گیا۔ چوہدری باسط اِس وقت فلم دیکھ رہا ہو گا۔ عالمگیر دل ہی دل میں اُس
کے متوقع ردِعمل کو تخیلاتی پیکر دینے میں مصروف تھا۔ اُس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ چار بجے

کے قریب اُسے فون کرے گا اور اُس کی کیفیت کا جائزہ لے گا۔ تین بجے کا وقت ہی ہوا تھا کہ اُس کے موبائل فون کا بزر بول اُٹھا۔ سردار فضل اُس سے رابطہ کر رہا تھا۔ اُس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔ ''ہیلو! عالمگیر بول رہا ہوں۔''

سردار کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''غضب ہو گیا ہے عالمگیر! چوہدری باسط کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ ملک فرید اور چوہدری کے بھتیجے اُسے اُٹھا کر شہر کے سول ہسپتال میں لے گئے ہیں۔''

عالمگیر کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ نتیجہ برآمد ہو گیا تھا مگر اُس کی توقع کے عین برعکس۔ وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔ ''یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔ اگر وہ مر گیا تو سارا کھیل چوپٹ ہو جائے گا۔ اُسے مرنا نہیں چاہیے۔''

''ہر کوئی دشمن کے مرنے کی دعائیں مانگتا ہے۔ یہ کیسی بے بسی ہے کہ ہم اپنے دشمن کی زندگی کی بھیک سوہنے رب سے مانگنے پر مجبور ہیں۔'' سردار کی آواز سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بہت زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بڑی سرکار سے ہسپتال کے ایم ایس کو کہلوا دیا ہے کہ وہ چوہدری باسط کے علاج اور نگہداشت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑے۔''

''اچھا کیا۔ ایک اچھائی اور بھی کر دو۔ ہسپتال جا کر اُس کی عیادت کر آؤ اور صورت حال بھی دیکھ آؤ۔''

سردار نے حامی بھر کر فون بند کر دیا۔ عالمگیر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ چوہدری باسط کی بیٹی نے کہا تھا کہ اُس کا اَبا دل کا مریض ہے۔ بیٹی کے اجڑنے کی خبر سن کر زندہ نہیں رہے گا۔ تب اُس نے یقین نہیں کیا تھا۔ اَب یقین ہو گیا تھا مگر سردار کی بساط اُلٹ گئی تھی۔ وہ بھی دل ہی دل میں اُس کے زندہ رہنے کی دعائیں مانگنے لگا۔ اچانک دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی۔ سوچنے لگا۔ ''چوہدری فلم دیکھ رہا تھا جب اُسے دل کا دورہ پڑا۔ اُسے پلیئر اور ٹی وی بند کرنے کی مہلت نہیں ملی ہو گی۔ کمرے میں داخل ہونے والوں کو دل پر اُترنے والی قیامت کا بھی پتہ چل گیا ہو گا۔''

اُسے چوہدری سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اور نہ اپنی گردن کے شکنجے میں آنے کا کوئی ڈر تھا۔ اُس نے کاروائی اتنی صفائی سے کی تھی کہ اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ پھر بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دل گھبرانے لگا تھا۔ اپنی محنت کے ضائع جانے پر افسوس ہو رہا تھا۔ بڑبڑایا۔ ''قیمت راز کی ملتی ہے۔ راز، راز نہیں رہا، قیمت دینے والا بھی شاید نہیں رہے گا۔''

دل میں یہ چبھن بھی تکلیف دے رہی تھی کہ اُس خاندان پر پڑنے والی اِس افتاد میں اُسی کا ہاتھ تھا۔ وہ اگر گل نہ کھلاتا تو یہ چراغ گل نہ ہوتا۔ ہاتھ ملتے ہوئے مشترکہ کمرے میں آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ سر کے نیچے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اگر چوہدری باسط جانبر نہ ہو سکا تو پھر اُسے کیا کرنا ہو گا؟

کھانا کھا کر ہاتھ دھو رہا تھا کہ سردار نے فون پر رابطہ کیا۔ بتایا۔ ''چوہدری کی حالت نازک ہے۔ ڈاکٹر کوئی امید نہیں دلا رہے ہیں۔ میں چند منٹ پہلے سی سی یو میں پڑے ہوئے چوہدری کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے یہ اندازہ بھی لگایا ہے کہ اُس کے خاندان کے کسی فرد کے ہاتھ فلم نہیں لگی۔''

وہ متعجب لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہو چکا ہے۔ اِس پر مزید سوچنا بے کار ہے۔'' سردار نے کہا۔ ''تم صبح خان والا بستی میں جاؤ گے۔ شام پانچ بجے مجھے وہاں کی ایک تقریب میں مدعو کیا گیا ہے۔ انتظامات چیک کرو گے اور مجھے گرین سگنل دو گے۔ ویسے میں نے انتظامیہ سے کہہ کر وہاں پولیس کی بھاری نفری تعینات کروا لی ہے۔''

وہ بولا۔ ''کس سلسلے میں تقریب کا انعقاد کیا جا رہا ہے؟''

''بستی میں گزشتہ تین دنوں سے کھیلوں کے مقابلے جاری ہیں۔'' سردار نے تفصیل سے آگاہ کیا۔ ''آج فائنل میچ ہے اور انعامات کی تقسیم کی تقریب منعقد کی جا رہی ہے۔ گاؤں کے تمام لوگ شامل ہوں گے۔''

اُس نے مطلوبہ تفصیلات حاصل کر کے فون بند کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو اُن کا کام سمجھانے لگا۔ اُسے اندازہ تھا کہ آنے والا دن خاصا مصروف گزرے گا۔ خیال آنے پر اُس نے منیرے قصائی سے فون پر رابطہ کیا۔ پتہ چلا کہ وہ چوہدری باسط کے ساتھ ہسپتال گیا تھا۔ ابھی تک وہیں تھا۔ بولا۔ ''یار عالمگیر! چوہدری کی زندگی خطرے میں ہے۔ ہسپتال میں پوری بستی ملک فرید سمیت چوہدری کی زندگی کیلئے دعائیں مانگ رہی ہے۔''

''ہارٹ اٹیک کسی پریشانی یا ناگاہ ذہنی جھٹکے پر ہوا کرتا ہے۔'' عالمگیر نے اُسے کریدنے

کی کوشش کی۔ ''میرا خیال ہے کہ چوہدری کو کسی قسم کی پریشانی لاحق نہیں تھی۔ تم اِس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''گھر والے بتلا رہے ہیں کہ دورہ پڑنے سے قبل وہ کافی دیر تک اپنے کمرے کا دروازہ بند کئے پڑا رہا۔ باہر نکلا تو چہرہ سرخ تھا۔ ہاتھ سینے پر رکھ کر درد سے دوہرا ہوتا گیا۔ اب اللہ کی اللہ ہی جانے۔ ویسے بھی آج کل دل کے دورے کی شکایت عام ہو گئی ہے۔''

وہ دل ہی دل میں اطمینان محسوس کرنے لگا تھا۔ بولا۔ ''میرے لائق اگر کوئی خدمت ہے تو بلا جھجک کہو۔ مجھے ذاتی طور پر چوہدری باسط سے ہمدردی ہے۔ اپنے علاقے میں ایک ہی تو غریب پرور بندہ ہے۔ وہ نہ رہا تو پوری بستی یتیم ہو جائے گی۔''

منیرے نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ بولا۔ ''یہاں تو سوائے ڈاکٹروں کے کسی کی ضرورت نہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ضرور مطلع کروں گا۔''

سیانے کہتے ہیں کہ قسمت کا وار لمحاتی ہوتا ہے۔ انسان پر ایک لمحہ ایسا وارد کر دیتی ہے جس پر اُس کی زندگی کا دارومدار سکڑ کر ننھے سے دائرے میں سمٹ آتا ہے۔ اُس لمحے میں کوئی حادثہ انسان کو جان سے گزار دیتا ہے، اُسی لمحے میں لاعلاج مریض کو شفایاب دوائی میسر آ سکتی ہے۔ ایسا ہی ایک لمحہ مستقبل کو یکسر بدل دیتا ہے۔ کوئی طالب علم اُس لمحے میں اختیاری مضمون کا چناؤ کرتا ہے، کوئی دُلہا بن کر اپنی شریکِ سفر کا انتخاب کرتا ہے، کسی سیاست دان کے ہونٹوں سے جملہ نکل کر اُسے تخت پر لا بیٹھاتا ہے اور کسی کو ایسا ہی انقلاب پرور لمحہ زمین کی اتھاہ پستیوں میں دفن کر دیتا ہے۔ چوہدری باسط پر وہ لمحہ مسلط کرنے والا عالمگیر تھا۔ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ غیور باپ کو بیٹی کی بربادی کا منظر دکھا کر اُس نے باپ کی زندگی کو موت کے تکلے پر لپیٹ دیا تھا۔

اُس نے دو تین مرتبہ چوہدری باسط کا نمبر ملانے کا ارادہ کیا۔ جرأت نہ پا کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ سوچ کر دل ڈر گیا کہ متوقع موت نے گھر کو قبل از وقت ہی بین زدہ کر رکھا ہوگا۔ ایسے میں رابطہ کرنا خود کو مزید شرمسار کرنے کے مترادف تھا۔

صبح اُٹھتے ہی اُسے ایک جانکاہ خبر کا سامنا کرنا پڑا۔ چوہدری باسط رات کے پچھلے پہر زندگی اور موت کی مسلسل جاری جنگ میں ہار گیا تھا۔ اُس کی میت گھر لائی جا چکی تھی جس پر روائتی انداز میں کہرام کا قیامت انگیز سایہ تھا۔ وہ جس وقت خان والا میں سردار فضل کیلئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسند صدارت کا جائزہ لے رہا تھا، عین اُسی وقت سردار فضل چہرے پر دور سے دکھائی دینے والے گہرے دکھ کے عکس سجائے چوہدری باسط کے خاندان کا دکھ بانٹنے میں برسرِ پیکار تھا۔

عالمگیر پانچ بجے اڑھائی تین سو بندوں کے مجمع میں پل پل رنگ بدلنے والے سیاسی گرگٹ کا برسوں سے دیکھا بھالا بہروپ ملاحظہ کر رہا تھا۔ اِس سے پہلے بھی یہ منظر بارہا دیکھ چکا تھا۔ اُسے ہر بدلتے پل کی پیشگی خبر تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ جونہی صدارتی خطبہ دینے کیلئے سردار فضل خان تالیوں کی گونج میں سٹیج پر نمودار ہوا، اُس کے کارندے کھڑے ہو کر استقبالی نعرے لگانے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ جب تقریر شروع ہوئی تو انہی کارندوں نے مخصوص باتوں پر تالیاں بجا کر داد کے ڈونگرے برسائے۔ تقریر اختتام کو پہنچی تو اِسی گاؤں میں رہنے والے سردار کے ٹاؤٹ منظور نے کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا۔

''سردار صاحب! آپ ووٹ لینے کیلئے ہر مرتبہ یہاں آ جاتے ہیں۔ ہم تمام بستی والے آپ کے انتخابی نشان پر مہر لگا کر انتظار کرنے لگتے ہیں کہ کب آپ آئیں اور ہمارے لئے لاہور سے ہوا کا نرم جھونکا لائیں۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا۔''

سردار فضل نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ ''مجھے تم لوگ یہاں بلاتے ہی کب ہو؟ پہلی مرتبہ تم لوگوں نے مجھے بلایا اور میں بغیر کسی ردّ و کد کے چلا آیا۔ جب تک تم لوگ مجھے اپنا کوئی مسئلہ بتلاؤ گے ہی نہیں، میں کیا مدد کر سکوں گا۔ کیوں بھئی خان والا کے لوگو! بتلاؤ۔ کیا ماں خاموش لیٹے ہوئے بچے کے منہ میں دودھ ٹپکاتی ہے؟''

سردار کے کارندوں نے بیک زبان کہا۔ ''نہیں!''

شور مچ گیا۔ ناظرین ہنسنے لگے۔ ٹاؤٹ پلٹ کر ہنسنے والوں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کراتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ ''چلو مان لیا سردار صاحب کہ ہم نے آج تک کچھ نہیں مانگا۔ آج مانگ کر دیکھ لیتے ہیں۔ ہماری بستی میں لڑکیوں کیلئے سکول نہیں ہے۔ بچیاں ہر روز چار پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے قریب کے گاؤں میں پڑھنے کیلئے جاتی ہیں۔ ہمیں زنانہ سکول چاہیے۔''

سردار فضل نے کچھ ساعتیں سوچنے کی اداکاری کی۔ اُس کی بہترین اداکاری کو دیکھ کر عالمگیر کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ جانتا تھا کہ پچھلے ہفتے محکمہ والوں نے سردار

فضل کو قبل از وقت آگاہی دے دی تھی کہ محکمے کے بڑوں نے خان والا میں زنانہ سکول کھولنے کی اجازت دے دی ہے۔ دو ہفتوں بعد تعمیر کا کام شروع ہونے والا تھا۔ سردار فضل نے کچھ دیر کے توقف کے بعد مائیک کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''مردہ بولتا ہے تو کفن پھاڑ دیتا ہے۔ تم لوگ بھی بولے ہو تو وہ مطالبہ کیا جو بڑوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ بہر حال! میں تم لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہر کام پس پشت ڈال کر ایک دو ہفتوں میں سکول کی منظوری لے آؤں گا۔ میں آج سے ہی اِس کام کو ہاتھ میں لینے کا ارادہ کرتا ہوں۔''

تالیاں بجنے لگیں۔ سردار سٹیج سے اتر آیا۔ نمبر دار، ٹاؤٹ اور چند معززین کو اپنی ہمراہی میں لے کر نمبر دار کے ڈیرے پر آیا۔ عالمگیر اُس کے ہمراہ تھا۔ ڈیرے پر پہنچ کر اپنے لئے سجائے گئے کھانے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے نمبر دار سے مخاطب ہوا۔ ''کیا تم لوگوں کو واقعی زنانہ سکول کی ضرورت ہے؟''

نمبر دار کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ اُس کی برسوں کی خالی جھولی میں مراد گرنے والی تھی۔ بولا۔ ''سردار صاحب! آپ جیسے بڑوں کے آگے سوال کیا جاتا ہے تاکہ جھولی بھر جائے۔ اگر جھولی خالی رہے تو دستِ سوال کو نادم کرنے کا کیا فائدہ؟''

سردار فضل نے کھانے سے ہاتھ روک کر عالمگیر کو دیکھا۔ ''عالمگیر! وزیر اعلیٰ صاحب کا نمبر ملاؤ۔ سکول حاصل کرنا ہمارا حق ہے اور اپنے حق کیلئے لڑنا مردوں کا کام ہے۔''

عالمگیر نے شبر علی کا نمبر ملایا اور مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''جناب پی اے صاحب! سردار فضل خان ممبر اسمبلی جناب وزیر اعلیٰ صاحب سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

دوسری طرف کی بات سن کر اُس نے وائڈ سپیکر آن کر دیا اور فون سردار فضل کی طرف بڑھا دیا۔ شبر علی کی گھمبیر آواز فون کے سپیکر سے برآمد ہوئی۔ ''جی سردار صاحب! آج کیسے بھول کر ہمیں یاد کر لیا۔ مزاج کیسے ہیں؟''

سردار نے اپنا لہجہ اپنے ہی کارندے کے مقابل میں مؤدبانہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جی صاحب! ایک نہائت ضروری اور ارجنٹ کام آن پڑا ہے جس کی وجہ سے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ میرے حلقے میں خان والا بستی کے ووٹرز زنانہ سکول مانگ رہے ہیں۔ بچیوں کی تعلیم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس کی وجہ سے لوگ بہت پریشان ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہماری حکومت سکولوں کی منظوری کا کوٹہ مکمل کر چکی ہے۔ اب اگلے سال جون جولائی میں منظوری مل سکتی ہے۔ اِس سے پہلے نہیں۔''

سردار لہجے میں خفگی سموتے ہوئے بولا۔ ''آپ یہ بات مجھے سمجھا سکتے ہیں، میں اپنے حلقہ داروں کو نہیں سمجھا سکتا۔ مجھے سکول چاہیے۔ ایک پرائمری سکول مانگ رہا ہوں، کالج یونیورسٹی کا مطالبہ نہیں کر رہا ہوں۔''

''ویری ساری سردار صاحب! ایسا ممکن نہیں ہے۔ آپ لاہور آئیں گے تو آپ کو بہترین لوکیشن پر پلاٹ دیا جائے گا۔ سکول والی کسر نکل جائے گی۔''

سردار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ بولا۔ ''اگر مجھے خان والا میں سکول نہیں دیا جاتا تو پھر مجھے پارٹی جائن کرنے کا کیا فائدہ ہوا؟ صاحب! مجھے اپنے لئے کروڑوں کا پلاٹ نہیں چاہیے۔ اپنے حلقہ داروں کی بچیوں کیلئے سکول چاہیے۔ اگر اتنا معمولی سا کام بھی نہیں ہوا تو پھر سمجھیں تعلق نہیں نبھا۔''

''سردار صاحب! آپ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ ہم نے کہا تو ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہوتا تو......''

سردار نے بات کاٹ دی۔ بولا۔ ''اگر دو ہفتے کے دوران یہاں سکول کی تعمیر کا کام شروع نہیں ہوا تو میرا استعفیٰ آپ تک پہنچ جائے گا۔ جو لوگ مجھے منتخب کر کے اسمبلی تک پہنچاتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا حق نہ دلا سکا تو مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔''

نمبر دار اور ٹاؤٹ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہاں موجود ہر آدمی ستائش بھری نگاہوں سے سردار کے لال بھبھو کا چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اُن کا لیڈر اُن کیلئے اقتدار کو لات مار رہا تھا۔ فون سے آواز اُبھری۔ ''ٹھیک ہے سردار صاحب! ہم اپنے ذاتی کوٹے سے دو ہفتوں کے اندر اندر سکول بنوا دیتے ہیں۔ اَب تو خوش ہیں ناں؟''

سردار کا چہرہ کھل اُٹھا۔ فاتحانہ نظروں سے اطراف میں کھڑے دیہاتیوں کو دیکھنے لگا۔ فون بند کر کے عالمگیر کو پکڑایا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا جیسے معرکہ مار کر میدان سے نکلا ہو۔ نمبر دار نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ چوم لئے۔ قربان صدقے کی صدائیں اُبھریں اور بلے بلے ہو گئی۔

عالمگیر جانتا تھا کہ اگلے دن تک اس فون کال کی رپورٹ مرچ مصالحے سمیت گاؤں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ہر فرد تک پہنچ جائے گی۔ جب دو ہفتوں کے بعد سکول کی تعمیر کیلئے بلڈنگز والے پہنچیں گے تو ہر کوئی یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا کہ سردار نے کروڑوں کا پلاٹ ٹھکرا کر اُن کیلئے سکول منظور کروایا ہے۔ سردار نے پانچ دس ہزار روپے کے کڑکڑاتے نوٹ محکمہ تعلیم کے عہدیدار کی جیب میں ڈال کر سکول اپنے کھاتے میں ڈال لیا تھا۔ سکول پر اُس کے نام کی افتتاحی تختی نصب کر دی جائے گی جو خاموش رہ کر سکول میں داخل ہونے والے کم فہموں پر ہنسا کرے گی۔ یہی کچھ ہوتا رہا ہے، یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

واپسی پر سردار نے اُسے اپنے ساتھ گاڑی میں بیٹھا لیا۔ راز دارانہ انداز میں پوچھا۔ ''لاہور سے کوئی نئی رپورٹ موصول ہوئی ؟''

وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں سردار! مصروف ہونے کی وجہ سے رابطہ نہیں کر سکا۔ اگر کوئی ضروری بات سامنے آتی تو لاہور والے مجھے مطلع کر دیتے۔''

''چوہدری باسط کے جنازے میں ملک فرید سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بدلا بدلا دکھائی دے رہا تھا۔''

''میں سمجھا نہیں!''

''اُس کا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔ مجھے شک ہے کہ اُسے پسِ پردہ معاملے کی بھنک پڑ گئی ہے۔''

نہایت آہستگی سے سر کو دائیں بائیں پھیرتے ہوئے عالمگیر نے کہا۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہم نے کہیں بھی غلطی نہیں کی۔''

''ہوسکتا ہے کہ تمہاری بھیجی ہوئی ڈسک کسی کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ فلم دیکھنے کے بعد چوہدری کو پڑنے والے دل کے دورے تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

''اگر ایسا ہو بھی گیا ہو تب بھی ہماری ذات پر شبہ کرنے کا جواز نہیں بنتا۔ یہ حرکت تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔'' عالمگیر نے کہا۔

وہ بلا جواز گھبرا رہے تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ چوہدری باسط کے کمرے سے یوں نکلنے کے فوراً بعد اُس کی بڑی بیٹی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اُس نے ٹی وی پر چلتی ہوئی فلم کو ایک نظر دیکھ کر ہی باپ کی بگڑی ہوئی کیفیت کا راز پا لیا تھا۔ اُس نے فوری طور پر پلیئر سے ڈسک نکال کر اپنی تحویل میں لے کر ہر کسی کی نظر سے پوشیدہ کر دی تھی۔ باپ کا جنازہ اُٹھ

گیا تھا، باپ کی عزت کا جنازہ اٹھنے سے پہلے ہی اُس نے روک لیا تھا۔ وہ غیر معمولی حوصلے والی لڑکی تھی۔ لیکچرر ہونے کے ناتے حادثے کو ہر پہلو سے جانچ رہی تھی۔ اپنے طور پر کرید میں لگی ہوئی تھی کہ اُس کے باپ کو مارنے والا کون ہو سکتا ہے؟ اُسے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ اُس کے باپ کو بلیک میل کرنے کیلئے اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالا گیا تھا۔ سوچ رہی تھی کہ اُس کے باپ کی شخصیت کس پر کس انداز سے اثر انداز ہو رہی تھی۔ رسی کے سرے کو پکڑ کر تہہ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ باپ کی فوتیدگی کی رسومات کی ادائیگی میں مصروفیت کے باعث اُس نے اِس معاملے کو آنے والے فارغ وقت پر ٹال رکھا تھا۔

سردار اپنی کوٹھی کی پارکنگ میں گاڑی سے اترنے ہی لگا تھا کہ عالمگیر کے فون کا بزر بول اُٹھا۔ اُس نے فون آن کر کے کان سے لگا کر کہا۔ ''کیسے ہو میرے یار! لاہور سے بول رہے ہو یا کسی اور طرف نکلے ہوئے ہو؟''

مسلسل دو منٹ خاموش رہ کر دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ پھر اوکے کہہ کر، فون بند کر کے سردار کی طرف پلٹا۔ ''سردار! لاہور سے رپورٹ آئی ہے کہ کوئی گینگ شانی بی بی کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا ہے۔ اُس کی مسلسل نگرانی ہو رہی ہے۔ بہ صد کوشش اُن کے مقاصد کا علم نہیں ہو سکا۔''

سردار کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ متفکر انداز میں اُسے دیکھنے لگا۔ بولا۔ ''یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟''

وہ سوچنے لگا۔ توقف کے بعد بولا۔ ''یونیورسٹی میں ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی ہے۔ اسی طرح ہر ایک کو تمہاری دولت کا بھی اندازہ ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی اُسے اغوا کر کے تاوان حاصل کرنا چاہتا ہو۔ کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔''

سردار کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ قدرت نے اُسے سیر بنا کر انسانیت کے ترازو میں رکھا تھا۔ وہ فرعون بن کر سوا سیر بننے کے چکر میں پڑا رہتا تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ رعشہ زدہ ہاتھ جگنو نہیں پکڑ سکتے۔ ذبح ہونے والے ہر جانور کو قربانی کا اعزاز میسر نہیں آتا۔ جیسے ہر سیر پر سوا سیر ہوتا ہے، ایسے ہی ہر سوا سیر پر ڈیڑھ سیر براجمان ہوتا ہے۔ وہ بولا۔ ''یہ تو بہت بری خبر ہے۔ اُسے لاہور سے بلا لیا جائے تو پڑھائی کا حرج ہوگا۔ وہیں رکھا جائے تو اغوا ہونے کا ڈر لگا رہے گا۔ تم ہی بتلاؤ! ایسے میں کیا کرنا چاہیے؟''

عالمگیر نے اپنی دانست میں بہترین مشورہ دیا۔ ''لاہور میں ایک عدد سچی فون کال کر کے اُس کیلئے سیکورٹی مانگ لیں۔''

جس قلعے کی بنیادیں اپنے ہاتھوں سے کھوکھلی کردی جائیں اُس پر اعتبار کرنے کو کوئی نہیں چاہتا۔ سردار نے اپنی پولیس کی کارگزاریاں دیکھ رکھی تھیں اس لئے انکار کردیا۔ عالمگیر نے کہا۔ ''یہاں پر پل پل میں حالات بدل رہے ہیں۔ کب کیا ہوجائے، خبر نہیں۔ ورنہ میں خود لاہور چلا جاتا۔ ساتھ میں بشیر خان یا شبر کو لے جاتا۔''

سردار کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ اس دوران وہ دونوں ہم قدم چلتے ہوئے اندرونی کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ ملازم کو چائے لانے کا حکم دے کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ سردار نے کہا۔ ''شانی بی بی کو اغوا کر کے کیا مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ اغوا برائے تاوان کے عادی مجرم کبھی اتنی لمبی چوڑی نگرانی اور پلاننگ نہیں کیا کرتے۔ بس آناً فاناً بندہ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔''

عالمگیر دل ہی دل میں اُسے سراہنے لگا۔ گھبرائے ہوئے سردار کی عقل نے کام کرنا شروع کردیا تھا۔ بولا۔ ''یہ بات تو ٹھیک ہے سردار! مگر کیا ہم شانی بی بی کی حفاظت کی بجائے اِسی سوچ بچار میں پڑے رہیں گے کہ کون یہ واردات کرسکتا ہے؟......نہیں! ہمیں عملی طور پر میدان میں اُترنا ہوگا ورنہ کبھی پورا نہ کیا جاسکنے والا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔''

سردار نے عندیہ دیا۔ ''کیا اُسے یہاں بلوالیا جائے؟''

''یہاں بلوانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا'' عالمگیر نے کہا۔ ''سانپ سے ہمیشہ کیلئے محفوظ رہنا تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب ہم سانپ کو کچل ڈالیں۔ وہ یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ ویسے بھی شانی بی بی کوٹھی میں قید تو نہیں رہ سکتی۔''

چائے پینے تک اُن کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ سردار ماتھے پر ہاتھ رکھے گہری سوچ میں غرق رہا۔ عالمگیر عجیب سی نظروں سے اُسے گھورتا رہا۔ سردار اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''عالمگیر! تم اپنے پیٹی بندوں سے مسلسل رابطہ رکھو اور پل پل کی خبر مجھ تک پہنچاؤ۔ یہاں کا چارج بشیر خان کو سنبھال دو اور خود لاہور جانے کی تیاری پکڑو۔ چونکہ یہ مکمل طور پر میرا گھریلو مسئلہ ہے اِس لئے میں تمہارے علاوہ کسی کی صلاحیتوں اور خلوص پر اعتماد نہیں کرسکتا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بولا۔ ''آپ اِس بارے میں پوری یکسوئی سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ میں لاہور گیا تو یہاں کی فضا ناگوار ہوجائے گی۔''

ہاتھ ملا کر تفہیمی انداز میں سردار نے سر ہلایا اور کوٹھی کے اندرونی حصے میں گھس گیا۔ وہ معنی خیز انداز میں سیٹی بجاتے ہوئے کوٹھی سے نکل آیا۔

اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر اُس نے شانی بی بی کو فون کیا۔ ''ہیلو شاہانہ! میں تمہارا مخلص بول رہا ہوں۔''

شاہانہ کی اُکتائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہاں بولو! میں سن رہی ہوں۔''

وہ اپنے بدلے ہوئے لہجے کو نسبتاً سخت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں کہا تھا کہ ہمارے بڑوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تمہارے باپ کی سرگرمیاں ہماری نگاہوں میں ہیں۔ تمہارے باپ کا کتا ذبح ہونے والے جانور کی بو سونگھتا پھرتا ہے۔ تم نے راز کو راز نہیں رکھا، اب راز کو راز رکھنے کی ذمہ داری ہم پر بھی عائد نہیں رہی۔ سمجھیں تم؟''

وہ گھبرا کر بولی۔ ''مگر میں نے تو کسی سے تذکرہ تک نہیں کیا۔ تم کہہ رہے ہو کہ......''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں'' وہ بات کاٹ کر خفگی سے بولا۔ ''ہمارے ملک صاحب کو رپورٹ ملی ہے۔ وہ بہت خفا ہیں۔ مس شاہانہ! تم نے اپنی بے وقوفی کے باعث بہت بڑی مصیبت مول لے لی ہے۔ تمہارا پورا خاندان ملک بھر میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گا۔''

وہ گھبرا کر رونے لگی۔ منتیں کرنے لگی۔ منت سماجت سے سر پر منڈلاتی مصیبت پرے نہیں ہٹتی۔ قیامت ٹلنے کیلئے نہیں آتی۔

اُس نے کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کر کے فون آف کردیا۔ اُسے یقین تھا کہ اب وہ ڈر کر اپنے بابا سے رابطہ کرے گی۔ اُس سے بہت کچھ چھپا کر سیکورٹی طلب کرے گی یا گھر آنے کی اجازت مانگے گی۔ شکاری اُس کی شہ رگ تک پہنچنے والا تھا یا وہ خود مچان سے آ کر ٹکرانے والی تھی۔

وہ مسکراتا ہوا بشیر خان کے پیچھے چل دیا۔ آج وہ اُس کی پسندیدہ جگہ پر بیٹھ کر دریا کے پانی کے مسلسل بہاؤ کا نظارہ کررہا تھا۔ دونوں بیٹھ کر آنے والے وقت کا لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔ عالمگیر اُسے حلقے کی سرگرمیوں کی تفصیل بتلانے لگا۔ اکثر معاملوں کا بشیر خان کو علم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔جن کا علم نہیں تھا، یکسوئی سے سمجھنے لگا۔

عالمگیر کی توقع کے عین مطابق سردار نے نو بجے کے قریب اُسے فون کیا۔ ''عالمگیر! شانی بی بی کا فون آیا تھا۔ اُسے بھی شاید اپنی نگرانی کا اندازہ ہوگیا ہے۔ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ مجھے فوراً کوٹھی بلوالیا جائے۔''

وہ بولا۔ ''تو کیا سوچا آپ نے؟''

''یہی کہ تم فوری طور پر لاہور چلے جاؤ۔'' سردار نے کہا۔ ''میں نے شانی بی بی سے کہہ دیا ہے کہ میں اُس کی حفاظت کیلئے عالمگیر کو بھیج رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری بیٹی کی حفاظت کیلئے جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرو گے۔''

اُس نے کہا۔ ''سردار! اِس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ میری زندگی میں کوئی اُس کو چھو نہیں سکے گا۔ مرنے کے بعد کچھ ہوا تو اُس پر پیشگی معافی چاہوں گا۔ میں کل دس گیارہ بجے یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔''

فون بند کر کے اُس نے لاہور جانے کی تیاری کرنا شروع کردی۔ زیرِ لب مسکراتے ہوئے گنگنانے لگا۔ ''ہر ایک کشتہ ناحق کی خامشی کو سلام' ہر ایک دیدہ پرنم کی آب و تاب کی خیر!''

سردار کے اِس فیصلے نے اُس کے اَنگ اَنگ میں مسرت کی لہر دوڑا دی تھی۔ سیانے کہتے ہیں کہ کوئی ایک فیصلہ زندگی بھر کی بساط کو پلٹ سکتا ہے۔ زندگی کی فیصلہ کن گھڑیاں بھی یونہی اچانک وارد ہوکر لمحوں میں گزر جاتی ہیں۔ بہت بعد میں لمحاتی فیصلے کی گٹھڑیاں کھل کر مستقبل کے سوت سے ہر لباس کا دھاگہ بننے لگتی ہیں۔ اُس کا یہاں کافی کام باقی تھا مگر رفیع اللہ جیسے تھانیدار کے آنے پر وہ عملی طور پر ناکارہ ہونے والا تھا۔ اس دوران وہ لاہور میں رہ کر اپنے ادھورے امور بہ آسانی سرانجام دے سکتا تھا۔ ابھی وہ پرعزم اور خوش تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ سردار کے اِس فیصلے کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔

بم دھماکے میں دو تین افراد جان سے گزر گئے تھے۔ ان گنت لوگوں کو زخم آئے تھے۔ اکثر لوگوں کے زخم مندمل ہوچکے تھے، باقیوں کے ہونے والے تھے۔ شاہانہ کو بم دھماکے میں کوئی جسمانی ضرب نہیں لگی تھی، روح کا گھاؤ لگا تھا جو ہر آنے والے دن میں اپنی تکلیف بڑھاتا جاتا تھا۔ کوئی مرہم کارگر نہیں تھا بلکہ سرے سے مرہم دستیاب ہی نہیں تھا۔ کئی مرتبہ ڈسک دیکھ کر دیوانہ وار روئی۔ آنسو دل کا غبار ہلکا نہیں کر پائے، ایسے زخم سے تکلیف کو نہیں چن سکتے۔ متعدد بار فون کرنے والے نے اُس کی بے چینی کو بڑھانے کیلئے رابطہ کیا تھا۔ وہ نادان نہیں تھی۔ جانتی تھی کہ اُس کی بے مقصد گفتگو کا مطلب کیا تھا؟ ...... وہ اُسے پریشان کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے مقصد کو پورا کر رہی تھی۔ کلاس سے مسلسل غیر حاضریاں کر رہی تھی۔ ایک کمرے تک محدود رہتے ہوئے اُس نے خود کو کافی بیزار کرلیا تھا۔

مجبوراً اُس نے اپنے پاپا کو فون کر کے جھوٹ بولا کہ اُس کے اردگرد کچھ مشکوک لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اپنے بدن سے لپٹی ہوئی بدنامی کی آلائشیں لے کر گھر جانے میں بہت سے خطرات لاحق تھے۔ اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے دشمن بھی وہاں پہنچ کر اُسے منہ دکھانے کے لائق نہ چھوڑتے۔ وہ یہیں رہنا چاہتی تھی۔ اُس کی مرضی کے عین مطابق پاپا نے عالمگیر کو اُس کی حفاظت کیلئے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس نے اپنے پاپا کی زبان سے عالمگیر کی دلیری اور ذہانت کے بہت سے قصے سن رکھے تھے۔ دل میں یہ اندیشہ سرسرا رہا تھا کہ عالمگیر کو اُس کی پریشانی کا سبب معلوم ہونے پر کیا ہوگا؟ وہ اپنے مالک کا وفادار تھا۔ وفاداری کا تقاضا نبھاتے ہوئے پل پل کی خبر کوٹھی تک پہنچائے گا۔ خبر کے ساتھ ساتھ اُس کی رسوائی گھر تک پہنچے گی۔ پھر کیا ہوگا؟ ......سوچتے سوچتے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نتیجے پر پہنچی کہ کسی کے ہاتھ میں کھلونا بننے کی بجائے اُسے عالمگیر کو اعتماد میں لے کر پوری بات بتلا دینے میں ہی فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوگیا کہ وہ عالمگیر کو اعتماد میں لے سکے گی؟ اعتماد پیار سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پیار ہم پلہ انسان سے کیا جاسکتا ہے۔ عالمگیر اُس کے باپ کا ملازم تھا، اُس کیلئے بھی ملازم کا مرتبہ رکھتا تھا۔

دنیا کے ہر بڑے کی طرح جانتی تھی کہ نوکر کو سر پر چڑھا لیا جائے تو وہ سر کی دستار چوہے کی طرح کترنے لگ جاتا ہے۔ سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ سجھائی نہ دینے پر اُس نے عالمگیر کی آمد پر آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے خود کو غیر متعلق کرلیا۔

سمیرا سے فون پر رابطہ کرکے باتیں کرنے لگی۔ اُس نے دریافت کیا۔ ''تم کافی دنوں سے کیمپس سے غیر حاضر ہو، کیا وجہ ہے؟''

وہ بولی۔ ''طبیعت کچھ ناسازسی رہتی ہے۔''

سمیرا نے چٹکی لی۔ ''اِس عمر میں طبیعت کی ناسازی بلاوجہ نہیں ہوتی۔ کیا تم دل میں ہیجان پیدا کرنے والی وجہ کے بارے میں مجھے نہیں بتلاؤ گی؟''

وہ جھینپ کر بولی۔ ''میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا۔ آج بھی کہتی ہوں کہ جب بھی کوئی میری زندگی میں داخل ہوا، تمہیں سب سے پہلے مطلع کروں گی۔''

سمیرا نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا گروپ آج تمہارے پاس پہنچنے کی تیاریاں کررہا ہے۔ سب متفق ہیں کہ ملکہ عالیہ کو پورے پروٹوکول کے ساتھ یونیورسٹی لایا جانا چاہیے۔''

وہ ہنسی۔ ''کیوں؟ میں نے کونسا تیر مارلیا ہے؟''

''تو لاکھ چھپے رے گوری تھم تھم کے......'' سمیرا نے مزہ لیتے ہوئے گنگنا کر کہا۔ ''دل پر بیتی ہوئی واردات کا قصہ سننے کیلئے سبھی بے تاب ہیں۔ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کررہی ہوں کہ مابدولت بالکل ٹھیک ہیں مگر وہ ماننے پر تیار ہی نہیں۔ میں کیا کرسکتی ہوں؟ او کے! ملنے پر مزید باتیں ہوں گی۔''

رابطہ منقطع ہونے پر وہ اٹھی اور دوستوں کے استقبال اور اُن کی خاطر مدارات کا بندوبست کرنے لگی۔ اچھا تھا، کمپنی میں دل بہل جاتا۔

سہیلیاں مہمان بن کر اُس کی کوٹھی میں اُتریں تو وہ ایک غیر متوقع چہرہ دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ سمیرا، فرح اور سعدیہ رئیس کی بڑی سی کار میں بیٹھ کر آئی تھیں۔ رئیس اُن کے ہمراہ

تھا۔ حیرانی کے عالم میں سمیرا کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔ ''یہ رئیس کب سے ہمارے گروپ میں شامل ہوا ہے؟''

وہ جواباً آواز آہستہ رکھ کر بولی۔ ''ہم نے گاڑی اور ڈرائیور کی سہولت کیلئے اِس امیر زادے کی خدمات حاصل کی ہیں۔''

باتیں کرتے ہوئے وہ اُس کے کمرے تک آئے۔ گارڈ، رحمت بی اور ڈرائیور بھاگ بھاگ کر اُن کی تواضع کا بندوبست کرنے لگے۔ صوفوں پر براجمان ہوکر اُنہوں نے باقاعدہ طور پر اُس کی عیادت کی۔ نپی تلی اداکاری دیکھ کر وہ دل ہی دل میں شرمسار ہورہی تھی۔ بظاہر سنجیدہ بیٹھی اپنی طبیعت کی خرابی کے بارے میں بتلا رہی تھی۔ رئیس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''قدرت بڑی حسن پرور ہے۔ بخار چڑھا کر لڑکیوں کو مزید خوبصورت کردیتی ہے۔ ایک ہم ہیں، ادھر بخار چڑھا، ادھر رنگ سیاہ اور جلد بے رونق ہوگئی۔ ہر کوئی کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ میاں! کل تک تیتر تھے، آج بٹیر بنے بیٹھے ہو۔ ایسے میں گرل فرینڈ بھی کہتی ہے کہ ڈارلنگ! تم کل تک تیتر تھے، آج کوے دکھائی دے رہے ہو۔''

سبھی ہنسنے لگیں۔ رحمت بی نے ڈائننگ ٹیبل پر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ انہیں لے کر ٹیبل پر آگئی۔ برتن کھنکنے لگے۔ ایسے میں اُس کے فون کا بزر بج اُٹھا۔ وہ معذرت کرکے اپنے کمرے میں آئی۔ فون اُٹھا کر سکرین کو گھورنے لگی۔ نمبر اجنبی نہیں تھا بلکہ دل کی دھڑکن بڑھا دینے والے اجنبی کا تھا۔ وہ بولی۔ ''اَب کیا ہے؟ تمہیں بھی رہ رہ کر دھمکیاں یاد آتی ہیں۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی بار فون کرکے مجھے اچھی طرح دھمکا لو اور میری جان چھوڑ دو۔ یا مہینے میں کوئی ایک دن مخصوص کرلو۔ میں پورے اہتمام سے تمہاری بکواس سننے کیلئے تیار رہوں۔''

وہ خفا ہونے کی بجائے جاہلانہ انداز میں ہنسنے لگا۔ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تم نے میرے روکنے کے باوجود عالمگیر کو اپنی حفاظت کیلئے طلب کرلیا ہے۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ تمہیں اِس عذاب سے نکال لینے میں کامیاب ہوجائے گا۔''

وہ حیران رہ گئی۔ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اُس کا واسطہ عام لوگوں سے نہیں بلکہ غیر معمولی دسترس رکھنے والے مجرموں کے کسی منظم نیٹ ورک سے پڑ گیا تھا۔ ابھی تک عالمگیر کے لاہور میں آنے کی بات اُس کے اور پاپا کے درمیان تھی۔ انہیں کیسے پتہ چل گیا۔ اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیرانی پر قابو پا کر بولی۔ "جب تمہیں ہر بات کا پتہ چل جاتا ہے تو یہ کیوں پتہ نہیں چلا
عالمگیر میرے بلانے پر نہیں، پاپا کے بھیجنے پر یہاں آ رہا ہے۔"

وہ بولا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو۔ بہ ہر حال! تم منگوا رہی ہو یا تمہارا باپ بھیج رہا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ جو کام سالوں کے بعد ہونا طے تھا، وہ اُس کے آنے پر چند دنوں میں شروع کر دیا جائے گا۔ تم ترازو تھام کر بیٹھ جانا اور دونوں پلڑوں میں رکھا ہوا وزن چیک کرنا۔ سردار صاحب بھاری پڑتے دکھائی دیتے ہیں یا ملک صاحب!"

وہ لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے بولی۔ "پھر؟ میں کیا کر سکتی ہوں تمہارے لئے؟"

وہ مخصوص جاہلانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ "کچھ بھی نہیں۔ کرنے والا کام ہم کر لیتے ہیں۔ تم زندگی انجوائے کرو۔ گڈ لک!"

رابطہ منقطع ہو گیا۔ پہلے کی طرح اُس نے گفتگو میں پیش رفت نہیں کی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ صرف اُس کی اعصاب شکنی کیلئے رابطہ کرتا ہے۔ ابھی تک اپنے مفادات کے حصول کیلئے اُس نے کوئی قدم نہیں اُٹھایا تھا اور نہ ہی اُسے بتلایا تھا کہ اُس کے "ملک صاحب" کی ترجیحات کیا تھیں۔ اپنے طور پر اُس نے یہ رائے قائم کر رکھی تھی۔ "ملک" کا سیاسی وڈیرا اُس کے باپ کو نیچا دکھانے کیلئے یہ گھٹیا چال چل رہا ہے۔ وہ سیاسی وڈیرا ہو سکتا ہے؟ اِس بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

عادت کے مطابق اُس نے کال بیک کی۔ رابطہ نہیں ہوا۔ فون سیٹ بند کیا جا چکا تھا زیرِ لب بڑبڑائی۔

"کمینے میں اتنی دلیری بھی نہیں کہ فون کرنے کے بعد اپنا نمبر چالو رکھ سکے۔"

سوچنے لگی۔ ہو سکتا ہے کہ فون کرنے والے کو نمبر کے ٹریس کئے جانے کا ڈر ہو۔ مسکرانے لگی۔ ایسا کیسے ممکن تھا۔ نمبر کی لوکیشن اور ملکیت ٹریس کرنے کیلئے فون کا آن ضروری نہیں ہوتا۔ آج کل ویسے بھی بغیر رجسٹریشن کے نمبر کھلے عام بازار میں دستیاب ہیں۔ عام آدمی اپنی رجسٹریشن نہیں کراتا، ایسے لوگ کس طرح اپنا نقش پا چھوڑ سکتے ہیں۔

یہی سوچتی ہوئی ڈائننگ ٹیبل پر آ گئی۔ سب نے استفہامیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ معذرت کرتے ہوئے بتلانے لگی کہ اُس کے گھر سے فون آیا تھا۔ سمیرا بولی۔ "تمہیں ... کے دو گھر ہوتے ہیں۔ ایک وہ جہاں سے آتی ہے، ایک وہ جہاں پر جاتی ہے۔

گھر سے فون تو نہیں آیا جہاں تم جانے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

سب ہنسنے لگے۔ وہ جھینپ کر بولی۔ "ابھی یہ طے ہی نہیں ہوا کہ میرا دوسرا گھر کون سا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے کنکھیوں سے اپنے سامنے رکھی ہوئی پلیٹ سے نبرد آزما رئیس کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ سمیرا نے اُس کی آنکھوں کی چوری پکڑ لی۔ آنکھوں سے ہی طعنہ زن ہوئی۔ "پلو سے باندھ کر دوسرے گھر کی راہ دکھانے والا نگاہوں میں اُترا بیٹھا ہے۔ دل میں کان کی بجائے آنکھ کے راستے سے اترنا چاہتا ہے۔"

بات ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اُس پر طعنہ زنی کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ وہ منہ پھیر کر سعدیہ سے محوِ گفتگو ہو گئی۔ کچھ دیر خوش گپیوں میں مشغول رہنے کے بعد اُس سے اگلے دن کیمپس پہنچنے کا وعدہ لے کر چاروں رخصت ہو گئے۔ جاتے ہوئے رئیس نے ایک جاندار مسکراہٹ اُس کی طرف اچھال دی تھی۔ اپنی آمد کا دیرا اثر ثبوت دے کر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

وہ اُس کے بارے میں سوچتے ہوئے لان میں آن بیٹھی۔ گارڈ اُس کے قریب پہنچ کر مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ "سردار سائیں کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کل عالمگیر یہاں مستقل رہنے کیلئے آ رہا ہے۔ میری سمجھ میں اُس کی یوں ہنگامی بنیادوں پر آمد کا سبب نہیں آیا۔ خیریت تو ہے ناں بی بی جی!"

وہ بولی۔ "پاپا کو ہی علم ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ پاپا اپنی مشکلات میرے ساتھ تو کیا، کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کرتے۔"

"میں یہ پوچھنے کیلئے آیا تھا کہ عالمگیر کیلئے کون سا کمرہ تیار کر دوں؟"

وہ نخوت سے بولی۔ "گراؤنڈ فلور پر کچن کے سامنے والے کمرے میں اُسے ٹھہرا دینا۔ اُس کیلئے کوئی خصوصی اہتمام تو کرنے سے رہے۔"

وہ "جی بی بی جی" کہہ کر رخصت ہو گیا تو وہ عالمگیر کے بارے میں سوچنے لگ گئی۔ آنے والا پہنچنے سے قبل ہی موضوعِ گفتگو بن گیا تھا۔ اُس کے پاپا نے اُسے اہمیت ہی اتنی دے رکھی تھی کہ خواہ مخواہ اُس سے ملنے کا دل میں تجسس رہتا تھا۔

اگلے دن اپنی آب و تاب کو مہمیز کر کے کلاس میں پہنچی تو یوں لگا جیسے زمانہ بدل چکا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دل نے کہا۔ "زمانہ وہیں رُکا ہوا ہے، تم کپڑے بدل کر آئی ہو۔ نئے لباس میں سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔"

کچھ دیر تک عجیب سی کیفیت طاری رہی۔ دل کا چور چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ سمیرا نے پوچھا۔ "تم کچھ اَپ سیٹ دکھائی دیتی ہو۔ خیریت تو ہے ناں؟"

وہ مسکرا کر خاموش رہ گئی۔ سمیرا اُس کا ہاتھ پکڑ کر کلاس روم سے باہر آ گئی۔ تراشیدہ گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "سچ بتلاؤ شانی! تم کافی بدلی بدلی دکھائی دے رہی ہو۔"

وہ کچھ بتلانا نہیں چاہتی تھی۔ سمیرا چہرے پر لکھی کشمکش پڑھ کر غمزدہ سی ہو گئی۔ بولی۔ "آل رائٹ! میں سمجھ گئی ہوں کہ تم مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتی ہو۔ میں یہ ضرور کہوں گی کہ تم رئیس میں دلچسپی لینے لگی ہو۔ تمہاری پیش و پس کا سبب بھی جانتی ہوں۔ تمہاری نظر میں وہ بھونرا مزاج شخص ہے۔ یہی بات ہے ناں؟"

وہ چادر کے کونے کو پکڑ کر پہلو تک پہنچ گئی تھی۔ شاہانہ طویل سانس حلق میں اتار کر بولی۔ "غلط سمجھی ہو۔ میری پریشانی کا سبب رئیس نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ہے؟"

وہ عجیب سے انداز میں اُسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ جب تم سمجھتی ہو کہ میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تو کریدتی کیوں ہو؟

سمیرا شرمسار سی ہو گئی۔ اُسے اٹھا کر کیفے کی طرف چل دی۔ ہم قدم چلتے ہوئے کہنے لگی۔ "شانی! محبت کرنا جرم نہیں۔ محبت میں حد سے گزرنا جرم ہوتا ہے۔ گھٹ گھٹ کر جینے کا دور تمام ہو چکا ہے۔ تعلیم ہمیں شعور دیتی ہے کہ ہم اپنی پسندیدگی کو جنون بنانے سے روکیں۔ یہ اِسی صورت میں ممکن ہوتا ہے کہ بیماری کے پہلے حملے کو محسوس کرتے ہی ڈاکٹر سے رجوع کر لیا جائے۔ سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟"

وہ رک کر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ لفظ لفظ سینت کر بولی۔ "پلیز سمیرا! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں واقعی پریشان ہوں مگر میری پریشانی کی وجہ رئیس ہرگز نہیں ہے۔ مجھے خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کیونکہ میں خود اپنی پریشانی کا سبب نہیں جانتی۔ تم کوئی اور بات کرو۔"

سمیرا نے واقعی ٹاپک بدل دیا۔ اَب وہ سعدیہ کیلئے پچھلے دنوں آنے والے رشتے کے بارے میں بول رہی تھی۔ کیفے سے اُٹھ کر کلاس روم کی طرف آ رہی تھیں کہ رئیس سے ٹکراؤ ہو گیا۔ تینوں گھاس پر آن بیٹھے۔ سمیرا نے سعدیہ کو لے کر آنے کا ارادہ ظاہر کیا اور اُٹھ گئی۔ رئیس نے مسکرا کر کہا۔ "بڑی جذبات شناس ہڈی ہے۔ کباب کو تڑکتا دیکھ کر آپوں آپ نکل گئی۔"

وہ چونک کر بولی۔ "میں کچھ سمجھی نہیں؟"

وہ مسکرانے لگا۔ جانتا تھا کہ وہ اتنی نادان نہیں تھی کہ سامنے کی بات کو سمجھ نہ پاتی۔ سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔ "میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں کھل کر گفتگو کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہو!" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اُس کیلئے تمہارا موڈ موزوں نہیں ہے۔"

"پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟" وہ پیشانی پر بل سجا کر بولی۔ "جو کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہہ دو۔ یہ فلمی ڈائیلاگ کسی دوسرے وقت پر اُٹھا رکھو۔"

وہ سوچنے لگا۔ فوتیدگی پر رشتوں کی بات نہیں کی جاتی۔ شادی میں شکووں کو رَوا نہیں سمجھا جاتا۔ جاں بہ لب مریض کے سرہانے بیٹھ کر کرکٹ کی کمنٹری کرنے والے کو احمق کہا جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہوئے بھی دل کی بات کہنا چاہتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ سننے کے موڈ میں نہیں۔ کہے یا نہ کہے؟ اِسی ادھیڑ بن میں ہی تھا کہ بے اختیار منہ سے نکل گیا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں...... تمہیں مجھ سے محبت ہے یا نہیں۔ اِس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس یہی کہنا تھا۔"

وہ ٹپٹا کر اُسے دیکھنے لگی۔ یوں بے دھڑک محبت کے اظہار پر غصہ آیا۔ بولی۔ "اپنی اِس محبت کا سیریل نمبر بھی بتلا دو تو مجھے یاد رکھنے میں آسانی رہے گی۔"

اُس کا چہرہ بجھ گیا۔ طنز نے روح میں دور تک گھاؤ لگا دیا تھا۔ کئی ساعتیں خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "میں درخت پر چڑھ کر شیر آیا، شیر آیا کا شور مچاتا رہا اور لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کرتا رہا۔ شیر کو موجود نہ پا کر سب لوگوں کی طرح تم بھی مجھ سے بدگمان ہو گئی ہو۔ اَب شیر آ چکا ہے اور تمہیں میری صدائے حق پر اعتبار نہیں رہا۔ مجھے بتلاؤ کہ ایسی صورت میں مجھے کیا

کرنا چاہیے؟"

وہ ایک ٹک اُس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی زبان اور دل کے بیانات کا موازنہ کر رہی ہو۔ وہ بولا۔ "ایسے کیا دیکھتی ہو؟ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر مجھے کسی لڑکی کی ضرورت ہوتی تو تمہارے علاوہ کسی اور کے پیچھے بھاگتا۔ مجھے علم ہے کہ تم اُن تمام لڑکیوں سے مختلف ہو جن سے مختلف اوقات میں میرے تعلقات استوار ہوئے۔ میں دوست کی نہیں، شریکِ سفر کی تلاش میں بھٹکتا ہوا تم تک پہنچا ہوں۔"

سچائی اور اداکاری ...... دونوں ہم پلہ ہو گئیں۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ رئیس جھوٹ بولتا ہے، رئیس سچ کہتا ہے، حقیقت کیا ہے؟ چند لمحے دیکھتی رہی پھر نظریں جھکا کر بولی۔ "رئیس! تم اچھے خاندان کے فرد ہو۔ اچھائی سچ کا لباس پہنے تو جچتی ہے۔ جھوٹ پہن کر آئے تو اپنے مقام سے گر جاتی ہے۔ اِس لئے بہتر ہے کہ تم سچ کہو!"

وہ اُس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "میں سچ کہتا ہوں مگر اپنے سچ کو ثابت کرنے کیلئے کہاں سے دلیل ڈھونڈ کر لاؤں جو تمہیں مطمئن کر دے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ پہلی مرتبہ اُس کے سامنے کھلی تھی۔ بولی۔ "او کے! میں یقین کے راستے پر چل دیتی ہوں۔ خود کو سچا ثابت کرنے کیلئے تمہیں وقت دیتی ہوں۔ جہاں بھی ڈگمگاؤ گے، چھوڑ کر دور ہو جاؤں گی۔"

چاہنے والا خوش ہو گیا۔ جھومتے ہوئے بولا۔ "آئی لو یو شانی! میں اپنے اِس دعوے کو تم پر ثابت کر دوں گا۔"

وہ آنکھوں کو آدھا میچ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیسے؟"

اُس کی اِس ادا پر شاید وہ بے قابو ہو کر اُسے محبت کا یقین اُسی لمحے فراہم کر دیتا مگر جانتا تھا کہ کوئی بھی نازیبا حرکت تعلقات کی شروعات پر ہی برا اثر ڈال دے گی۔ بہ دقت تمام خود پر قابو پا کر خاموش رہا۔ ایک ٹک دیکھتا رہا اور اپنی آنکھوں سے بول کر نہ کرنے والی پر فدا ہوتا رہا۔ سمیرا واپس آئی تو دونوں کو خاموش بیٹھا دیکھ کر بولی۔ "بات شروع نہیں ہوئی یا شروع ہو کر تمام بھی ہو گئی؟"

دونوں کی محویت ٹوٹی۔ چونک کر اُسے دیکھا۔ رئیس نے کہا۔ "تمہاری دوست جیت گئی، میں ہار گیا۔ عشق میں ہارنے والا درحقیقت فاتح ہوتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس نے شکوہ کناں نگاہوں سے اُسے دیکھا اور بولی۔ "میں اِسی لئے تمہیں گھاس نہیں ڈالتی تھی کہ تم پھٹے ہوئے ڈھول ہو۔ بات کا بتنگڑ بنانے میں کمال رکھتے ہو۔"

سمیرا ہنسنے لگی۔ بولی۔ "ڈھول بارات کی دھما چوکڑی میں بجتا ہے۔ بجے گا تو باراتی اکٹھے ہوں گے، تمہاری ڈولی اُٹھے گی اور ......"

"بس بس ......" وہ جھینپ کر بولی۔ "میری ڈولی سے پہلے تمہارا جنازہ نہ اُٹھ جائے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

سمیرا کا خیال کئے بغیر رئیس نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ چومتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہیں حالِ دل بتلا کر کوئی جرم نہیں کیا۔ کسی نامحرم کو چھونے کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ پوری دنیا کو بتلانے کی جرأت کی ہے کہ تم میری ہونے والی بیوی ہو۔ میں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں۔"

وہ بھونچکا رہ گئی۔ ہاتھ چھڑانے کی جرأت معدوم ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر دوسرے ہاتھ کو بھی گرفت میں لے لیا۔ "جن کے من میں کھوٹ ہوتی ہے، وہ چھپ چھپ کر محبت کے اظہار کا اعادہ کرتے ہیں۔ میں اِن لغویات میں پڑنے کی بجائے کھلم کھلا اعلان کرتا ہوں کہ تم پر میرے نام کا لیبل لگ چکا ہے۔ تم میری ہو......"

یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اُسے بھی گھسٹ کر کھڑا ہونا پڑا۔ رئیس نے اُس کے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے۔ پوری وسعت میں بازو کھول کر کھڑا ہو گیا اور اونچی آواز میں بولا۔ "میں اعلان کرتا ہوں کہ تم میری ہو...... میں تمہارا......"

سمیرا نے جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دبی دبی آواز میں سرزنش کرنے لگی۔ "رئیس! ہوش کے ناخن لو۔ تم مرد ہو، جو جی میں آئے بک سکتے ہو۔ ہمارا خیال کرو۔"

شاہانہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے بدن میں سرگرداں خون آخری قطرے تک نچڑ گیا۔ منہ کھولے کبھی رئیس کو، کبھی سمیرا کو دیکھتی رہی۔ رئیس ہنستا ہوا بھاگ گیا۔ سمیرا اُسے بیٹھاتے ہوئے بولی۔ "گھبراؤ مت شانی! کسی نے اُس کی بکواس پر توجہ نہیں دی۔"

وہ بے جان مورتی کی طرح بیٹھ گئی۔

"کہا ناں! ٹیک اِٹ ایزی شاہانہ۔" سمیرا نے دلاسہ دیا۔ "ایسے بڑبولے مَن کے سچے ہوتے ہیں۔ کسی سچے مرد کیلئے اتنی سی تکلیف برداشت کر لینی چاہیے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ طویل سانس حلق میں اتار کر رہ گئی۔ اُس کی نم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سمیرا نے پوچھا۔ ”تمہارا چہرہ بتلاتا ہے کہ رئیس کی گستاخی تمہیں بری لگی ہے۔ ایسا ہی ہے؟“

وہ اُسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ بولنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اُس کی آنکھوں نے دل کا حال کھلی کتاب بنا کر سمیرا کے سامنے رکھ دیا تھا۔

جانے والا جا چکا تھا۔ اپنے پیچھے ایک دل کی دھڑکن تیز کر گیا تھا۔ دل خود پر قابو پانے کی کوشش میں اُسے بے چین کر رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا کہ عورت کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جسے وہ عمر بھر اوڑھنا چاہتی ہے۔ تم پر بھی وہ لمحہ آن اُترا ہے۔ اپنی ہتھیلیوں میں پیار کے جگنو کو ہمیشہ کیلئے قید کر لو۔ اِس ننھی سے لو سے تمام زندگی حرارت پاتی رہے گی۔ یہی سچ ہے۔

اٹھنے لگی تو پتہ چلا کہ بدن ساتھ دینے پر آمادہ نہیں۔ لہرا کر بدقت اُٹھی اور کلاس روم میں جانے کی بجائے پارکنگ میں کھڑی کار کی طرف بڑھ گئی۔ سبق نیا نہیں تھا، کتاب نئی نہیں تھی مگر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کچھ پہلی مرتبہ بیت رہا ہو۔

چمکتی کار تک پہنچ نہیں پائی تھی کہ پرس میں مُردے کی طرح لیٹا فون جاگ پڑا۔ رُک کر موبائل نکالا۔ سکرین پر پریشان کرنے والا نمبر جل بجھ رہا تھا۔ آن کر کے کان سے لگایا۔

”ہیلو! کوئی نئی دھمکی یاد آ گئی کیا؟“

دوسری طرف سے حسبِ روائت اعصاب شکن قہقہے کی آواز سنائی دی۔ قہقہہ تھا تو وہ بولا۔ ”تمہارے راستے میں پڑنے والے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوں۔ سیدھی چلی آؤ۔ تم سے آج کھل کر بات ہو جائے تو اچھا ہے۔“

اُس کے بولنے سے پہلے اُس نے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتلایا۔ وہ نفرت سے ہونٹ بھینچ کر بولی۔ ”میں تم سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اگر چڑھتے سورج تلے خواب دیکھنے کے عادی ہو تو بھلے دیکھتے رہو۔ میں نہیں آؤں گی۔ جو کہنا چاہتے ہو، فون پر ہی کہہ دو۔ میں سُن رہی ہوں۔“

اُس کے غیر متوقع جواب نے اُسے مشتعل کر دیا۔ پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”کیا تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ مجھے انکار کرنے پر تمہارا کیا حشر کیا جا سکتا ہے؟“

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ ”تمہیں بھی یاد نہیں رہا کہ میں کسی ایرے غیرے کی بیٹی نہیں

ہوں بلکہ......“

بات کاٹ کر اُسے تباہ و برباد کرنے کی دھمکیاں دے کر دھمکانے والے نے فون بند کر دیا۔ غصے اور ڈر نے اُس کی حالت خاصی مخدوش کر ڈالی تھی۔ تیز تیز قدم اُٹھاتی گاڑی تک آئی اور ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔ ”سیدھے راستے کی بجائے متبادل لین لے کر گھر چلو۔“

ڈرائیور نے تعمیل کی۔ وجہ پوچھنے کی گستاخی نہیں کی۔ گاڑی کی رفتار خاصی تیز رکھتے ہوئے وہ بیس پچیس منٹوں میں کوٹھی پہنچا۔ کار پورچ میں کھڑی کر کے گارڈ کی طرف چلا گیا۔ پرانا آدمی تھا۔ شانی بی بی کے خوف کو بھانپ گیا تھا۔ ایسی حالت میں گارڈ کو الرٹ کرنا اُس کی ذمہ داری تھی۔

وہ کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ طبیعت مکدر تھی۔ فون پر دھمکانے والے نے اُسے رئیس کے خیال میں گم رہنے کا لطف پوری طرح حاصل کرنے نہیں دیا تھا۔ اُسے ذہن سے جھٹک کر رئیس کے بارے میں سوچنے لگی۔ انسان بھی بڑی عجیب شئے ہے۔ روتے ہوئے ہنسنے کا جواز پیدا کر لیتا ہے۔ قہقہوں میں مضطرب کرنے والے آنسوؤں کو یاد کر بیٹھتا ہے۔ اُسے پوری یکسوئی سے اپنی شخصیت پر لپٹے ہوئے جال کی ڈوروں سے جان چھڑانے کی ترکیب کرنا چاہیے تھے۔ وہ کبوتر کی طرح خطرے سے آنکھیں چرا کر عشق کی تخیلاتی دنیا میں مگن ہونا چاہ رہی تھی۔ ایک طرف پریشانیوں کا ریلا اُسے بہا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر کر رہا تھا تو دوسری طرف وہ چاہے جانے کی خواہش میں رئیس کے خوابوں کا شہد آنکھوں میں ٹپکا رہی تھی۔

عشق کی بلی تب تھیلے سے باہر آتی ہے جب انسان مکمل طور پر خردمند اور آسودہ ہو۔ جب تھیلے سے نکل آتی ہے تو خرد سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ نادان کو عشق نہیں ہوتا۔ عشق والا دانا نہیں رہتا۔ عجیب کھیل ہے۔ کھیلنے والا جان پر کھیل جاتا ہے۔ نہ کھیلنے والا بے جان زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔

ایسے میں اُس کے باپ کا فون اُس کی توجہ سمیٹنے لگا۔ ننھے سے آلے میں سردار فضل کا جاہ و حشم والا وجود آواز بن کر سمٹ آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جانِ پدر! آج کسی وقت عالمگیر تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ تمہیں بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری طرف میلی

آنکھ اٹھانے والے کے چہرے سے آنکھیں نوچ کر تمہیں بھرے شہر میں محفوظ کر دے گا۔"

وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولی۔ "پاپا! آپ نے پہلے بھی مجھ پر ایک گارڈ تعینات کر رکھا ہے۔ ڈرائیور اور دو محافظوں کے جلوس میں جب چلوں گی تو تماشا بن جاؤں گی۔"

باپ نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "اِسے وی آئی پی پروٹوکول کہا جاتا ہے۔ جب تمہارا باپ کہیں جاتا ہے تو اُس کے آگے پیچھے محافظوں کی قطار ہوتی ہے۔ دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا ہے۔"

"کیا یہ سب کچھ کرنے سے ہونی کو ٹالا جا سکتا ہے؟"

"آنکھ پر سیاہ چشمہ لگا کر دھوپ کی شدت سے بچا جا سکتا ہے۔ اونی کوٹ پہن کر سردی سے بدن کو بچایا جا سکتا ہے۔ بالکل اِسی طرح اپنے اردگرد کھمبیوں کی طرح گنیں گاڑ کر موت بن کر آنے والے کو موت کے گھاٹ اتار کر زندہ رہا جا سکتا ہے۔" سردار فضل نے اُسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ "تم فکر کیوں کرتی ہو؟ تمہارا باپ ابھی زندہ ہے۔ تم پر اُٹھے ہوئے ہاتھ کو کاٹ دینے کی قدرت رکھتا ہے۔"

وہ ہنکارا بھر کر رہ گئی۔ کہنا چاہتی تھی کہ سیاہ چشمہ لگانے کے باوجود آنکھ سے دن دیہاڑے سرمہ چرایا جا چکا ہے۔ اونی کوٹ پہن لینے کے باوجود سینے کی حدت کو باہر کی سردی نے چاٹ لیا ہے۔ خاموش رہی تو سردار نے دلاسہ دیا۔ "شانی بیٹا! عالمگیر بہت ہوشیار آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس کی ایک جھلک دیکھ کر تمہیں نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھنے والے وہ علاقہ ہی چھوڑ دیں گے۔ ایک خیال رکھنا۔ وہ میرا سر چڑھا ملازم ہے۔ اُس کی کوئی عادت ناگوار گزرے تو درگزر سے کام لینا۔"

"جی پاپا! میں اُسے ناراض نہیں کروں گی۔"

"اُسے پوری تفصیل سے آگاہ کر دینا۔ تعاقب کرنے والوں کی نشاندہی کر دینا۔ اگلا کام وہ خود کر لے گا۔"

پاپا نے فون کو چوم کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اُس نے رحمت بی کو چائے لانے کا حکم دیا۔ کمبل کھینچ کر سینے تک اوڑھ لیا۔ پہلے سارا دن ٹی وی پر پروگرام دیکھا کرتی تھی۔ اپنی فلم دیکھ کر سکرین سے ہی متنفر ہو گئی تھی۔ اُسے کوئی سین بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پردہ کب کا درست کر کے لٹکایا جا چکا تھا مگر اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تک دیوار کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جڑ میں ڈھیر ہوا پڑا ہے۔ اُس پردے کے تلے دبا ہوا اُس کا وجود ابھی تک وہیں ڈھیر ہوا محسوس ہونے لگا۔ آہستگی سے اُٹھ کر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ پردہ سرکا کر باہر دیکھنے لگی۔

رحمت بی چائے دینے کیلئے آئی تو وہ بڑے انہماک سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ چائے کا کپ تھامتے ہوئے بولی۔ "عالمگیر کیلئے کمرہ تیار ہے؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

کھڑکی میں اُسے سامنے والی کوٹھی کا لان دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے خالی تھا، اب آباد ہو چلا تھا۔ اُجلے لباسوں میں ایک جوڑا جوانی کی مست اَلست اٹکھیلیاں کرنے میں مشغول تھا۔ ایک بچہ اُن کے قریب ہی اچھلتا کودتا پھرتا تھا۔ وہ چائے پینے کے دوران جیتا جاگتا منظر دیکھتی رہی۔ اُس نے سینکڑوں ازدواجی جوڑے دیکھے تھے۔ جوڑوں کی خلوت میں جھانکنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آج قدرت اُسے ایک لباس میں چھپنے ہوئے دو انسانوں کی خلوت سے آشکار کر رہی تھی۔ دونوں یہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بھیڑ میں بھی دل تنہائی ڈھونڈ لیتا ہے۔ وہ بڑی محویت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

اچانک اُس کی نظر دھندلا گئی۔ سر جھٹک کر نظروں کا فوکس درست کیا تو چونک پڑی۔ اُس کے سامنے رئیس اور شاہانہ کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دنیا و مافیہا سے غافل دکھائی دے رہے تھے۔ رئیس، شانی کی زلفوں میں انگلیوں کی کنگھی پھنسا کر تشنہ ہونٹوں کی پیاس بجھاتے ہوئے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ لان میں کھڑی شانی اور ونڈو میں کھڑی شانی کے محسوسات الگ تر نہیں تھے۔ لان میں رئیس کا ہاتھ سرخ پیرہن میں ملبوس شانی کے جسم کے جس حصے کو چھوتا، کھڑکی میں کھمبی کی طرح ساکت کھڑی شانی کے جسم کے اُسی حصے کو انگارہ بنا دیتا تھا۔ انگارہ جلا کر خاکستر کر دیتا ہے، یہ کیسا دہکتا ہوا انگارہ تھا جو روح میں طمانیت اور ہیجان بھر دیتا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ شانی لان میں کھڑی ہے یا کھڑکی میں کھڑی ہے؟...... کس طرح بدن کا پیغام بغیر کسی تار کے اُس تک پہنچ رہا ہے؟

رئیس نے اپنے ایک ہاتھ سے اُس کا ننھا سا ہاتھ تھاما۔ دوسرے ہاتھ سے آستین کا کپڑا فولڈ کیا۔ کلائی سے کچھ اوپر والہانہ نظروں سے کسی چیز کو دیکھتا رہا۔ پھر ہونٹوں سے لگا کر چومنے لگا۔ کھڑکی میں کھڑی شانی کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ بازو میں اُسی جگہ

پرسرسراہٹ ہونے لگی۔ پھر یوں لگا جیسے آگ لگ گئی ہو۔ اُس نے جلدی سے کف ہٹا کر کلائی کو دیکھا۔ وہاں ایک ننھا سا تل دکھائی دے رہا تھا۔ تِل نے اس طرح سے آگ پکڑ لی تھی کہ پورا جسم آن کی آن میں دہکنے لگا تھا۔ اردگرد نظر دوڑائی۔ کہیں پانی دکھائی نہیں دیا۔ آگ پر پانی ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ اُس نے بازو اُٹھا کر تل کو اپنی زبان سے لگالیا۔ کچھ سکون ملا۔ پھر زبان بھی سلگنے لگی۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے ہی تِل کو چوسنے لگی۔ بہت دور بچپن میں وہ زندہ رہنے کیلئے ماں کی چھاتی کو اسی طرح چوسا کرتی تھی۔ آج بڑی ہو کر ٹھنڈا رہنے کیلئے اپنے ہی تل کو چوس رہی تھی۔ بجائے ٹھنڈا ہونے کے تل بخار پکڑتا جا رہا تھا۔ کل چھاتی سے دودھ رِس کر اُس کے شکم کو بھر دیتا تھا۔ آج طمانیت کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ کچھ ایسی چیز تھی جو تل سے نکل کر شکم کی بجائے دل اور پھیپھڑوں میں اترتی جا رہی تھی۔ اِس شراب میں ایسا نشہ تھا کہ بوتل بھی ناچنے پر مجبور ہوگئی۔

ایسے میں اُن کا بچہ بھاگتا ہوا اُن تک پہنچا۔ ان سے لپٹ کر اپنے ہونے کا احساس دلانے لگا۔ وہ دونوں جھینپ کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے اور بچے کی ناز برداریاں کرنے لگے۔ ان کی دنیا میں تیسرا آ گیا تھا۔ شانی کی دنیا میں بھی کوئی آچکا تھا۔ گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز نے اُسے چونکا کر پورچ کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

عالمگیر ٹیکسی سے اترتا ہوا دکھائی دیا۔ ڈرائیور نے ایک اٹیچی تھام رکھا تھا جبکہ گارڈ کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چرمی بیگ تھا۔ عالمگیر کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے برآمدے میں گھس کر اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ عالمگیر کے نظر سے اوجھل ہو جانے پر اُس نے خود کو نسبتاً زیادہ محفوظ پایا۔ کھڑکی سے ہٹ کر بیڈ پر آ گئی۔ ایک رسالہ اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی۔ کسی تحریر پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ نظر نے زندہ انسانوں کی کہانی جاگتے وجود کے ساتھ دیکھی تھی۔ مردہ لفظوں پر اعتبار کرنے کو جی نہیں مان رہا تھا۔ رحمت بی کمرے میں داخل ہوئی اور اُسے متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ ”شانی بی بی! عالمگیر آن پہنچا ہے۔ میں نے اُسے اُس کے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔“

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

رحمت بی جاتے ہوئے اپنے پیچھے دروازہ بند کر گئی۔ وہ رسالہ بند کر کے بائیں کلائی پر چمکتے ہوئے تل کو دیکھنے لگی۔ جاندار جسم پر بے جان تل آج کتنا شوخ ہوگیا تھا۔ انگلی کی اَن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پورکے لمس سے تل کو سہلانے لگی، بہلانے لگی، سلانے لگی۔ جتنا ہمکتی، اتنا ہی بے چین ہو کر نخرے دکھانے لگتا۔ سوچنے لگی۔ ”بدن کی سفید چمکتی چادر پر لگے ہوئے اِس کالے دھبے کو اُتار پھینکنے کیلئے کتنے جتن کیے مگر اِس نے جان نہیں چھوڑی۔ ماں کہتی ہے کہ نوین نکور عمارت کو نظر بد سے بچانے کیلئے منڈیر پر پرانی کالی ہنڈیا رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ آج کیا ہوا ہے؟ بد نظروں سے بچانے والا کالا دھبہ ہی پورے بدن کی عمارت میں سوہنا لگ رہا ہے۔ کہیں اِسے نظر نہ لگ جائے۔“

دیکھنے والا کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دستک دینے لگا۔ اُس نے چونک کر دروازے کی سمت نگاہ اُٹھائی۔ اَدھ کھلے دروازے میں عالمگیر کھڑا دربارِ حسن میں حاضری دینے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے کف برابر کر کے ننھے سے سیاہ تل کو چھپانے لگی۔

❀❀❀

چوہدری باسط کا اصول شناس بدن منوں مٹی میں اُتر چکا تھا۔ اُس کی دستار اُس کی زندگی میں ہی مٹی میں مل گئی تھی۔ ایسے میں مقدر کا شکوہ کیا جاتا ہے۔ جب اُس نے مرنا ہی تھا تو اُسے زندگی کا اتنا المناک نظارہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟ مقدر شکوے سنتا رہتا ہے۔ جواب نہیں دیتا۔ جواب دینے والا ہلکا پڑ جاتا ہے۔ آشکار ہو جاتا ہے۔ وہ کسی پر آشکار ہونے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ دنیا والے آواز کی لَے کو پکڑ کر صداکار تک پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

موت کی پرچھائیاں چند دن تک گھر کے در و دیوار پر چھائی رہتی ہیں، پھر غیر محسوس انداز میں حالات معمول پر آجاتے ہیں۔ زندگی اپنی ڈگر پر رواں ہو جاتی ہے مگر چوہدری باسط کے ڈیرے پر درختوں کے پتوں نے زمین بھر دی تھی۔ اِن کرب آلود پتوں کو چننے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ زنان خانے میں دونوں بہنیں چند مزارعوں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ چھوٹی باتیں کر رہی تھی۔ بڑی ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ’میری ماں نے میرا نام بتول رکھا تھا۔ میں بتول نہیں رہی بلکہ ببول بن کر باپ کا سینہ چھلنی کر چکی ہوں۔ میری بدقسمتی تو یہ ہے کہ میرے باپ کے قتل کو طبعی موت قرار دیا جا رہا ہے۔ مجھے ہتھیار بنا کر میرے باپ کو قتل کرنے والے کو میں بھی نہیں جانتی۔ کوئی کیا جان پائے گا؟ ہائے اللہ! اِس قیامت کی گھڑی میں میں کیا کروں؟‘

باپ کے مرنے کے بعد وہ اِس گھر کی مالکہ تھی۔ ماں اَن پڑھ اور گھریلو عورت ہونے کی وجہ سے چار دیواری کے باہر کے معاملات کو سمجھ نہیں سکتی تھی، سلجھا کیسے پاتی۔ اُس نے زمینوں اور لین دین کا حساب کتاب اپنے ہاتھ لیتے ہوئے خدا سے شکوہ کیا تھا۔ ''ہماری... بھائیوں سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے نوکروں کے گھروں میں ننگے دوڑتے پھرتے ہیں... کی کمی نہیں۔ میرے لئے ایک بھائی بھی آسمان سے نہ اتارا جا سکا۔ کیوں؟ کیا ہم دو بہنیں اِس قابل ہی نہیں تھیں؟''

سوچنے لگی۔ ''اگر ہمارا بھی کوٹھے جتنا بھائی ہوتا، شیر جیسی طاقت اُس کے بازوؤں میں بھری ہوتی تو ہم یوں سرِ عام دن دیہاڑے اٹھائی نہ جاتیں اور باپ گرد میں اٹی... اٹھانے کے چکر میں زمین میں نہ گر جاتا۔ ہائے اللہ! بے غیرتی اور بے بسی کے کس مقام... مجھے کھڑا کر دیا گیا ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو الزام تک نہیں دے سکتی۔ اگر تو میری مدد نہیں کرنا چاہتا تو مجھ پر میرے باپ کے قاتل کا چہرہ ہی بے نقاب کر دے!''

اُسے سوچوں میں گم دیکھ کر چھوٹی بولی۔ ''باجی! کیا سوچ رہی ہو؟''

''زری! میں وہی کچھ سوچتی ہوں جو تم سوچتی رہتی ہو۔'' وہ گہرا سانس لے کر بولی۔ ''کیا تمہارے پاس ملک امجد کا نمبر ہے؟''

زرینہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''ایک مرتبہ میں نے اپنی ہوم اکنامکس کی کاپی پر لکھا تو تھا۔ ذرا ٹھہرو! دیکھتی ہوں۔''

وہ اُٹھ کر کمرے میں گئی۔ ماں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''ملک امجد فرید کا نمبر کیوں ڈھونڈ رہی ہو؟ کوئی کام ہے اُس سے؟''

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''ہاں اماں!''

اماں پوچھنا چاہتی تھی مگر صحن میں بیٹھی عورتوں کی موجودگی کی وجہ سے خاموش ہو گئی۔ کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر زرینہ نے اُسے پکارا۔ ''باجی! نمبر مل گیا ہے۔''

وہ اُٹھی اور زرینہ کے کمرے میں گئی۔ اُس سے کاپی لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ سوچنے لگی۔ ''مجھے ملک امجد سے بات کرنی چاہیے یا نہیں؟ وہ کیا خیال کرے گا میرے بارے میں؟''

کچھ دیر صوفے پر بیٹھی سوچ میں گم رہی۔ فیصلے پر پہنچ کر رابطہ کرنے لگی۔ چند لمحوں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی وہ اپنی عمر اور قد سے کہیں بڑی ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنے تئیں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اُسے نرمی اور نزاکت کے خول سے نکل کر آہنی ارادوں کی دیواریں چننا ہوں گی ورنہ وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے بے سہارا خاندان کو بھی لے ڈوبے گی۔

رابطہ ہونے پر اُس نے دریافت کیا۔ ''کیا امجد صاحب لائن پر ہیں؟''

دوسری طرف سے باوقار مردانہ آواز سنائی دی۔ ''جی فرمائیے! میں امجد فرید بات کر رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟''

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں آپ کو جانتی ہوں۔ آپ بھی غائبانہ طور پر مجھے جانتے ہیں۔ میں چوہدری باسط کی بیٹی بتول بات کر رہی ہوں۔''

''اوہ بتول صاحبہ! کیسی ہیں آپ؟'' ملک امجد فرید نے اُسے پہچان کر کہا۔ ''مجھے چوہدری صاحب کے انتقال پر بڑا افسوس ہوا تھا۔ اپنے باپ اور بھائیوں کے ہمراہ کئی دن متواتر آپ کے گھر آتا رہا مگر آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ خیریت تو ہے؟''

خیریت نہیں تھی مگر فون پر یہ کہنا عجیب سا لگا۔ کشمکش کی وجہ سے گفتگو میں تعطل آ گیا۔ ملک امجد فرید نے متفکرانہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ نے کچھ کہنے کیلئے فون کیا تھا۔ خاموش کیوں ہو گئیں؟''

وہ اپنی ہمت یکجا کر کے بولی۔ ''سر! وہ بات یہ ہے......''

بات ادھوری رہ گئی۔ سگنل ڈیڈ ہونے کی وجہ سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ فون جھولی میں رکھ کر اپنا تیز ہوتا تنفس قابو میں لینے لگی۔ چند ساعتیں گزر گئیں۔ سکرین پر دیکھا۔ سگنل نہیں آرہے تھے۔ سوچنے لگی۔ ''نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہو گا۔ کوئی لڑکی کسی اجنبی کو اِس طرح فون نہیں کرتی۔''

دل نے کہنی چبھوئی۔ ''وہ اجنبی ہے؟...... اگر ایسا ہے تو پھر تم اُسے مشکل پڑنے پر کیوں پکارنے لگی ہو؟ اجنبیوں سے ہمیشہ جان چھڑائی جاتی ہے۔ جن کو دِل کی راہ دکھلائی جائے، وہ اجنبی نہیں رہتے۔''

کئی منٹ گزر گئے۔ نوکرانی نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ اُٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئی۔ زرینہ نے پوچھا۔ ''باجی! رابطہ ہوا ملک امجد فرید سے؟''

وہ بولی۔ ''ہاں! مگر بات ہونے سے پہلے ہی سگنل چلے گئے۔''

کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ستانا چاہتی تھی۔کچھ نہ کرنے کی تھکن محسوس کرنے لگی۔ایسے میں اُس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کا بزر چیخ اُٹھا۔ اُس نے سکرین پر جلتے بجھتے ہندسے دیکھے۔اُس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"سر!سگنل ختم ہونے کی وجہ سے بات ادھوری رہ گئی۔معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کو فون کرنا پڑا۔"

وہ بولا۔"میں نے آپ کو فون اِس لئے کیا ہے کہ میں اِس وقت ڈیوٹی پر موجود ہوں۔ آپ شام کو آٹھ یا نو بجے فون کیجئے گا۔ بلکہ میں ہی آپ سے رابطہ کرلوں گا۔ناراض نہیں ہونا پلیز!"

اُس نے او کے کہہ کر فون بند کر دیا۔بولنے والا خاموش ہو چکا تھا مگر اُس کی سماعت میں جیسے اُس کے الفاظ ڈھارس بن کر ثبت ہو گئے تھے۔سوچنے لگی۔"بڑے باپ کا بیٹا ہے مگر کتنی نرمی اور اخلاق سے بات کرتا ہے۔لگتا ہی نہیں کہ سول جج بول رہا ہے۔"

وہ خود بھی کسی گرے پڑے کی بیٹی نہیں تھی مگر ملک فرید کے خاندان کے مقابلے میں اُس کا خاندان کم حیثیت رکھتا تھا۔موبائل فون کو رخساروں پر بے دھیانی میں رگڑتے ہوئے ملک امجد فرید کے بارے میں سوچنے لگی۔ برسوں قبل بچپن میں دیکھا تھا۔ جونہی باپ نے پردے میں بیٹھا دیا، وہ اوجھل ہو گیا۔اَب کیسا ہوگا؟ جس طرح اُس کے جسم نے جوانی کی بھٹی میں کود کر تبدیلیاں پکڑ لی تھیں، اِس طرح وہ بھی بدل چکا ہوگا۔میٹرک کے بعد پڑھنے کیلئے شہر والی کوٹھی میں منتقل ہو گیا تھا۔ بعد میں اُس کے لاہور جانے کی خبر بھی سنی تھی۔ مرنے سے چند دن قبل چوہدری باسط نے گھر والوں کو بتلایا تھا کہ سول جج بن کر فیصل آباد میں تعینات کر دیا گیا ہے۔

ایک گھنٹہ سوچوں میں گزر گیا۔زرینہ نہا کر اُس کے کمرے میں آ گئی۔گیلے بالوں سے قطروں کی صورت گرتے ہوئے پانی کو تولیے میں سمیٹتے ہوئے اُس کے قریب بیڈ سے پیٹھ ٹکا کر قالین پر بیٹھ گئی۔بولی۔"باجی! ملک امجد سے کیا بات کی ہے تم نے؟"

دونوں بہنیں عمروں کی تفاوت کے باوصف ایک دوسرے کی راز دار تھیں۔بتول بولی۔ "میں اُس سے مدد لینا چاہتی تھی۔اُس نے شام کو فون کرنے کا کہا ہے۔دیکھیں! رابطہ کرتا ہے یا نہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیسی مدد؟"

"اباجی کو مارنے والوں کا محاسبہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو کیا تم اُسے ساری بات بتلاؤ گی؟"

"ظاہر ہے۔" وہ پُرتفکر لہجے میں بولی۔"پوری کہانی سنانے سے ہی اُسے کچھ پتہ چلے گا۔"

"اِس طرح تو ہمارا خاندان رُسوا ہو جائے گا۔نہیں باجی! تم اُس سے کوئی بات نہیں کرو گی۔" زرینہ رونے لگ گئی۔

وہ دلاسہ دیتے ہوئے خود بھی رونے لگ گئی۔گلوگیر لہجے میں بولی۔"میں پہلے بھی ایک بہت بڑی غلطی کر چکی ہوں۔غلطی کو دہرانا نہیں چاہتی۔ اگر میں اباجی کو اُسی دن صاف صاف ماجرا کہہ سناتی تو وہ کبھی بھی مجھے قصوروار نہ سمجھتے اور گہرے دکھ سے انہیں ہارٹ اٹیک نہ ہوتا۔میرے بولنے سے میری پوزیشن صاف ہو سکتی ہے۔میرے خاموش رہنے سے مجھ پر بنائی ہوئی فلم میری بے حیائی کا ثبوت بن جائے گی۔"

چھوٹی نادان نہیں تھی۔اُس کی بات کو بہ خوبی سمجھ رہی تھی مگر اُسے بدنامی اور رسوائی سے ڈر لگتا تھا۔سسکتے ہوئے بولی۔"ایک کو بتلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ پورے پنڈ کو خبر دی گئی ہے۔لوگ ہم پر تھوتھو کرنے لگیں گے۔"

"جن لوگوں نے ہم پر قیامت ڈھائی ہے، وہ کیا خاموش بیٹھ جائیں گے؟" بتول نے اندیشہ ہائے رسوائی کا اظہار کیا۔"وہ اپنے کئے کی قیمت وصول کرنے کیلئے میدان میں اُتر چکے ہیں۔"

"اور ہم بہت بھاری قیمت دے چکے ہیں۔" زرینہ کا اشارہ اپنے باپ کی موت کی طرف تھا۔

"اغوا کرنے اور یہ ڈراما رچانے سے قتل کرنا زیادہ سہل تھا۔ وہ اباجی کو مارنا نہیں، ہمارے خاندان کو اپنے قدموں تلے جھکانا چاہتے تھے۔ اباجی کی غیر متوقع اور ناگہانی فوتیدگی کے باعث اُن کے مقاصد ادھورے رہ گئے ہوں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے باجی!" زرینہ نے کہا۔"مگر ملک امجد ہماری کیا مدد کر سکتا ہے؟"

"وہ بہت بڑے عہدے پر فائز ہے۔ہو سکتا ہے کہ وہ اُن لوگوں سے میری بے حیائی

کے ثبوت حاصل کر کے ہماری اُن کمینوں سے ہمیشہ کیلئے جان چھڑانے میں کامیاب ہو جائے۔''

''اور اگر نہ ہو سکا تو؟''

زرینہ کے اِس اندیشے کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اُسے خاموش پا کر زرینہ بولی۔ ''تو ہم اُس کی نظروں میں بھی برہنہ ہو جائیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اپنی زباں بندی کی قیمت مانگنے لگ جائے۔ ایسی صورت میں کیا ہو گا؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''نہیں زری! وہ ایسا نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا انسان ہے۔ میں کم از کم اُس کے بارے میں ایسا نہیں سوچ سکتی۔''

زرینہ اُس سے متفق نہ ہوئی۔ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ جاتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھا گئی۔ ''باجی! تم بڑی ہو، میں چھوٹی ہوں۔ بڑے کی عقل بھی بڑی ہوتی ہے۔ جو بھی کرنا، سوچ سمجھ کر کرنا۔ ہم کانٹوں پر ننگے پیروں چلنے والی بے سہارا لڑکیاں ہیں۔ باپ کے ہوتے ہوئے ہمیں سڑک پر سے اُٹھا لیا گیا تھا۔ باپ کے بعد کیا ہم پر انگلیاں اُٹھانے والوں کو روکا جا سکتا ہے؟''

اُس کے اوجھل ہونے پر وہ از سرِ نو اپنے تیار کردہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگی۔ بہت غور و خوض کے بعد اِس نتیجے پر پہنچی کہ اُسے امجد فرید کو ہمراز بنا کر اُس کے اختیارات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ رہی کھلنے کی بات، تو وہ پہلے ہی کھل چکی تھی۔ اُس کا باپ برہنہ بیٹی کو دیکھ کر ہمیشہ کیلئے آنکھیں موند چکا تھا۔ سب کچھ دیکھنے کے بعد اُس نے بیٹی کا سامنا کرنے کے عذاب کو نہ جھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور کچھ پوچھ کر کے اُسے صفائی کا موقع نہیں دیا تھا۔ اُس سے بڑی قیمت وہ نہیں چُکا سکتی تھی۔

فون شام کو آنا تھا۔ وہ ابھی سے انتظار کرنے لگ گئی۔ لحاف اوڑھ کر فون کرنا ہی چاہتی تھی کہ وہ اُس کی خلوت میں آن پہنچا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ''بتول صاحبہ! آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔''

وہ آزردگی سے بولی۔ ''سر! میں خود پریشان ہوں۔ ابھی کم پریشان کیا ہے، آنے والے وقت میں زیادہ پریشان کروں گی۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''جی! میں سن رہا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا آپ ایک آدھ دن کی چھٹی لے کر یہاں آ سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں؟'' وہ زیادہ الجھ گیا۔ ''مگر بات کیا ہے؟''

''بات ایسی ہے کہ میں کہنے کی ہمت نہیں پا رہی۔''

''فون پر آواز سنائی دیتی ہے، چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ آپ ایسے میں بتلانے کی ہمت نہیں رکھتیں، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیسے کہہ پائیں گی؟''

''وہ جی...... آپ پلیز!'' بات نہ بن سکی تو گھبرا کر ہکلانے لگی۔

''اوکے! میں آپ کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اجنبیت آڑے آ رہی ہے۔ میں چھٹی لے کر آپ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انتظار کیجئے۔ نور پور پہنچ کر اطلاع کر دوں گا۔''

''اوہ تھینکس! میں کبھی بھی آپ کا احسان نہیں بھلاؤں گی۔'' اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ فون بند ہونے پر سوچنے لگی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جو فون پر نہیں کہا جا سکتا، وہ روبرو کہنا کتنا مشکل ہو گا۔ ارادہ مضبوط کرنے لگی۔ اُسے اپنے خاندان کی رہی سہی عزت کو بچانے کیلئے شعلوں کے بیچ سے کپڑے بچا کر گزرنا تھا۔ ذرا سی غلطی یا کوتاہی پر بدن سے لپٹا ہوا ریشم شعلے پکڑ کر اُسے جھلسا سکتا تھا۔

اُسے ایک ترکیب سجھائی دی۔ ایک اجنبی کے سامنے کھل کر مدعا بیان کرنا مشکل ثابت ہو گا۔ بہت سی ایسی باتیں بھی ہوں گی جنہیں وہ غیر ارادی طور پر چھپا جائے گی۔ اس کا حل یہ تھا کہ وہ اپنے مدعا کو تفصیل کے ساتھ احاطہ تحریر میں لے آئے۔ خاموش رہ کر خود پر بیتی ہوئی داستان تجزیات سمیت سنا سکتی تھی۔

ترکیب اچھی تھی۔ جسم میں نئی توانائی محسوس کر کے اُٹھی۔ بک شیلف تک گئی۔ ایک نوٹ بک اور پنسل اُٹھا کر سٹڈی ٹیبل پر آ گئی۔ ذہن میں جو کچھ تھا، نوٹ بک میں سمونے لگی۔

جرم جتنی ذہانت اور چالاکی سے کیا جائے، کہیں نہ کہیں سقم چھوڑ جاتا ہے۔ پہنچنے والا پائنچہ پکڑ کر پہلو میں، پھر گردن تک آن پہنچتا ہے۔ جب وہ سوچ سوچ کر لکھ رہی تھی تو بہت کی جزئیات یاد آ رہی تھیں۔ پہلی کامیابی اُس نے حاصل کر لی تھی۔ اُسے ویگن کا نمبر دیکھنے کا موقع تب ملا تھا، جب ویگن دونوں بہنوں کو اسٹاپ پر اُتار کر فراٹے بھرتی ہوئی چلی گئی تھی۔ اُس کی عقبی نمبر پلیٹ پر درج ہندسے اُسے یاد آ گئے۔ وہ آنکھیں بند کر کے چشمِ تصور

میں سڑک پر جاتی ہوئی ویگن کو دیکھنے لگی۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ اُس نے ہندسوں کو پوری طرح ازبر کرلیا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے کاپی پر نمبر درج کرلیا۔

ایک بات کی طرف دھیان چلا گیا۔ اُس نے سوچا کہ اُس کے باپ تک فلم پہنچانے والے نے فون پر رابطہ ضرور کیا ہوگا۔ اٹھ کر باپ کے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ کھولتے ہی ماں بیڈ کے کنارے پر گم صم بیٹھی دکھائی دی۔ وہ بیڈ کی دراز کھول کر فون نکالنے لگی تو ماں چونک پڑی۔ اُسے اپنے مرحوم شوہر کا فون تھامے دیکھ کر تعجب سے بولی۔ ''اس کا کیا کرنا ہے؟ تمہارے پاس اپنا فون ہے تو سہی۔''

وہ بولی۔ ''کچھ نمبر ابا جی کے فون کی میموری میں محفوظ ہیں۔ انہیں کاپی پر لکھنا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر بہ آسانی دستیاب ہوسکیں۔''

ماں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ دکھی لہجے میں بولی۔ ''جسے ضرورت پڑتی تھی، وہ بہت دور چلا گیا ہے۔ اُس نے جاتے ہوئے یہ بھی نہیں سوچا کہ ہم تین بے سہارا عورتیں کہاں جائیں گی۔ میری تو خیر، کم از کم تم دونوں کا تو کچھ نہ کچھ کرجاتا۔ ہائے اللہ! میں ننگے سر کہاں جاؤں، کہاں سے ان ننگ سری لڑکیوں کیلئے چادریں ڈھونڈ کر لاؤں۔''

وہ اپنی ماں کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔ منہ چومتے ہوئے بولی۔ ''اماں! دکھی نہ ہوا کر۔ ہمارے مقدر میں جو لکھا ہے، وہ مل کر رہے گا۔ جو تمہیں ملنا تھا، مل گیا ہے۔ اللہ آگے کی خیر کرے۔''

ماں کے بوڑھے کانپتے ہونٹوں سے۔ ''آمین'' نکلا اور وہ بیٹی کو سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔ ایسے میں بیٹے کی کمی کا احساس فزوں تر ہونے لگا۔ ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھ کر بڑبڑائی۔ ''میری کوکھ نے بیٹا نہیں دیا، خدا مجھے دوسروں کی کوکھ سے بیٹے نکال کر دے دے تو میرے دلدر دور ہوجائیں گے۔ اے خدا! ان بے چاریوں کے نصیب بھلے کردے۔ بیٹوں کی جگہ پر داماد کھڑے دیکھ کر ہی جی کو خوش کرلیا کروں گی۔''

وہ سنی ان سنی کرتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد ماں کے دل کو کچھ قرار آ گیا تو وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ فون میں ریسیو ہونے والی کالیں چیک کرنے لگی۔ اغوا ہونے سے لے کر باپ کے دم توڑنے تک جتنی کالز ریسیو ہوئی تھیں، انہیں ایک کاغذ پر لکھ لیا۔ ایک کال کے علاوہ تمام فون نمبر میموری میں ناموں کے ساتھ محفوظ تھے۔ ایک نمبر ایسا تھا جو پہلے کبھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں آیا تھا۔ اُس نے اُس نمبر پر دائرہ لگا کر مخصوص کردیا۔

مندرجات ایک باضابطہ کہانی کی شکل اختیار کرتے گئے۔ بارہ ایک بجے تک پورے انہماک سے لکھتی رہی۔ قطع و برید کے باعث بار بار تسلسل مجروح ہوجاتا تھا۔ جب تسلی ہوگئی تو اپنے لکھے ہوئے کو صاف ستھری تحریر کی شکل دینے لگی تاکہ پڑھنے والے کیلئے کوئی دشواری نہ رہے۔ پچھلا پہر طاری ہونے پر وہ اپنا کام ختم کرچکی تھی۔

دو دن گزر گئے۔ اُس کا انتظار ختم ہوگیا۔ امجد فرید بستی نور پور میں پہنچ چکا تھا۔ اپنی آمد کی اطلاع اُس نے بتول کو فون پر دے دی تھی۔ عشاء کے وقت اُس سے ملنے کیلئے آنے والا تھا۔ دل دھڑک اُٹھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی زندگی میں پہلی مرتبہ اُس سے ملنے کیلئے آنے والا تھا۔ اُس کے ساتھ کوئی جذباتی لگاؤ نہ ہونے کے باوصف جذبات اتھل پتھل ہو رہے تھے۔ زرینہ نے ٹہوکہ دیا۔ ''باجی! تمہاری بے چینی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ تمہیں پسند کرنے کیلئے آرہا ہے۔''

وہ مسکرائی۔ ''اطلاع دے کر آنے والے مہمان کیلئے بے چینی کا پایا جانا عین فطری ہوتا ہے۔ میں کوئی خلافِ فطرت کام تو نہیں کررہی ہوں۔''

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ بتول نے مصنوعی خفگی سے ٹوکا۔ ''اے! کیا ہے؟ ایسے منہ پھاڑ کر کیوں ہنس رہی ہو؟''

وہ ہنستے ہنستے بولی۔ ''ایک فون کال پر کوئی کچے دھاگے سے یوں بندھا چلا آئے تو غیر معمولی بے چینی کا پایا جانا بھی فطری ردعمل کہلاتا ہے۔''

وہ باز نہیں آرہی تھی۔ اُس سے جان چھڑا کر تنہائی ڈھونڈنے لگی۔ دل کی چھان پھٹک کی۔ کہیں بھی مہمان کیلئے محبت کا جذبہ دکھائی نہیں دیا۔ سوچنے لگی۔ ''زری مجھ سے بھی بڑی احمق ہے۔ جو کچھ میں ملک امجد فرید کو بتلانے جارہی ہوں، اُس پر مجھے اور زری کو کم از کم یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہوجائے گا۔ وہ میرے وجود سے نفرت نہ کرے، یہی غنیمت ہوگا۔''

دل میں بے چارگی بھر گئی۔ وہ بری نہیں تھی مگر بری بنادی گئی تھی۔ ذہنی طور پر وہ کچی کلی تھی، بدن گلاب کی طرح کھل کر اپنے اسرار کھو بیٹھا تھا۔ اِس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا مگر دنیا والے قصور دیکھ کر نہیں، موقع دیکھ کر سزا دیا کرتے ہیں۔ وہ ملک امجد فرید سے تو کیا،

کسی سے بھی محبت نہیں کرتی تھی۔ اُس نے تو آج تک ڈھنگ سے اپنے خیالات کو کسی آئیڈیل پر منطبق ہی نہیں کیا تھا۔ یہی سوچ رکھا تھا کہ ماں باپ کان سے پکڑ کر جس کی مسہری پر بیٹھا دیں گے، وہ اُسی کے پاؤں دھونے میں جُت جائے گی۔ والدین نے کسی کو بیٹھایا نہیں تھا مگر اُس کی ذات میں نقب لگائی جا چکی تھی۔ بھاگ دوڑ کر ملک امجد فرید کے استقبال کیلئے انتظامات مکمل کرنے کے بعد اپنے آپ کو تیار کرنے لگی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اپنی شکل دیکھ کر گھن آنے لگی۔ چہرے کی اجلی رنگت پر لگے سیاہ دھبے صرف اُسے ہی دکھائی دیتے تھے۔ سوچنے لگی۔ ”کلنک دنیا کی نظروں میں کھٹک گیا تو کیا ہوگا؟“

ہاتھ خاصی سست روی سے چل رہے تھے۔ ہلکا پھلکا میک اَپ کر کے لباس تبدیل کرنے لگی۔ ایسے میں باہر ہارن بجنے کی آواز سنائی دی۔ گزشتہ دو تین دنوں سے انتظار کرانے والا اُس کی دہلیز پر کمک بن کر پہنچ آیا تھا۔ وہ جلدی سے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ چند ساعتوں کے بعد ملک امجد فرید ملازم کی معیت میں کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے منتظر پا کر سلام کرنا چاہتا تھا۔ سراپا دیکھ کر تکلفات بھول گیا۔ چند ثانئے تک اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ وہ جھینپ کر بولی۔ ”سر السلام علیکم! میں بتول ہوں۔ ادھر تشریف لائیں۔“

اُس نے صوفے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا تھا۔ وہ بیٹھ کر سانسیں برابر کرتے ہوئے بولا۔ ”وعلیکم السلام! پہلی مرتبہ ملے ہیں۔ شاید اِس لئے میں کچھ نروس سا ہو گیا تھا۔“

ملازم چلا گیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ”بارہا مرتبہ اِس کمرے میں آ چکا ہوں۔ پہلی مرتبہ آپ کو دیکھا ہے۔ بچپن کی بتول اور میرے سامنے بیٹھی بتول میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آسمان کو دیکھا جائے تو زبان ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اماں جی کیسی ہیں؟“

وہ بتلانے لگی۔ ملازم نے ڈائننگ ٹیبل لگنے کی اطلاع دی۔ وہ بولا۔ ”آپ تو شاید تکلفات میں پڑ گئی ہیں۔ میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔“

وہ بہ صد اصرار اُسے ساتھ لے کر اندرونِ خانہ آ گئی۔ اُس نے تھوڑا کھایا، تعریف زیادہ کی۔ اماں جی اور زرینہ سے ملاقات ہوئی۔ دل میں سوچنے لگا۔ ”چوہدری باسط کی زندگی میں ممکن نہیں تھا کہ وہ ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ پار کرتا۔ اُس کے مرنے پر یہ دروازہ کھلا ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر خود کو کوسنے لگا۔ غلط انداز سے سوچنے پر ضمیر نے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

گھنٹہ بھر کی ملاقات کے نتیجے میں وہ، امجد فرید کی پروقار اور جاذبِ نظر شخصیت سے خاصی مرعوب ہونے کے باوجود، کافی حد تک سنبھل کر پُراعتماد ہو چکی تھی۔ زرینہ اور بتول کی معیت میں وہ بتول کے بیڈروم میں آ کر براجمان ہو گیا۔ بتول نے آنکھ کے اشارے سے زرینہ کو باہر بھیج دیا۔ تنہائی پاتے ہی بولی۔ ”سر! میں نہیں جانتی کہ میں جو کہنے جا رہی ہوں، مناسب بھی ہے یا نہیں۔“

وہ تسلی دینے کے انداز میں گویا ہوا۔ ”بتول صاحبہ! آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔ نتیجے کی پرواہ کئے بغیر کھل کر کہیں گی تو میں زیادہ اچھے طریقے سے آپ کی مدد کر سکوں گا۔ رہی بات مناسب یا غیر مناسب کی، تو وہ حد آپ پار کر چکی ہیں۔ مجھے اپنے پاس بلا چکی ہیں۔“

وہ چند لمحے اُسے دیکھتی رہی۔ دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کرتی رہی پھر بولی۔ ”میرے ابا جی کو قتل کیا گیا ہے۔ قتل کرنے والا کون ہے؟ میں نہیں جانتی۔ اِس ضمن میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ اگر میرے کام آئیں گے اور میرے دکھ کو اپنا دکھ جان کر دل میں دفن کر دیں گے تو میں تمام عمر آپ کی ممنون رہوں گی۔ اگر مجھے تماشا بنا کر بیچ چوراہے لٹکا دیں گے تب بھی میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بچانے والی چیزیں میں پہلے ہی لُٹا چکی ہوں۔“

وہ استعجاب اور اضطراب آنکھوں میں لئے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اَب تک اُس نے نہ سمجھ میں آنے والی باتیں کی تھیں۔ وہ بولا۔ ”مجھ پر اعتماد کیا ہے تو اپنے اعتماد کو برقرار بھی رکھیں۔ اور ہاں! میرا خیال ہے کہ ہمیں دوستی کا ماحول قائم کرنے کیلئے آپ جناب، سر اور صاحبہ جیسے لفظوں سے چھٹکارا پا لینا چاہیے۔“ پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم بے جا تکلف کو چھوڑ دو۔ میں ملک امجد فرید ہوں، تم بتول ہو، بس......“

وہ آنکھیں چُرا کر اُٹھی اور بک شیلف میں پڑی نوٹ بک اُٹھا لائی۔ تحریر کا پہلا صفحہ کھول کر کاپی اُس کی گود میں رکھ دی۔ کہنے کے باوجود اتنا جلد بے تکلف نہیں ہو سکتی تھی۔ لہجہ مؤدب رکھتے ہوئے بولی۔ ”بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں زبان پر لانا کسی بھی لڑکی کیلئے ناممکن ہوتا ہے۔ ایسی ہی باتیں میں نے یہاں لکھ دی ہیں۔ آپ جب تک پڑھیں

گے، میں باہر رہوں گی۔ جب آپ کے سامنے آؤں تو آپ مجھے شرمسار کرنے کی بجائے اِس سے آگے کی بات کریں گے۔ اِز اِٹ اوکے سر؟"

"اوکے!" اس نے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔ وہ پلٹ کر دروازے تک آئی۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے ملک امجد فرید کو دیکھا اور لہرا کر باہر چلی گئی۔ یوں لگا جیسے جاتے ہوئے اُس نے اپنے عکس کو دروازے میں ٹھہرا دیا ہو۔ چند لمحے تک ملک اُس عکس کو دیکھتا رہا پھر کاپی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ عادتاً ہونٹ کاٹتے ہوئے پڑھنے لگا۔ چند ہی سطروں کو پڑھنے کے بعد اُسے پتہ چلا کہ اُس کے ہاتھ میں محبت نامہ نہیں تھمایا گیا، زندگی کی ایک لاینحل الجھن پر مشتمل نہایت دشوار پرچہ حل کرنے کیلئے دیا گیا تھا۔ اُس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال سا بن گیا۔ گزشتہ دو سالوں سے وکیلوں کی لکھی ہوئی درخواستوں اور کچلے مسلے گئے واقعات کو پڑھنے والے کے سامنے سچی تحریر رکھ دی گئی تھی جسے کسی وکیل نے نہیں، بلکہ مدعی نے گھر بیٹھ کر پیش کیا تھا۔ وہاں سو جھوٹ سن کر ایک حقیقت ملتی تھی، یہاں ایک فقرے میں چھپی ان گنت سچائیاں آنکھوں کے سامنے لہرانے لگی تھیں۔

وہ بہ کثرت مطالعہ کرنے کا عادی تھا۔ بتول کے آنے سے قبل وہ نہ صرف دو مرتبہ پڑھ چکا تھا بلکہ اس سے آگے کی سوچ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے اُس کے قریب آ بیٹھی۔ آزردہ لہجے میں آہستگی سے بولی۔ "سر! میں نے اپنی آپ بیتی آپ کو پڑھا دی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ آپ میری مدد کر سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ کس حد تک میری مدد کی جا سکتی ہے۔ میں کسی سے کھل کر کہہ بھی نہیں سکتی کہ میرے باپ کو قتل کیا گیا ہے۔ یقین دلانے کیلئے مجھے یہی کہانی سنانا ہو گی جو میرے لئے تو کیا، کسی کیلئے بھی ممکن نہیں ہے۔"

وہ ایک طویل سانس لے کر اُسے دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا کہ اس نازک اندام لڑکی نے پوری دنیا میں اپنی مدد کیلئے اُسے ہی کیوں چنا تھا؟

زرینہ نے کمرے میں داخل ہو کر اُن کے سامنے خاموشی سے چائے رکھ دی اور الٹے قدموں کمرے سے نکل گئی۔ وہ چائے پینے کے دوران تیزی سے سوچنے لگا۔ خاصی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ کپ رکھتے ہوئے بولا۔ "بتول! خدا جانے میں تمہاری امیدوں پر پورا اترتا ہوں یا نہیں۔ یہ ضرور کہتا ہوں کہ تم بہت مختلف لڑکی ہو۔ تم سے مل کر مجھے خوشی ہوئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے بارہا دیکھا ہے کہ اِن مرحلوں سے جبراً گزاری جانے والی لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں۔ تمہارے حوصلے سے متاثر ہوا ہوں۔"

ملک امجد فرید کا لہجہ ڈھارس بندھانے والا تھا۔ بدستور نظریں جھکائے ہوئے بولی۔ "سر! میں نے بھی بارہا ایسا کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ اِس لئے خودسوزی نہیں کی کہ جن انگلیوں کے اُٹھنے کے خوف سے میں موت کو گلے لگاتی، وہ انگلیاں میرے مرنے کے بعد میرے خاندان پر اُٹھنے لگتیں۔ خودکشی سے سچی اور جھوٹی بہت سی داستانیں پھیل جاتی ہیں۔"

وہ ستائشی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ نہ صرف پڑھی لکھی لڑکی تھی بلکہ سمجھ دار اور حوصلہ مند بھی تھی۔ بولا۔ "تم نے جزئیات پر خاصی توجہ دی ہے مگر اس کے باوجود کوئی کلیو موجود نہیں ہے۔ ویگن کا نمبر اور سفید رنگ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ لامحالہ بات یہ ہے کہ واردات کرنے والوں نے نمبر پلیٹ بدل دی ہوگی۔ ملک کی سڑکوں پر نوے فیصد ویگنوں کا رنگ سفید ہے۔ تم نے بڑی تفصیل سے اغواکاروں کے حلیے لکھے ہیں۔ حلیے ایک سے ہوتے ہیں۔ سیلولر فون نمبر سے کچھ مدد نہیں مل سکتی۔"

وہ امید بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"ایک صورت مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔" وہ عینک اُتار کر رومال سے آنکھیں صاف کرتا ہوا بولا۔ "جس کوٹھی میں تم دونوں بہنوں کو لے جایا گیا، اُسے تلاش کیا جائے۔ مل جانے پر وہیں سے تفتیش کا آغاز کیا جائے۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ اُسے سنتی رہی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اغوا کرنے کا طریقہ کار نیا ہے۔ کم از کم میں نے آج تک سنا پڑھا نہیں ہے۔ ایک نکتے پر غور کرو۔ کیا چوہدری صاحب کوئی ایسا کام کرنے چلے تھے جس سے کسی کو تکلیف پہنچ سکتی ہو؟"

وہ بولی۔ "آپ کے ابو اُنہیں یونین کونسل کے ناظم کے انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کر رہے تھے۔ انہوں نے حامی بھی بھر لی تھی۔ سردار فضل خان چاہتا تھا کہ ابا جی اُن کی پارٹی کے پلیٹ فارم پر الیکشن لڑیں۔ ابا جی اور انکل نہیں مانتے تھے۔"

"کیا سردار فضل نے کوئی دھمکی دی تھی؟"

"نہیں!" وہ سوچ کر بولی۔ "کم از کم میرے علم کے مطابق اُس نے کوئی دھمکی نہیں

دی تھی۔"

وہ چند لمحے بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر نوٹ بک اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے دروازے پر رُک کر بولا۔ "اگر تم اجازت دو تو میں یہ کاپی ساتھ لے جاؤں۔ میں اِسے ایک مرتبہ پڑھنا چاہتا ہوں۔"

وہ اضطراب کے عالم میں انگلیاں چٹخانے لگی۔ منہ سے نکلے ہوئے لفظ ہوا میں گم ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کندہ ہو کر دستاویز بن جاتی ہے۔ وہ سمجھا شاید انکار کر رہی، بولا۔ "بتول! میں ایک ذمہ دار انسان ہوں۔ نہیں جانتا کہ تم نے مجھ پر اتنا اعتماد کیوں کیا مگر یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ تم نے مجھے ہمراز بنا کر ثابت کر دیا ہے کہ تمہیں مجھ سے زیادہ پیارا دنیا میں کوئی نہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟"

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ وہ قریب آ کر بولا۔ "کچھ نہ کہو۔ اَن کہی سننے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ دشمن تم سے رابطہ کریں گے۔ تم نے اُن سے بگاڑ پیدا نہیں کرنا بلکہ مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی قدم اُٹھانا۔ میں ایک دو ماہ کی چھٹی لے کر دو یا تین دن کے بعد آؤں گا اور پھر دونوں مل کر اِس پر کام کریں گے۔"

وہ دیکھ رہا تھا کہ بتول کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ اب تک وہ بڑے حوصلے میں تھی۔ اب حوصلہ جواب دیتا جا رہا تھا۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "کہتے ہیں کہ ہاتھ کا لکھا کسی کے حوالے کرنا ہاتھ کاٹ کر دینے کے برابر ہوتا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر آپ کے حوالے کر دیے ہیں۔ صرف اِس برتے پر کہ انکل فرید ہمیشہ ابا جی کو اپنا بھائی کہتے تھے۔ مجھے بیٹی کہہ کر میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ میں بس یہی کہہ سکتی ہوں۔"

نادان نہیں تھا، سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ بولا۔ "او کے! میں بہت زیادہ محتاط رہوں گا۔ تمہارے ساتھ ہوں، تم خود کو تنہا خیال نہیں کرو گی۔ اِس احساس کو تقویت دینے کیلئے میں فون پر تم سے مسلسل رابطہ رکھوں گا۔ آئی کیئر اباؤٹ یو مس بتول!"

دلاسہ دے کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑی رہی۔ چشمِ تصور میں اُسے اپنے قریب کھڑا دیکھتی رہی۔ اُس کے لباس سے پھوٹتی ہوئی پرفیوم کی دل آویز خوشبو ابھی تک کمرے میں بھری ہوئی تھی اور اُس کی موجودگی کا ثبوت دے رہی تھی۔ ساری خوشبو کو ایک ہی سانس میں اپنے اندر اُتارنے کی کوشش کرتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوچنے لگی۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا، میں نے کوئی غلطی نہیں کی مگر سزا مل گئی۔ شاید زرینہ ٹھیک کہتی تھی کہ مجھے امجد فرید سے ایسی باتیں نہیں کہنا چاہئیں تھیں۔"

پھر سر جھٹک کر بڑبڑانے لگی۔ "اب تو جو ہونا ہے، ہو کر رہے تو اچھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ میں اِس کی نظروں سے گر جاؤں گی۔ ایک شخص کے سامنے جھکنا، پوری دنیا کے سامنے ننگا ہونے سے کہیں بہتر ہے۔"

زرینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کے قریب آ کر بولی۔ "باجی! کیا رہا؟"

وہ زرینہ کو سینے سے لگا کر سسکنے لگی۔ ساتھ ساتھ اُسے ملاقات کی تفصیل سنانے لگی۔

پڑھا تھا کہ عورت عہدِ حاضر میں مرد کے شانہ بشانہ چل رہی ہے۔ تجربہ یہ ہوا تھا کہ ساتھ ساتھ چلنے کے باوجود عورت کو اپنے شانے بچانا پڑتے ہیں۔ وہ ٹکر کی متحمل اب تک نہیں ہو سکی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ کار کا دروازہ کھول کر کھڑی تھی۔ دیر ہونے کی وجہ سے بار بار کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عالمگیر نے ڈرائیور اور گارڈ کو کوٹھی پر تعینات کر دیا تھا۔ شانی کی حفاظت کیلئے اُس نے فقط اپنے بازوؤں پر اکتفا کیا تھا۔ ڈرائیور اور گارڈ روزانہ شانی کے نیچے اُترنے کا انتظار کرتے تھے، وہ عالمگیر کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پیچ و تاب کھا کر سوچ رہی تھی۔ ''پاپا نے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ دس منٹ سے کھڑی اُس نواب کے بچے کا انتظار کر رہی ہوں اور وہ ہے کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔''

وہ فطرتاً انتظار کروانے والی تھی۔ ستا کر لطف کشید کرتی تھی۔ آج زیرِ مشق آ کر پچھتا رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر کار تک پہنچا اور اُسے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''شانی پلیز!''

وہ سیٹ پر بیٹھ کر منہ بسورنے لگی۔ نوکر اُسے شانی کہہ کر مخاطب ہوا تھا۔ گیٹ سے نکل کر بولی۔ ''تم نے مجھے شانی کیوں کہا؟''

''برا لگا تو آئندہ احتیاط کروں گا۔'' اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر لاپرواہی سے جواب دیا۔

''تمہارے پاس گن نہیں ہے کیا؟''

''گن کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''میرے پاس ہر وقت سائیلنسر لگا ریوالور موجود رہتا ہے۔ تمہیں فکر کرنے یا ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

اُس نے جواب نہیں دیا۔ شیشے سے باہر جھانک کر بھاگتے ہوئے شہر کو دیکھنے لگی۔

سوچنے لگی کہ گارڈ کی گن کی موجودگی میں اُسے سڑک پر سے اُٹھا لیا گیا۔ نہ دکھائی دینے والا پستول خاک تحفظ فراہم کرے گا۔ کندھے اچکا کر بڑبڑائی۔ ''شاید میں ہی غلط انداز سے سوچتی ہوں۔''

عالمگیر کو پہلی مرتبہ قریب سے دیکھا تھا۔ بہت دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اونچا لانبا قد، چوڑی چھاتی اور ٹھوس وجود۔ شکل سے معصوم دکھائی دیتا تھا۔ پہلی مرتبہ دیکھ کر سوچا تھا کہ پاپا جھوٹ بولتے ہیں۔ اِس شخص میں اتنی خوبیاں نہیں ہو سکتیں جتنی بتلائی جاتی ہیں۔

پارکنگ میں کار روک کر وہ نیچے اُتر کر کھڑا ہو گیا۔ وہ انتظار میں تھی کہ اُس کا دروازہ کھول کر مؤدب انداز میں باہر آنے کا اشارہ کرے گا۔ اُس نے ایسا نہیں کیا تو جھلا کر باہر نکلی اور بولی۔ ''میری سائیڈ کا گیٹ کیوں نہیں کھولا تم نے؟''

وہ چونک کر اُس کی جانب مڑا۔ حسن پر غصے کی پان چڑھی دیکھ کر زیرِ لب مسکرا کر بولا۔ ''اِس میں خفا ہونے کی کوئی بات نہیں مس شاہانہ! تم بچی نہیں ہو کہ اپنے ہاتھوں سے دروازہ کھول ہی نہ سکو۔''

ایک ہی فقرے میں اُسے دو بار جھٹکے کا شکار ہونا پڑا تھا۔ اُس نے حکم نہیں مانا تھا، شانی کہنے سے روکنے پر مس شاہانہ کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔ وہ ادب سے بی بی کہلائے جانے کی عادی تھی۔ غصے کے عالم میں ہونٹ کاٹتے ہوئے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ''مس شاہانہ! میں جانتا ہوں کہ تمہارا مزاج خاصا شاہانہ واقع ہوا ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ آج کل ہر انسان اخلاقی طور پر برابری کی سطح پر براجمان ہو چکا ہے۔ تم مجھے بطور زر خرید غلام نہیں، بطور محافظ قبول کر چکی ہو۔ محافظ دوست ہوتا ہے۔ دوست سے بے تکلفی برتی جاتی ہے اور احترام دے کر احترام طلب کیا جاتا ہے۔''

وہ پیر پٹختے ہوئے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔ عالمگیر نے پیچھے سے آواز دے کر روکا۔ قریب پہنچ کر بولا۔ ''کیا میں یہیں رہ کر تمہارا انتظار کروں؟''

وہ تیوری چڑھا کر بولی۔ ''تو اور کیا؟''

''او کے مس شاہانہ!'' وہ اُس کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں مس کال دیتا ہوں۔ میرا نمبر فیڈ کر لینا۔ ضرورت پڑنے پر مجھے بلا لینا۔''

وہ تضحیک انگیز لہجے میں بولی۔ ''کنٹین سے چائے یا کافی منگوانے کیلئے تمہیں فون

کروں گی؟"

وہ ہنسنے لگا۔ بولا۔ "میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں حفاظت کے نقطہ نظر سے کہہ رہا ہوں۔"

وہ چند لمحے کھڑی اُسے گھورتی رہی پھر پلٹ گئی۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی کہ فون کا بزر بولنے لگا۔ رُک کر پرس میں سے فون نکالا۔ سکرین پر اجنبی نمبر دکھائی دیا۔ مُڑ کر کار سے ٹیک لگا کر کھڑے عالمگیر کو دیکھا۔ اُس نے اشارہ کیا۔ اشارے سے سمجھ گئی اُسی نے مِس کال دی ہے۔ فون پرس میں ڈال کر کلاس کی طرف بڑھ گئی۔ سوچا کہ کلاس میں آرام سے بیٹھ کر اُس کا نمبر فون کی میموری میں محفوظ کر لے گی۔

سمیرا آدھا گھنٹہ لیٹ پہنچی۔ شانی نے سرگوشی کی۔ "تم کہاں اَٹکی رہی ہو اَب تک؟"

وہ بولی۔ "تمہارے نئے ڈرائیور کو دیکھتی رہی ہوں۔ ہائے! کیا پرسنالٹی ہے اُس کی۔ جی چاہتا ہے کہ باڑ کے پیچھے بیٹھ کر اُسے گھنٹوں دیکھتی رہوں۔"

وہ مصنوعی خفگی سے اُسے گھورتے ہوئے بولی۔ "شرم کیا کر۔"

پیریڈ فری ہونے تک کلاس کی تمام لڑکیوں تک سمیرا کی سرگوشی پہنچ چکی تھی۔ سبھی کلاس روم سے نکل کر گراسی پلاٹ میں آ گئیں۔ سعدیہ اُس کی گاڑی کے قریب گئی۔ ڈرائیور سے کچھ پوچھا۔ چند باتیں کر کے واپس آئی اور انگوٹھے اور انگلی کو جوڑ کر ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ "ہائے سمیرا! تم نے سچ کہا تھا۔ ایک دم فنٹاسٹک ہے!"

ہم جولیوں کی باتیں سن کر وہ سوچنے لگی۔ سب ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ پوری کلاس کی رئیس سمیت کوئی بھی اُس کے سامنے کھڑا اچھا نہیں ہے۔ ہائے کاش! وہ میری طرح بڑے باپ کا بیٹا ہوتا۔

سعدیہ اُس کے پہلو میں کہنی چبھو کر متوجہ کر رہی تھی۔ وہ بولی۔ "کیا ہے؟"

"پڑھا لکھا لگتا ہے۔"

"ہاں! پاپا نے بتلایا تھا کہ وہ سول انجینئر ہے۔"

"تمہارے ہاتھ کہاں سے لگ گیا؟" سمیرا نے پوچھا۔

"میرے ہاتھ نہیں، پاپا کے ہاتھ لگا ہے۔ تین سال سے ہمارے ہاں نوکری کر رہا ہے۔" وہ پر تفاخر انداز میں گویا ہوئی۔

"سنو بھئی اِس کی بات...... توجہ سے!" سمیرا نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہم اُس کی ایک جھلک دیکھ کر آپوں آپ ہٹ ہو گئی ہیں جبکہ اپنی ملکہ عالیہ تین سالوں سے اُسے دیکھ رہی ہیں اور پسیجی تک نہیں۔ ارے واہ! کیا شان بے نیازی ہے۔"

شاید اُسے چھیڑے جانے کا سلسلہ جاری رہتا مگر کلاس روم کے دروازے میں کھڑی نادیہ انہیں ہاتھ لہرا لہرا کر بلانے لگی تھی۔ وہ اُٹھ کر کلاس روم کی طرف چل دیں۔

فارغ ہو کر کار تک پہنچی تو عالمگیر کو غائب پایا۔ کار میں بیٹھنا چاہتی تھی مگر ڈور مقفل تھا۔ ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ گراسی پلاٹ کے آخری سرے پر ایستادہ درخت کے نیچے بازو سر کے نیچے رکھے لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے آواز دی۔ وہ متوجہ نہیں ہوا یا بیدار نہیں ہوا۔ اُس کے سر پر پہنچ کر بولی۔ "اے! کیا یہ سونے کا وقت ہے؟"

وہ آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ اُسے کوئی جواب دیے بغیر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ گیٹ اَن لاک کر کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "سیدھا گھر جانا ہے؟"

وہ بولی۔ "ہاں!"

گاڑی چل دی۔ وہ اُسے دیکھنے لگی۔ ہم جولیوں نے اُس پر باور کرا دیا تھا کہ وہ دیکھنے کے لائق تھا۔ سوچنے لگی۔ "پاپا کہتے ہیں کہ یہ دوسرے ملازموں سے قدرے مختلف ہے۔ یہ تو بہت زیادہ مختلف ہے۔ مجھے اِس کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔"

خود کو ملامت کرنے لگی۔ پڑھ رکھا تھا کہ انسان برابر ہوتے ہیں۔ بڑے چھوٹے کا فرق دولت کے میزان پر نہیں نکالا جاتا۔ تھوڑا جھجک کر بولی۔ "عالمگیر! میں اپنے صبح والے رویے پر نادم ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں یہ رائے قائم کی تھی کہ تم بڑے باپ کی خاصی بگڑی ہوئی اور مغرور بیٹی ہو اور تمہارے ساتھ خاصا خراب وقت گزرے گا۔ تمہاری ندامت دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کر لیتا ہوں۔"

وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔ "تم نے کوئی سرکاری نوکری کیوں نہیں کی؟"

"ملی نہیں۔"

"کیا اَب بھی کوشش کر رہے ہو؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"اَب پیٹ بھرنے لگا ہے۔"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"نہیں ہے۔"

وہ بھونچکا رہ گئی۔ پُر استعجاب لہجے میں بولی۔ "نہیں ہے...... کیا مطلب؟ تمہارے گھر والے کہاں رہتے ہیں؟"

وہ دائیں ہاتھ کی شہادت انگلی کار کی چھت سے لگاتے ہوئے بولا۔ "اوپر...... اللہ کے پاس!"

"کیا سبھی......؟"

"ہاں سبھی مر چکے ہیں۔ تسلی کی بات یہ ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی بھی نہیں جسے ملنے کا مجھے اشتیاق ہو، جس کی کمی محسوس کروں، جسے میری پرواہ ہو یا مجھے اُس کی فکر ہو۔" وہ عام سے لہجے میں بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ تعجب سے بولی۔ "کیا تمہیں میری بھی فکر نہیں ہے؟ پاپا تو کہہ رہے تھے کہ عالمگیر کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ پاپا نے تو یہ بھی کہا تھا کہ میری جانب اُٹھنے والی انگلی کو کاٹ دو گے جبکہ تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں کسی کی فکر نہیں ہے۔"

وہ مسکرانے لگا۔ بیک مرر میں اُسے دیکھ کر بولا۔ "مس شاہانہ! یہ میری ڈیوٹی ہے۔ میں اپنا فرض پوری ایمانداری سے نبھاؤں گا۔ تمہاری قسمت میں اگر کوئی تکلیف لکھی ہوگی تو تمہیں ضرور ملے گی۔"

وہ اُس کی کہی ہوئی بات کو سوچنے لگی۔ نہ سمجھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "کیا تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہیں میری پرواہ نہیں ہے؟"

"دل سے کہو۔ تمہیں میری پرواہ ہے؟" جواب دینے کی بجائے اُس نے سوال داغ دیا۔ وہ گڑبڑا گئی۔ جلدی میں کہنے لگی تھی کہ۔ 'ہاں! مجھے تمہاری پرواہ ہے؟'...... کہنے کی بجائے دل میں سوچنے لگی کہ مجھے کیوں اس کی پرواہ ہونے لگی۔ یہ میرا لگتا بھی کیا ہے؟

شاہانہ کو خاموش پا کر اُس نے کہا۔ "سچ بات تو یہ ہے کہ جو تمہیں پیار کرتا ہے، وہی تمہاری پرواہ کر سکتا ہے، میں نہیں۔"

وہ خاموش ہو کر نچلے ہونٹ پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ لپ سٹک کی تہہ کی وجہ سے انگلیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا لمس بھی اجنبی سا لگتا تھا۔ اِسی دوران گاڑی کوٹھی میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی تھی۔ اُس کے اُترنے سے پہلے ہی عالمگیر گاڑی سے اُتر کر گیٹ کی طرف بڑھ چکا تھا جہاں گارڈ اپنی گن اُٹھائے گیٹ بند کر رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر پاپا کو فون کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ "پاپا! عالمگیر کہہ رہا ہے کہ اُسے میری پرواہ نہیں ہے۔ یہ آپ نے کس قسم کا بندہ میرے سر پر مسلط کر دیا ہے؟ مجھے نہیں لگتا کہ وہ میرے ساتھ مخلص ہوگا۔"

پاپا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پاپا کی جان! تم فکر نہ کرو۔ وہ ایسا ہی ہے۔ خدانخواستہ کوئی پرابلم سامنے آئی تب تمہیں اُس کی خوبیوں کا پوری طرح علم ہوگا۔"

"وہ مجھے ایسے ٹریٹ کرتا ہے جیسے میں اُس کی مالکن نہیں، کوئی دوست ہوں یا کوئی عام سی لڑکی ہوں۔"

"بابا بس کرو ناں!" پاپا نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں نے کہا ناں کہ وہ ایسا ہی ہے۔ مجھے بھی اپنا یار بیلی سمجھ کر مخاطب کرتا ہے۔ وہ زبان سے نہیں، دل سے عزت کرنے کا قائل ہے۔"

وہ طویل سانس لے کر بولی۔ "اور تو اور...... پاپا! اُس نے گارڈ اور ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ کہنے لگا کہ میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ اپنے ساتھ گن کی بجائے چھوٹا سا پستول لے کر گیا تھا۔"

باپ ہنستے ہنستے اُسے سمجھانے لگا۔ جو کچھ وہ جانتا تھا، اُس کی بیٹی نہیں جانتی تھی۔ باپ نے دریافت کیا۔ "جو لوگ تمہارا تعاقب کرتے تھے، اُن میں سے کوئی آج کے دن میں تمہیں دکھائی دیا؟"

اُسے مجبوراً جھوٹ بولنا پڑا۔ "نہیں پاپا! میں نے آج کسی کو نہیں دیکھا۔"

"پھر خود ہی سمجھ لو۔ عالمگیر کے آنے پر سبھی دُم دبا کر بھاگ گئے ہیں۔ یہی اُس کی خوبی ہے۔"

اُس نے "ہونہہ" کہہ کر فون بند کر دیا۔ باپ عالمگیر کی طرفداری کا جھولا جھلاتے ہوئے بیٹی کی بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد آ کر بیڈ پر دراز ہوگئی۔ جی چاہا کہ سی ڈی چلا کر دیکھے۔ ہمت نہ

ہوئی۔ بے حیائی کی داستان بار بار پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ٹی وی آن کر کے کیبل پر چلنے والے چینل کنگھالنے لگی۔ دل کسی دلچسپی کو مان کر ہی نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں اُس کا فون بجا۔ اُٹھا۔ نمبر دیکھا تو ماتھے پر بل پڑ گئے۔ کان سے لگا کر بولی۔ ''ہاں! بول رہی ہوں۔''

دوسری طرف سے وہی بھنچی بھنچی مخصوص آواز اُبھری۔ ''میرے روکنے کے باوجود تم نے عالمگیر کو خود سے چمٹا لیا ہے۔ ہم اُسے آگ پر رکھیں گے تو تم بھی جل جاؤ گی۔''

آج اُسے نسبتاً کم ڈر لگ رہا تھا۔ لہجے میں بے پرواہی سمو کر بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم لوگ عالمگیر سے ڈرتے ہو۔ اَب ہمت پکڑو اور سامنے آؤ تو جانوں کہ کس میں دَم ہے اور کون دُم دبا کر بھاگتا ہے۔ ایک لڑکی سے بدمعاشی کر کے طرم خان بننے والے کمینو! دوبارہ مجھے فون نہ کرنا ورنہ بہت برا پیش آؤں گی۔''

وہ کچھ کہنے لگا تھا کہ شاہانہ نے فون کان سے ہٹا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر بیل بج اُٹھی۔ اُس نے فون کو پاور آف کر دیا۔ وہ اُس کی دھمکیوں کو سننا نہیں چاہتی تھی۔ فون بیڈ کی سائیڈ پر پھینک کر ٹی وی کی سکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایسے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے بلند آواز میں کہا۔ ''اندر آ جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔''

عالمگیر کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اُس نے سوچا تھا کہ دروازے پر رحمت بی دستک دے رہی ہوگی۔ وہ صوفے میں بیٹھ کر بولا۔ ''مس شاہانہ! تکلیف دینے پر معافی چاہتا ہوں۔ آنا ضروری تھا کیونکہ ابھی تک تم نے خود سے درپیش مسئلے کو ڈسکس نہیں کیا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کس قسم کے خطرات سے دوچار ہو؟''

وہ کمبل کی سرخ بُردار پٹی کے ساتھ کھیلتے ہوئے سوچنے لگی کہ اُسے کیا بتائے اور اُس سے کیا چھپائے۔ پاپا کو جھوٹ بول کر اُس نے عالمگیر کو یہاں بلوایا تھا۔ اَب اُسے مطمئن کرنا ضروری تھا ورنہ وہ سامان باندھ کر رخصت ہو جاتا۔ تجربہ ہو چکا تھا کہ اُس کی موجودگی میں اُسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''میں تمہارے سوالوں کے تسلی بخش جواب تو نہیں دے سکتی مگر اتنا بتلا سکتی ہوں کہ گزشتہ دو ہفتوں میں سفید رنگ کی ٹویوٹا کار میں چند اوباش گھر سے کیمپس اور کیمپس سے گھر تک میرا پیچھا کرتے رہے ہیں۔ تمہارے آنے پر وہ کار کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کون لوگ ہیں، کیا چاہتے ہیں اور مجھے کس قسم کا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عالمگیر اُسے ایک ٹک دیکھنے لگا۔ اُس کی نگاہیں اُسے بدن پار کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ گھبرا کر نظریں چرا گئی۔ آہستگی سے بولی۔ ''تم شاید میری بات پر یقین نہیں کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''نہیں مس شاہانہ! ایسی بات نہیں ہے۔ گاڑی کا نمبر یاد ہے تمہیں؟''

وہ بولی۔ ''میں نے دیکھا ہی نہیں۔ شاید نمبر پلیٹ سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔''

''تم جھوٹ بولتے ہوئے اچھی نہیں لگ رہی ہو۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر چیخ کر بولی۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔''

وہ مسکرانے لگا۔ ''ہاں مس شاہانہ! اپنے جھوٹ کو سچ کی چادر اوڑھاتے ہوئے اگر ڈرائیور اور گارڈ کو بھی ہم خیال بنا لیتیں تو میں تمہاری بات کو مان لیتا۔ وہ کہتے ہیں کہ بم بلاسٹنگ کے بعد تمہارے غیاب کے علاوہ کوئی پرابلم پیش نہیں آئی۔ کیا مجھے بتلا سکتی ہو کہ وہ پانچ چھ گھنٹے تم نے کہاں گزارے تھے؟''

اُس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ جس بات کو چھپانا چاہتی تھی وہ زبان کی نوک سے پکڑی جا چکی تھی۔ وہ بولی۔ ''میں ہسپتال میں بے ہوش پڑی رہی تھی۔ مجھے جب ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں...... اِسی بیڈ پر...... لیٹی ہوئی تھی۔''

''بالکل ٹھیک۔ اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتلا دو کہ کس ہسپتال کے کس وارڈ میں تمہیں رکھا گیا؟ تمہیں یہاں کون چھوڑنے آیا تھا؟''

وہ یاد کرنے لگی۔ یاد نہیں آیا تو زِچ ہو کر بولی۔ ''یہ تم مجھ سے کس انداز میں پوچھ گچھ کر رہے ہو؟ کیا دھماکہ سن کر بے ہوش ہو کر میں نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے؟''

وہ ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچنے لگا۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی بہت گہری چیز کو منظرِ عام پر لانے کی جہت میں مشغول ہو گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ نیم بیزار سے لہجے میں بولا۔ ''مس! میرا دل کہتا ہے کہ تم سے کوئی جرم سرزد کروا لیا گیا ہے۔ سرکاری ہسپتال اتنے فعال ابھی تک نہیں ہوئے کہ وہ ایک بے ہوش لڑکی کو اُٹھا کر ہسپتال لے جائیں۔ علاج معالجہ کر کے ایمبولینس میں ڈال کر اُس کے گھر پہنچا جائیں اور کوئی بل یا ٹپ وصول نہ کریں۔ بائی داوے! تمہارے پاس کوئی ایسی دستاویز موجود تھی جس سے ہسپتال والوں کو تمہارے گھر کا ایڈریس معلوم ہوا تھا؟''

وہ گھر چکی تھی۔ اُسے ماننا پڑا کہ عالمگیر نہ صرف بہت خوبرو بلکہ بہت زیادہ چالاک اور فطین بھی ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہرو! مجھے سوچنے دو۔ جب میں شاپنگ کیلئے گھر سے روانہ ہوئی تھی تو میرے پاس کوئی ایڈینٹیٹی نہیں تھی۔ خریداری کے بل شاپنگ بیگ میں تھے، میرے پاس نہیں تھے۔ او نو! واقعی یہ تو پریشانی والی بات ہے کہ انہیں میرا پتہ کہاں سے ملا؟''

وہ خاموشی سے اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ بری طرح گھبراہٹ اور اضطراب کا شکار ہو چکی تھی۔ خود کلامی کرنے لگی۔ ''ہائے اللہ! یہ مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے تم نے۔ اگر میں ہسپتال میں نہیں رہی تو پھر کہاں رہی؟ اس کا مطلب ہے کہ مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ پھر بغیر تاوان لئے اغوا کرنے والوں نے مجھے چھوڑ کیوں دیا؟''

دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بڑبڑائی۔ ''پلیز عالمگیر! مجھے کچھ دیر کیلئے تنہا چھوڑ دو۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

وہ اُٹھ کر دروازے تک آیا۔ پلٹ کر بولا۔ ''مس شاہانہ! جان بوجھ کر کچھ چھپاؤ گی تو سراسر اپنا نقصان کرو گی۔ مجھ پر پوری طرح کھل جانے کی صورت میں فائدے میں رہو گی۔ آگے تمہاری مرضی!''

وہ دروازے سے باہر نکل کر چند ثانئے تک کھڑا رہا۔ کمرے کے اندر...... کمرے کے باہر...... دونوں اداکار اپنے اپنے شارٹس کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ عالمگیر کے برعکس شاہانہ نے خاصی بھونڈی ایکٹنگ کی تھی۔ شرم سے گڑی جا رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اُس نے اپنے بیان کو فول پروف بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا تھا۔ کسی کو اُس پر شک نہیں ہوا تھا۔ خامی پکڑنے والے نے ایک نہیں، ان گنت چور خانے پکڑ کر اُسے چور بنا دیا تھا۔ جن باتوں پر اُس کے ڈرائیور اور گارڈ نے اطمینان کا سانس لیا تھا، انہی باتوں سے عالمگیر نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ بے اختیار بڑبڑائی۔ ''پاپا ٹھیک کہتے ہیں۔ عالمگیر عام آدمی نہیں ہے۔ مجھے اِس سے محتاط رہنا پڑے گا۔''

دوسری طرف عالمگیر اپنے بیڈ میں لیٹ کر شاہانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کی حماقتوں پر زیرِ لب مسکرانے لگا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ بیتی ہوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قیامت کو چھپا کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے مطمئن بیٹھی تھی کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ آگے عافیت ہی عافیت ہے۔ اچانک ذہنی رو بہک گئی۔ اُس کے قیامت انگیز وجود کو چشمِ تصور میں سجا کر بھٹکنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ فلم صرف ایک بار پوری دلچسپی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ فلم کو دوسری مرتبہ دیکھنے کی خواہش میں بے چین ہونے لگا مگر کمرے میں سی ڈی پلیئر موجود نہیں تھا۔

وہ عام لوگوں کی نسبت کم حسن پرست واقع ہوا تھا۔ جوان ہونے کے باوجود اُس نے کبھی عورت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور نہ ہی کوئی اُس کے خوابوں میں شب بھر کا عذاب بن کر اُتری تھی۔ شاہانہ کو متعدد بار دیکھا تھا۔ آج قریب سے دیکھنے پر پتہ چلا تھا کہ پہلی بار دیکھ رہا ہے۔ دیکھی ہوئی ہر چیز مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچے چلی جا رہی تھی اور وہ بے اختیار ہو کر کھنچا جا رہا تھا۔ یوں جیسے اُس کی کوئی مرضی ہی نہیں ہے، کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ بیڈ میں اُٹھ بیٹھا۔ لحاف اتار کر پائنتی کی جانب پھینک دیا۔ لمبے لمبے سانس سینے میں اُتار کر جھٹکے لیتی ہوئی گاڑی کا انجن ٹھنڈا کرنے لگا۔ بیڈ سے اُتر کر کمرے میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ٹہلنے لگا۔ دل کو چین نہیں آ رہا تھا۔ بے چینی کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

دل گھبرانے لگا۔ گھبراہٹ میں کمرے میں روشن واحد نیلے نائٹ بلب پر نظر پڑی تو ٹھٹک کر رُک گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ روشنی کا حالہ پھیلنے لگا ہو۔ اُس نے سر جھٹک کر غور سے دیکھا۔ نیلا حالہ خاصا پھیل چکا تھا۔ پھر ماں دکھائی دی۔ اُس کے سفید لباس پر نیلاہٹ طاری تھی۔

ایک حد تک آ کر رُک گئی۔ بولی۔ ''علم دین سے عالمگیر بننے والے شیطان! دیکھ لے کہ جس پھول کو تم نے اپنے گرگوں کے پیروں تلے روندا تھا، اُسی پھول نے تمہارے ذہن و بدن میں آگ لگا کر رکھ دی ہے۔ تمہاری غیرت کو امتحان میں ڈالنے والی تم سے کئی گز کے فاصلے پر لیٹی ہے اور اپنے بدن کے شعلوں سے تمہیں جلا رہی ہے۔ تمہاری قسمت میں اُس کے پیچھے لپکتے اور بھاگتے رہنا لکھا ہے۔ دم لئے بغیر بھاگتے رہو اور اپنی غیرت کے منہ پر جوتے مارتے رہو۔''

ہر کڑے وقت میں ماں اُس کی بے بسی کا تماشہ دیکھنے کیلئے آن وارد ہوتی تھی۔ وہ غصے

سے بولا۔ ''میری اپنی کچھ ترجیحات ہیں۔ تم مجھے بلاوجہ طعنے مت دیا کرو۔ مجھے اُس حرّافہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ اُس کے باپ کو نیچا دکھانے کیلئے اُسے استعمال کر رہا ہوں۔''

''احمق ہو۔ لوگ سُن کر سمجھ لیتے ہیں۔ تم دیکھ کر بھی نہیں سمجھ پاتے ہو۔ اپنے مَن کو ٹٹولو تو تمہیں صاف پتہ چل جائے گا کہ تم اُسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو رہے ہو جسے تم نے سینکڑوں فٹ پستی میں پھینک دیا تھا۔ تھوک کو چاٹتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ شرم تو شرم والوں کیلئے بنی ہے، تمہارے نزدیک کیا حیثیت رکھتی ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولا بلکہ ماں کے طعنے کو سن کر خود کو ٹٹولنے لگا تھا۔ کہیں ماں سچ نہ کہتی ہو۔ دل میں اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ کون اوپر، کون نیچے...... سردست کچھ پتہ نہیں چلا۔ ماں اُس کی خاموشی پر طنز کرتے ہوئے بولی۔ ''کیوں؟ تمہاری بولتی کیوں بند ہو گئی ہے عالمگیر؟ تمہیں کہتی تھی ناں کہ سچ کو آنچ نہیں پہنچتی۔ تمہارے ظلم کا شکار ہونے والی بتول ایک جاننے والے کو سچ بتلا رہی ہے۔ دونوں کے بیچ کوئی جھوٹ حائل نہیں ہے، دونوں کو ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ندامت نہیں ہوتی۔ تم جھوٹے ہو۔ تمہیں ملنے والی تم سے بڑی جھوٹی ہے۔ آمنے سامنے بیٹھ کر دونوں ہی جھوٹ بولتے ہو۔ ایک دوسرے کے جھوٹ پکڑتے ہو۔ یہ کیا زندگی ہے؟ اِس سے موت بھلی ہے۔ خدا کرے کہ تم ایسی زندگی جینے کی بجائے میری طرح موت کو گلے لگا کر میرے پاس پہنچ جاؤ۔''

پتہ نہیں ماں دعا دے رہی تھی، بددعا دے رہی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے چیخا۔ ''مجھے معاف کر دے میری ماں! دعا دو یا بددعا دو...... میں وہی کروں گا جو میں نے ٹھان رکھا ہے۔ تم ناوقت پریشان کر کے ٹمپو توڑ دیتی ہو۔ جاؤ! مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

ماں اُس پر ترحم آمیز نگاہ ڈال کر معدوم ہو گئی۔

اُس نے سر جھکا لیا۔ کبھی کبھی نظر چرا لینے سے مشکل گھڑیاں بن چھوئے گزر جاتی ہیں۔ اُس پر اُتری ہوئی قیامت بھی احسان کرتے ہوئے رخصت ہو گئی۔ جاتے ہوئے سمجھا گئی کہ بُرے کو کبھی اچھوں کی صحبت نہیں ملتی۔

دماغ تپش پکڑنے لگا تھا۔ ماں کی باتیں بھول کر وہ شانی کے خیال کی بھول بھلیوں میں سرگرداں ہونے لگا۔ نشہ اور جادو سر چڑھ کر بولتے ہیں۔ یہاں دونوں چیزیں اکٹھے حملہ آور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی تھیں۔ جوانی کا نشہ اور محبت کا جادو۔ وہ جتنا بھاگتا، اتنا ہی آگ پکڑے جنگل میں دور تک گھس جاتا تھا۔ بشیر خان نے ایک بار اُس سے دریافت کیا تھا کہ وہ کسی عورت کی محبت میں گرفتار تو نہیں۔ اُس کے انکار پر حیرت زدہ لہجے میں گویا ہوا تھا کہ پھر وہ بیٹھے بیٹھے اچانک گم کیوں ہو جاتا ہے؟...... اب بشیر خان کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ ہاتھ میں تھامی ہوئی مورتی اچھل کر دل میں پرا جما کر بیٹھ گئی تھی۔ بیٹھے بیٹھائے کو گم صم کیے دے رہی تھی۔ یوں کہ اطراف کی خبر بھی نہیں رہی تھی۔

سوچنے لگا کہ اُسے کیا ہو رہا ہے۔ آج تک ایسی کیفیت سے روشناس نہیں ہوا تھا۔ دیوار پر پوری قوت سے مکا مارا۔ تکلیف کا احساس ہوا۔ ایسے میں یاد آیا کہ جب کبھی ماں اپنے تفکرات سے چھٹکارا پانے میں ناکام رہتی تھی تو آخری حربے کے طور پر پانی کا بھرا ہوا جگ اپنے سر میں انڈیل لیتی تھی۔ دماغ ٹھنڈا ٹھار ہو جاتا تھا۔ وہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑا شیشے کا جگ اٹھا کر سوچنے لگا۔ ''سردی بہت ہے۔ کہیں نمونیا نہ ہو جائے۔ ماں کہتی تھی کہ سردی میں سر میں پانی ڈالنے سے سرسام ہو سکتا ہے۔ کہیں سرسام نہ ہو جائے۔''

اُس نے سرسام کا کوئی مریض نہیں دیکھا تھا مگر سرسام کے مرض سے ڈرتا تھا۔ اَن دیکھی شئے سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔ وہ دیوار تک گیا۔ مکا مارنے سے تکلیف ہوتی تھی۔ پانی سر میں ڈالنے سے سرسام ہونے کا خدشہ دل دہلا دیتا تھا۔ خود پر لعنت بھیجنے لگا۔ اتنا بزدل وہ کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ پانی کا اُدھ بھرا جگ اٹھا کر سر پر پلٹ ڈالا۔ پانی زیادہ ٹھنڈا نہیں تھا مگر اُس کے تپتے ہوئے بدن پر تیزاب کی طرح پڑا اور جہاں جہاں تک گیا، اپنی خبر دیتا گیا۔ کچھ پانی قدموں کے قریب قالین پر گر کر جذب ہو گیا تھا۔ کپکپی طاری ہو گئی مگر ہیجان تھم گیا۔ اُسے ماننا پڑا کہ ماں اپنے بدن کی منہ زور خواہشوں کو روندنے کیلئے پانی ڈالنے والا عمل ٹھیک ہی کرتی تھی۔

جگ میں تھوڑا سا پانی بچا تھا۔ اُس نے جگ منہ سے لگا کر پی لیا۔ کچھ پانی حلق میں اُترا، کچھ ہونٹوں کے گوشوں سے اُمڈ کر گردن سے ہوتا ہوا سینے تک پہنچ گیا۔ سینے کے گھنے بالوں میں سے راستہ بنا کر رینگتا ہوا پانی عجیب انداز سے بدن کو گدگدا رہا تھا۔ وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔

گیلے بالوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتا ہوا پانی ڈرپ کی نالی میں گرنے والے آبِ شفا کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں دروازہ بے آواز طریقے سے کھلا اور دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی شانی دکھائی دینے لگی۔ وہ چونک گیا۔ اِس وقت اُس کے کمرے تک چلے آنے کا سبب کیا تھا؟......

وہ حیرانی سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اتنی سردی میں گیلا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ جلدی سے سر کو اِدھر اُدھر جھٹک کر بالوں کو خشک کرنے لگا۔ جگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔ ’’مس شاہانہ! پلیز کم اِن۔‘‘

وہ اندر داخل ہوئی۔ آنکھوں سے استعجاب عیاں تھا۔ کمرے کے وسط میں ٹھہر کر بولی۔ ’’تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم نے سر میں پانی کیوں ڈالا؟‘‘

وہ بولا۔ ’’آگ بجھانے کیلئے پانی پھینکنا پڑتا ہے۔ تم نے کبھی فائر بریگیڈ والوں کو پائپ سے پانی چھڑکاتے نہیں دیکھا؟‘‘

وہ اتنی نادان نہیں تھی کہ اُس کی بات کو سمجھ نہ پاتی۔ کرسی پر پڑا تولیہ اُٹھا کر اُس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔ ’’آگ بجھ چکی ہے۔ اَب راکھ بھی پونچھ ڈالو۔‘‘

اُس نے چونک کر دیکھا۔ دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ آنکھیں ٹھہر کر اضطرابِ دل کی کیفیت بیان کرنے لگیں۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ’’تمہارے جانے کے بعد پھر مجھے سر میں پانی ڈالنا پڑے گا۔ اِس لئے مجھ پر کرم کرو اور اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔‘‘

اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یقین ہوگیا کہ اُس کے حسن نے عاشق کو جلا کر خاکستر کردیا تھا۔ اچانک ایک اور خیال نے اُس کی آنکھوں کی چمک کو نگل لیا۔ سوچنے لگی۔ ’’اپنے چاہنے والے کو اپنی کمزوری بیان کرنے کا نتیجہ بہت برا نکلتا ہے۔ میں جو کچھ کہنے کیلئے آئی ہوں، ابھی میرے سینے میں محفوظ ہے۔ اسے بے زبان ہی رہنا چاہیے۔‘‘

پلٹ کر کمرے سے نکلنے لگی۔ دروازے کے بیچ کھڑے ہوکر بولی۔ ’’میں تمہیں بتانے کیلئے آئی تھی کہ مجھے اغوا کرکے میرے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا۔ تم اپنے حواس میں نہیں ہو، اِس لئے جارہی ہوں۔‘‘

وہ تیز تیز قدم اُٹھا کر دروازے میں آیا۔ پہلو سے نکل کر سامنے کھڑا ہوکر بولا۔ ’’مس شاہانہ! میں اَب پوری طرح ہوش میں ہوں۔ چاہو تو بتلا سکتی ہو۔‘‘

وہ اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ جہاں اُس نے ہاتھ رکھا تھا، وہیں اپنا ہاتھ رکھ کر سوچنے لگا۔ ’’ماں ٹھیک کہتی تھی۔ گیلے بدن کو انگارے نے چھو کر پھر تپا دیا ہے۔ ایں...... یہ کیا ہوا؟ دل نے دھڑکنا کیوں بند کردیا ہے؟‘‘

وہ ڈر کر سینے کو ٹٹولنے لگا۔ دھڑکن کو محسوس کرکے مسکرانے لگا۔ جانے والی نظروں سے اوجھل ہوچکی تھی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ لحاف اوڑھ کر بدن کو حرارت پہنچانے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے لحاف کے باہر بدن تپ رہا تھا۔ اَب لحاف کی حرارت بھی کچھ نہ کر پارہی تھی۔ محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ سوچنے لگا۔ ’’کہتے ہیں کہ سوہنی ایک کچے گھڑے پر تیر کر چناب کا یخ پانی پار کرگئی تھی۔ پہلے دل نہیں مانتا تھا، آج ماننے لگا ہے۔ انسان پر ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ بدن کسی سردی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ شاید مجھ تک وہ وقت آن پہنچا ہے۔‘‘

رات پورے جہان پر ایک سی اُتری تھی مگر دونوں کمروں میں اُس کا استقبال الگ انداز میں ہورہا تھا۔

کار کوٹھی سے نکلی تو دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ وہ جھینپ کر بولی۔ ’’گاڑی کیوں روک لی ہے؟ چلو۔ پہلے ہی کافی دیر ہوچکی ہے۔‘‘

وہ اپنی توجہ سامنے مرکوز کرتے ہوئے ایکسی لیٹر پر پاؤں کا وزن بڑھانے لگا۔ منزل پر پہنچنے تک دونوں خاموش رہے۔ وہ اُترنے لگی تو قریب سے گزرتا ہوا رئیس رُک گیا۔ اُسے دیکھ کر ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔ ’’ویلکم مس شاہانہ فضل! آج میری طرح تاخیر سے پہنچی ہو۔‘‘ وہ اُس کے نزدیک پہنچ کر بولی۔ ’’ہائے رئیس! رات دیر تک فلم دیکھتی رہی اس لئے آنکھ دیر سے کھلی۔‘‘

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے قدم سے قدم ملا کر مرکزی عمارت کی طرف جارہے تھے۔ عالمگیر بڑی محویت سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ اُس کے لبوں پر چپکی ہوئی تھی۔ زیرِلب بڑبڑایا۔ ’’تو یہ ہے ملک زادہ...... رئیس...... میری مالکن کو دل کی ڈبیا میں بند کرکے سردار کی کروڑوں کی جائیداد ہڑپ کرنے کا منصوبہ بنانے والا۔‘‘ دونوں نگاہوں سے اوجھل ہوگئے اور وہ گراسی پلاٹ میں آبیٹھا۔ زیرِلب کوئی گیت

گنگنانے لگا۔

واپسی پر راستے میں اُس نے شاہانہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ''آج صبح جو شخص تمہیں ملا تھا، وہ ملک رئیس ہے ناں؟''

وہ نخوت سے بولی۔ ''میں کسی ملک کو نہیں جانتی۔ وہ میرا کلاس فیلو رئیس ہے۔''

وہ ہنسنے لگا۔

''کیوں ہنس رہے ہو؟''

''تمہاری کم عقلی پر ہنسی آ رہی ہے۔'' وہ پیچھے دیکھے بغیر بولا۔ ''اُس کے باپ کو پورا شہر جانتا ہے۔ ملک ظہور اسمبلی کا ممبر رہ چکا ہے۔ رئیس کا بڑا بھائی ملک انیس ظہور آج کل تخت پر براجمان ہے۔ کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر رال ٹپکاتا ہوا پیچھے پڑ جاتا ہے اور بس نہ چلنے پر اُٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہ رئیس بھی اپنے بھائی اور باپ پر گیا ہے۔''

وہ خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورنے لگی۔ دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔ پوچھنے لگی۔ ''تم اُسے جانتے ہو؟''

''جانتا ہوں، تبھی تو تمہاری کم عقلی پر ماتم کرتے ہوئے ہنس رہا تھا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''ملک رئیس ظہور بستی نور پور کے ملک فرید کا سگا بھتیجا ہے۔ حیرت ہے کہ آج تک اُس نے تمہیں بتلایا ہی نہیں۔''

غیر معمولی تحیر اُس کے چہرے پر ثبت تھا۔ بڑبڑائی۔ ''مجھے بھی حیرت ہے کہ اُس نے مجھے اب تک نہیں بتلایا۔ میں یہ تو جانتی تھی کہ وہ کسی بڑے سیاسی خاندان کا فرد ہے مگر یہ علم نہیں تھا کہ وہ ملک فرید کے بھائی کا بیٹا ہے۔ پاپا نے کئی مرتبہ مجھے ملک فرید کے بارے میں بتلایا تھا۔''

وہ بولا۔ ''تمہیں اِن لوگوں سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تمہارے باپ کی طرح یہ بھی لمبے ہاتھوں والے لوگ ہیں۔ انسان کو کتے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ سیانے کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی دوستی بھلی ہوتی ہے نہ ہی دشمنی۔ سانپ کی طرح کسی وقت بھی ڈس سکتے ہیں۔''

وہ الجھ گئی تھی۔ بمشکل خود پر قابو کیے بیٹھی تھی۔ گھر پہنچنے پر تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر مقید ہو گئی۔ عالمگیر نے اُس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اغوا کاروں کے بارے میں سوچنے لگی۔ فون پر رابطہ رکھنے والے کی باتوں کو دل ہی دل میں دہرانے لگی۔ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں اُس نے کہا تھا کہ وہ بڑے لوگوں کا کارندہ ہے۔ ایک موقع پر اُس نے۔ ''میرا ملک'' کہہ کر بتلانا چاہا تھا کہ وہ کسی ملک نامی شخص سے وابستہ ہے۔ وہ رئیس کے باپ ملک ظہور کا ناتا فون کرنے والے اغوا کار سے جوڑنے لگی۔ اپنے خدشات کو حتمی شکل دینے کیلئے اُس کے پاس کوئی دلیل یا ثبوت نہیں تھا۔ سیاسی باپ کی بیٹی ہونے کے ناتے سیاسی انداز سے ہی سوچ رہی تھی کہ رئیس کا خاندان پاپا کی مخالف سیاسی پارٹی کا اہم رکن ہے اور پاپا کو اپنی پارٹی کی دہلیز پر لانے کیلئے ایسے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔

دہکتے ہوئے جوان بدن کی مالکہ ہونے کے ناتے وہ رئیس کو بھی اِسی ترازو پر رکھ کر تولنے لگی تھی۔ وہ اُسے حاصل کرنے کیلئے ایسی رقیق حرکت کر سکتا تھا۔ پھر بے ساختگی سے سر کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے سوچنے لگی کہ اغوا کرنے کے بعد اُس نے تو اُسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ فلم میں وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ایک اور کریہہ خیال نے اُس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ عین ممکن تھا کہ درندے نے پہلے اپنا پیٹ بھرا ہو، پھر اپنے طفیلیوں کے سامنے اُسے پھینک دیا ہو۔ فلم صرف طفیلیوں کی بنائی گئی ہو۔

وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ جتنا سوچتی، اتنا ہی الجھنے لگتی۔ عالمگیر نے آ کر اُس کے باقی ماندہ چین کو بھی تہس نہس کر دیا تھا۔ بڑبڑائی۔ ''ہائے کاش! میں پڑھنے کیلئے یہاں آئی ہی نہ ہوتی یا میں نے پاپا سے سیکورٹی طلب ہی نہ کی ہوتی۔''

جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ ہونے والی کے بارے میں سوچنا فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ سردست اُس نے فیصلہ کیا کہ عالمگیر کے سامنے منہ بند رکھے گی تاوقتیکہ کوئی صورتِ حال واضح ہو جائے، کوئی لائحہ عمل بن جائے۔

سہ پہر کے قریب رحمت بی نے اُسے اطلاع دی کہ رئیس اُس سے ملنے کیلئے آیا ہے۔

وہ حیرانی سے بولی۔ ''کیا اکیلا آیا ہے؟''

''ہاں بی بی جی!'' رحمت بی نے کہا۔ ''میں نے اُسے بتلایا کہ بی بی جی آرام کر رہی ہیں، وہ بولا بہت ضروری کام ہے۔ ٹالنے پر ٹلا نہیں تو میں نے تمہیں تکلیف دی ہے۔''

''اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں آ رہی ہوں۔''

رحمت بی چلی گئی تو اُس نے جلدی جلدی خود کو تیار کیا۔ لباس کی شکنیں درست کرتے ہوئے نیچے آ گئی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہ اُس کا منتظر تھا۔ بولی۔ ''آؤ رکم! کیسے ہو؟''

اُس کے چہرے پر واضح طور پر پریشانی کے عکس لرزاں تھے۔ بولا۔ ''خیریت ہوتی تو یوں بھاگا چلا آتا؟''

دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ استفہامیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سر جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا پھر اُٹھ کر پُر اضطرار انداز میں ٹہلنے لگا۔ اُس کی حرکات و سکنات سے ذہنی انتشار اور پیش و پس مترشح تھی۔ چند لمحوں کے بعد اُس کی طرف پلٹ آیا۔ بولا۔ ''شاہانہ! زندگی میں کبھی بھی اتنا مشکل وقت مجھ پر نہیں آیا کہ میری زبان میرا ساتھ چھوڑ گئی ہو، میرا ذہن اپنا کام کرنا ترک کر دیا ہو۔ پہلی مرتبہ الجھا ہوں تو پتہ چلا ہے کہ مجھے سلجھنے اور سلجھانے کا طریقہ ہی نہیں آتا۔''

اُس کے انداز پر وہ بھی پریشان ہوگئی۔ گڑبڑا کر بولی۔ ''تمہاری مایوسی بھری باتیں سن کر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ پلیز کھل کر بات کرو۔''

اِسی سمے ڈرائیور چائے اور لوازمات سے لدی ٹرالی ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ چائے تیار کر کے میز پر رکھ کر الٹے قدموں کمرے سے نکل گیا۔ وہ کپ میں چمچ ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں خوابوں کو اہمیت نہ دینے والا انسان ہوں۔ خاصا حقیقت پسند واقع ہوا ہوں۔ تمہیں شروع سے پوری کہانی بتلاتا ہوں۔''

شانی سمجھ رہی تھی کہ وہ خود ابھی تک کسی نتیجے تک نہیں پہنچا تھا۔ تبھی اُس کی گفتگو بے ربط محسوس ہو رہی تھی۔ خاموش رہ کر اُسے اظہار کیلئے الفاظ مرتب کرنے کا موقع دیتی رہی۔

''میرا باپ ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کا اہم ترین رکن ہے۔ میرا بھائی بھی اُسی پارٹی کے ٹکٹ پر اسمبلی میں پہنچا ہے۔ ملک بھر میں پھیلی ہوئی دولت پیدا کرنے والی فیکٹریاں ہمارے خاندان کی ملکیت ہیں۔ مجھ پر میرا باپ اور بڑا بھائی جان چھڑکتے ہیں۔ جو کہتا ہوں، مان لیتے ہیں۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ اُنہوں نے مجھے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ ذرا ٹھہرو! میں اُس بات کی طرف آ رہا ہوں جو تمہیں بتانے کیلئے اِس طرح ہنگامی طور پر بھاگتا چلا آیا ہوں۔ میرے گھر والوں نے مجھے اپنا جیون ساتھی چننے کی مکمل آزادی دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھی تھی۔ عورت کے وجود کی بھول بھلیاں میرے لئے نئی نہیں۔ جسے چاہا، اُسے جھکا لیا یا توڑ دیا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا باپ صرف اُسی لڑکی کو اپنی بہو کے طور پر قبول کرے گا جو خاندانی طور پر ہمارے ہم پلہ ہو۔'' وہ ٹہلتے ہوئے، چائے پیتے ہوئے، اُس کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے اپنی گفتگو آگے بڑھا رہا تھا۔ خالی کپ میز پر رکھ کر وہ ونڈو میں آن کھڑا ہوا۔ ''شاہانہ! سچ کہتا ہوں کہ پہلی مرتبہ تم میں اُس وقت دلچسپی محسوس کی جب مجھے پتہ چلا کہ تم بھی میرے قبیلے سے تعلق رکھتی ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے منزل مل گئی۔ میں نے اپنی زندگی کی آوارہ منشی کو ترک کر کے تمہاری دہلیز پر سجدۂ عشق بچھا دیا۔ شروع میں تم نے مجھے اہمیت نہیں دی، پھر میری لگن نے تمہیں رام کر لیا۔'' وہ اُس کی طرف پشت کئے بول رہا تھا۔

ایسے میں وہ سوچنے لگی۔ 'یہ ایسے الفاظ تو نہیں ہیں کہ جن کی ادائیگی پر رُخ پھیرنا ضروری ہو۔ یونیورسٹی میں میرے روکنے کے باوجود باہیں کھول کر محبت کا اعلان کرنے لگا تھا۔ تنہائی میں سامنے کرنے سے کترانے لگا ہے۔ دال میں کچھ کالا ہے۔'

وہ اپنی بات کو بڑھانے لگا۔ ''غلطی یہ ہوئی کہ میں نے فوری طور پر اپنے گھر والوں کو تمہارے متعلق نہیں بتایا۔ تین دن قبل میرے چچا ملک فرید برسوں کے بعد ہمارے گھر آئے۔ دونوں خاندانوں میں طویل عرصے سے شدید نوعیت کے اختلافات چلے آ رہے تھے جن کی وجہ سے ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا موقوف تھا۔ میرے باپ نے اپنے بھائی کو آبائی جائیداد میں حصہ دیے بغیر گھر سے نکال دیا تھا۔ بعد میں اپنی غلطی کا اور بھائی کی کمی کا شدت سے احساس ہوا مگر اِس دوران بہت سا پانی پل کے نیچے سے گزر چکا تھا۔ میرے باپ نے بارہا اپنے بھائی سے معافی مانگی، اُس کا حصہ دینے کی کوشش کی مگر چچا نہیں مانا۔ تمہیں بتلاتا چلوں کہ میرا چچا ملک فرید تمہارے باپ کے انتخابی حلقے میں واقع بستی نور پور میں رہائش پذیر ہے۔''

وہ سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ عالمگیر نے سچ کہا تھا۔

''میرے باپ نے اپنے بھائی کا استقبال والہانہ انداز میں کیا۔ وہ اُس کی محرومیوں کو سمیٹنا چاہتا تھا۔ دوسرے دن چچا نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ اُس کا کوئی بہت ہی قریبی دوست دل کا دورہ پڑنے سے اللہ کو پیارا ہوگیا تھا۔ اپنے پیچھے دو بیٹیاں چھوڑ گیا تھا۔ چچا چاہتا تھا کہ ایک بیٹی کو اپنے بیٹے ملک امجد سے بیاہ کر وہ اپنے گھر لے جائے۔ ایک بیٹی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عروسی جوڑا پہن کر ہمارے گھر میں آئے۔ وہ کہہ کر گیا ہے کہ دونوں بیٹیوں میں ایک انتخاب کر کے بہو بنالو، دوسری کو میں اپنے گھر لے جاؤں گا۔"

وہ اُٹھ کر اُس کے قریب آ گئی۔ اُسے شانے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بولی۔ "جب تک تم میری جانب منہ کر کے نہیں بولو گے، میں یقین نہیں کروں گی۔ میں ملک فرید کو جانتی ہو، اُس کے مرحوم دوست چوہدری باسط کو بھی جانتی ہوں اور چوہدری کی بیٹیاں بتول اور زرینہ سے متعارف بھی ہوں۔ دونوں بہت اچھی ہیں۔ اِس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

وہ غیر یقینی انداز میں اُسے دیکھنے لگا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ میں اُن میں سے کسی ایک سے شادی کرلوں؟"

"ہاں! اِس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟" وہ بولی۔

"شاہانہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارے سوا کسی لڑکی کو اپنی زندگی میں دلہن بن کر داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا باپ اپنے کھوئے ہوئے بھائی کی بازیابی پر اتنا خوش اور پُرجوش ہے کہ میری بات پر دھیان ہی نہیں دے رہا۔ وہ کسی صورت میں بھی گھر چل کر آنے والے بھائی کو انکار نہیں کرے گا۔ مجھ سے غلطی یہی ہوئی کہ میں نے اُنہیں مناسب وقت دیکھ کر بتلا نہیں پایا کہ میں نے اپنے لئے شریکِ حیات چُن لی ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے شاہانہ!"

وہ حیرت آمیز نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ "میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

وہ اُس کو دونوں شانوں سے پکڑ کر ملتجیانہ انداز میں بولا۔ "تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں تمہیں اپنی فیملی سے ملوانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری مَن موہنی سی صورت کو دیکھ کر وہ سب اپنا ارادہ بدل لیں گے۔"

"اگر میں اُنہیں متاثر نہ کر پائی تو؟"

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں دیکھ کر......"

وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "تمہارے یقین کو آزماتے ہوئے میں اپنی خاندانی نجابت کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔"

"میرے لئے بھی؟"

وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ چاہنے والے نے پہلی مرتبہ کچھ مانگا تھا۔ وہ انکار کرنا چاہتی تھی مگر اُس کی دل آزاری کے ڈر سے خاموش رہی۔ مانگنے والا اُس کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ پلیز شاہانہ! آئی لو یو......"

بارہا فلموں میں سننے کے باعث یہ فقرہ گھسا پٹا لگنے لگا تھا مگر رئیس کے لبوں پر بارہا کی سنی ہوئی بات یوں مچلی تھی کہ اُس کا دل اتھل پتھل ہو گیا۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "او کے! میں تمہارے ساتھ چلوں گی مگر پلیز...... بے عزت نہ کروانا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ میرا زندگی بھر کیلئے محبت پر سے اعتماد اُٹھ جائے۔"

اُس نے والہانہ انداز میں اُسے بانہوں میں بھر لیا۔ پیشانی پر بوسہ دے کر بے کراں خوشی کا اظہار کیا، ہاتھ کی پشت کو چوم کر شکریہ ادا کیا۔ رئیس کا ردعمل عین فطری دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی چاہت میں دیوانگی کی سرحدیں عبور کرتا ہوا اُسے بہت اچھا لگا۔ وہ بے خودسی ہو کر صوفے میں ڈھے گئی۔

اُسے انتظار کرنے کا کہہ کر تیار ہونے کیلئے چلی گئی۔ آدھے گھنٹے میں کئے گئے خصوصی اہتمام نے اُس کو خاص بنا دیا تھا۔ دیکھنے والے کی نظر ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ نزاکت سے ایک ایک زینہ اُترتی سیدھی رئیس کے دل میں اُترتی جارہی تھی۔ اُسے اپنی آنکھوں میں بساتے ہوئے بولا۔ "کہا جاتا ہے کہ تاریخ کی ہر فتح کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا جگمگاتا چہرہ کارفرما ہوتا ہے۔ اس بات کی آج تک سمجھ نہیں آئی تھی۔ آج سمجھ آ رہی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے سمجھ ہی جاتی رہی ہے۔ میں تمہارے تعاقب میں دوڑتے دوڑتے دنیا کو فتح کرنے کے جذبات دل میں محسوس کر رہا ہوں۔ ویل ڈن مائی شاہانہ! تم واقعی شاہانہ ہو۔"

تعریف ہر عورت کی کمزوری ہوتی ہے۔ مرد اپنا ہر ظلم تعریف کے دو بولوں کی پڑیا میں لپیٹ کر دور پھینک سکتا ہے۔

پورچ میں آئی تو کچھ سوچ کر ٹھٹک گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ کوئی بہت بڑی غلطی کرنے چلی ہو۔ غلطی پکڑی نہیں جارہی تھی۔ ایسے میں عالمگیر اُس کے قریب چلا آیا۔ اُسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ "کہیں جارہی ہو مس شاہانہ؟"

اچانک اپنی غلطی پکڑ کر مسکرانے لگی۔ وہ جلدی میں بغیر پروٹوکول اور حفاظت کے گھر سے

نکلنے لگی تھی۔ بولی۔ "ہاں! میں رئیس کے گھر تک جارہی ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔" رئیس اپنی گاڑی میں آیا تھا۔ دروازہ کھول کر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بولی۔ "[illegible] گاڑی میں تمہارے پیچھے پیچھے آرہی ہوں۔ تم چلو!"

عالمگیر نے گاڑی اسٹارٹ کر کے رئیس کے تعاقب میں ڈال لی۔ راستے میں پوچھا۔ "اچانک رئیس کے محل میں جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

وہ بولی۔ "وہ مجھے اپنے گھر والوں سے ملوانا چاہتا ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔"

وہ اُس کے احمقانہ جواب پر ہنسنے لگا۔ وہ بولی۔ "میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے تمہیں؟"

وہ بولا۔ "لطیفے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز جواب دیا ہے تم نے۔"

وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ "رئیس کی بہن مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ اُس نے بار بار [illegible] بھیجا۔ اُس سے ملنے کیلئے جارہی ہوں۔"

وہ پھر ہنسنے لگا۔

"اب کیا ہے؟" وہ زِچ ہو کر بولی۔

"رئیس کی تو کوئی بہن ہی نہیں ہے۔" وہ بدستور ہنستے ہوئے بولا۔ "لڑکیاں اپنے چاہنے والے کیلئے جھوٹ بولتی ہیں۔ اُس چیز کو چھپانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں جو آج تک چھپ نہیں سکی۔"

وہ شرمسار ہو کر خاموش ہوگئی۔ خاموشی میں ہی عافیت تھی۔ ایک جھوٹ پر پردہ ڈالنے کیلئے دوسرا جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ عالمگیر کے سامنے جھوٹ بول کر وہ زبان کی نوک پر پکڑی جاتی تھی۔

شہر کے مضافاتی علاقے میں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی کاریں ایک محل نما کوٹھی کے گیٹ [illegible] آن رکیں۔ ہارن بجانے پر باوردی چوکیدار نے بغلی گیٹ کھولا۔ سلام کیا اور گیٹ کی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ چند لمحوں کے بعد خود کار گیٹ کھل گیا۔

عالمگیر نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اُترتی شاہانہ کا فرنٹ سیٹ پر دھرا ہوا ہاتھ تھام لیا [illegible] راز دارانہ انداز میں بولا۔ "تم سردار فضل خان کی اکلوتی بیٹی شاہانہ ہو۔ تخت پر بیٹھی رہو گی تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہانہ رہو گی۔ نیچے گر پڑو گی تو پاؤں میں روندنے کے لائق بھی نہ رہو گی۔ میں اگر چاہتا تو تمہیں یہاں تک کبھی نہ آنے دیتا۔ اَب آ گئی ہو تو یہ دھیان رکھنا کہ میں تم پر اُٹھنے والی انگلی کو کاٹ پھینکنے کا جذبہ اور اجازت رکھتا ہوں۔ تم میرا نمبر میموری سے نکال کر سکرین پر سٹینڈ بائی رکھو۔ ضرورت پڑنے پر کال ملانے والا بٹن پش کر دینا۔"

اُس نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔ اُس کے چہرے پر نظریں جمائے عجیب سے انداز میں بیٹھی رہی۔ اُس کے ہر لفظ کی معنویت کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔ "او۔ کے! میں خیال رکھوں گی۔"

اُتر کر رئیس کی طرف بڑھ گئی جو کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر دونوں کوٹھی میں داخل ہو کر عالمگیر کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک ملازم نے کار کے قریب آکر اُسے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھنے کی درخواست کی مگر اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں اِدھر ہی ٹھیک ہوں۔"

وہ دو گھنٹوں کے بعد جب کوٹھی سے رئیس کی معیت میں برآمد ہوئی تو خاصی پُرجوش اور خوش تھی۔ کار میں بیٹھ کر رئیس کو ہاتھ لہرا کر بائے کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمہاری بات مان کر تم پر احسان کیا ہے۔ کبھی مجھے ضرورت پڑی تو تم بھی مجھ پر احسان کرو گے۔"

وہ مسکرانے لگا۔

عالمگیر نے کوٹھی سے نکلنے کے بعد اُسے مخاطب کیا۔ "مس شاہانہ! رئیس اِس وقت اپنے گھر والوں سے تمہارے بارے میں کمنٹس طلب کر رہا ہوگا کہ شاہانہ کیسی لگی۔ میں بھی پوچھتا ہوں کہ تمہیں رئیس کے گھر والے کیسے لگے؟"

وہ جھینپ کر بولی۔ "بہت پیار کرنے والے دکھائی دیے۔"

وہ نہیں جانتی تھی کہ انسان کو بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

عالمگیر نے واپسی پر راستہ بدلا تو وہ بولی۔ "اتنا لمبا چکر کاٹنے پر بہت دیر ہو جائے گی۔"

وہ بولا۔ "کوئی بڑا آدمی اِدھر سے گزرنے والا ہے۔ اُسے لائن کلیئر دینے کیلئے ٹریفک جام ہو رہا ہے۔"

وہ مطمئن ہوگئی۔ مختلف راستوں سے گزرتا ہوا ایک ہاؤسنگ کالونی میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک گاڑی گھر گھرا کر جھٹکے لینے لگی۔ اُس نے کار روک دی۔ بڑبڑایا۔ "یہ کس مقام پہ

سوجھی تجھے بچھڑنے کی......''

وہ پریشان ہوگئی۔ کار کے باہر شام ڈھل رہی تھی، کار کے اندر رات کا پچھلا پہر دم توڑ رہا تھا اور آسمان کے افقی اتصال سے سورج کے سر نکالنے کا انتظار کر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے کوفت سے واسطہ پڑا تھا۔ گاڑی اِس سے پہلے کبھی راستے میں خراب نہیں ہوئی تھی۔

قسمت باہر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ''اے خوش اندام! تیرے ہر قدم پر خوشیوں کو نچھاور کرنے والی میں ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ قسمت خراب ہوجائے تو ہر کام خراب ہونے لگتا ہے۔ تم بھی ایسا ہی سوچ رہی ہو۔ تمہیں ہرگز پتہ نہیں ہے کہ میں قہر بار نہیں، مہربان ہو کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ تمہارے خوابوں میں چھپی خرابیاں دکھانے کیلئے آئی ہوں۔ نیچے اُترو اور کھلی آنکھوں سے وہ کچھ دیکھو جو تمہیں عشق کے اندھے پن میں دکھائی نہیں دیتا۔''

عالمگیر اُتر کر کار کا بونٹ کھول کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بھی اُتر آئی۔ کھڑے ہوکر اطراف کی کوٹھیوں کی آؤٹ لک کا جائزہ لینے لگی۔ اچانک چونک پڑی۔ سامنے والی کوٹھی کا فرنٹ ایلیویشن دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔ سوچنے لگی۔ ''میں آج تک اِس علاقے میں نہیں آئی، پھر گھر دیکھا بھالا کیوں لگ رہا ہے؟''

دماغ نے توجیہہ پیش کی۔ ''ایک جیسے ایلی ویشن والی اَن گنت کوٹھیاں شہر میں موجود ہیں۔ یہ پریشانی والی بات نہیں ہے۔''

دل مطمئن نہیں ہوا۔ عالمگیر کے پاس آ کر بولی۔ ''یوں لگتا ہے جیسے میں اِس کوٹھی میں آ چکی ہوں۔ حالانکہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اِس ہاؤسنگ کالونی میں کبھی آنے کا اتفاق ہوا ہو۔''

وہ بھی اُس کوٹھی کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر عام سے لہجے میں بولا۔ ''اِس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟ اگر خود کو مطمئن کرنا چاہتی ہو تو بیل دے کر واچ مین سے دریافت کرلو کہ یہ کس کا گھر ہے۔''

وہ ہچکچانے لگی تو اُس نے شاہانہ کا بازو پکڑا اور کوٹھی کے سیاہ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ بولا۔ ''تجسس کو ہوا دینے کی بجائے ختم کردینا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

کال بیل کا بٹن پش کر کے دونوں انتظار کرنے لگے۔ واچ مین کا چہرہ چھوٹے گیٹ میں سے جھانکتا دکھائی دیا۔ مستفسرانہ لہجے میں بولا۔ ''جی صاحب! کس سے ملنا ہے؟''

عالمگیر بولا۔ ''بھائی صاحب! یہ گھر کس کا ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ ملک انیس ظہور کی کوٹھی ہے۔'' چوکیدار نے کہا۔

شاہانہ کو حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ جلدی سے بولی۔ ''وہی ملک انیس جو ملک ظہور کے بیٹے ہیں؟''

''جی بیگم صاحبہ!'' چوکیدار نے جواب دیا۔

عالمگیر نے مزید دریافت کیا۔ ''ملک صاحب سے ملاقات ہوسکتی ہے؟''

''نہیں...... وہ کبھی کبھار یہاں آتے ہیں۔ یہ کوٹھی زیادہ تر باہر سے آنے والے مہمانوں کی رہائش کیلئے استعمال ہوتی ہے۔'' واچ مین نے بتایا اور چھوٹا گیٹ بند کر دیا۔

دونوں اپنی کار کی طرف بڑھ گئے۔ عالمگیر چند منٹ انجن سے سر کھپاتا رہا۔ پھر مطمئن ہوکر گاڑی میں آ بیٹھا۔ بیک مرر میں شاہانہ کو دیکھا۔ وہ ابھی تک کوٹھی کو بغور دیکھے جا رہی تھی۔ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی۔ ''مگر میں تو یہاں کبھی بھی نہیں آئی پھر یہ گھر دیکھا دیکھا کیوں لگتا ہے؟''

عالمگیر نے گاڑی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اِس سے ملتی جلتی کسی کوٹھی میں تمہارا جانے کا اتفاق ہوا ہو۔''

وہ کندھے اچکا کر باہر دیکھنے لگی۔ دل میں گرہ پڑ چکی تھی۔ سارے راستے سوچتی رہی۔ کمرے میں پہنچی تو بھی کوٹھی کا فرنٹ ویو اُس کی چشم تصور میں چپکا ہوا تھا۔ کچھ یاد نہ آنے پر جھنجلا کر ٹی وی آن کرنے لگی۔ سکرین آن ہوئی تو جیسے دماغ میں الگ سے کوئی سکرین آن ہوگئی ہو۔ اُسے یاد آ گیا کہ اُس کوٹھی کو اُس نے کہاں اور کیسے دیکھا تھا۔ رگوں کا خون نچڑ کر اُس کے چہرے میں اکٹھا ہوگیا۔

ہیجانی انداز میں اُٹھی۔ ایک مخصوص وقت پر ہمیشہ کیلئے ٹھہری ہوئی ڈسک کو پلیئر میں لگا کر دیکھنے لگی۔ وڈیو ڈسک کو کبھی ریورس نہیں کرنا پڑتا۔ ہمیشہ شروع منظر سے چلتی ہے۔ شروعاتی منظر میں وہی کوٹھی ایمبولینس کی بتی کی طرح اُس کی نظروں میں گھومنے لگی۔ اُس نے بار بار ریورس کر کے کوٹھی کے فرنٹ ایلی ویشن کو دیکھا۔ اُسے آنے والے پانچ دس منٹوں میں ہی یقین ہوگیا کہ اِسی کوٹھی میں اُسے بے ہوش حالت میں لے جایا گیا تھا اور ہمیشہ کیلئے کھوکھلا کر دیا گیا تھا۔

اب اُسے فون کرنے والے کے الفاظ کی معنویت بھی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ میرا

ملک...... لمبے ہاتھ......

وہ سر تھام کر گھٹی گھٹی آواز میں چیخنے لگی۔ ''ہائے اللہ! میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ کس نے کیا ہے؟ کیوں ہر لمحہ مجھ پر موت آگیں زہر کی طرح ٹپکنے لگا ہے؟...... وہ کوٹھی ملک انیس کی ہے۔ مجھے وہاں لے جا کر اتھاہ پستیوں میں پھینک دیا گیا۔ رئیس مجھے اپنے گھر والوں کی آنکھوں پر بیٹھانے کیلئے لے گیا۔ کون کیا چاہتا ہے؟''

ہر آن رئیس کی طرف لپکنے والے دل میں بدگمانیاں بھر گئیں۔ دل دھڑک کر سمجھانے لگا۔ ''تم دوسری لڑکیوں سے مختلف ہو۔ تمہیں فتح کرنے کا طریقہ بھی تو دوسروں سے مختلف ہی ہوگا۔ رئیس نے تمہاری نرگسیت کو زینہ بنایا اور ایک ایک قدم اُٹھا کر تمہارے بدن کی عمارت کو تاراج کر دیا۔ تم اپنی بے وقوفی میں لُٹ چکی ہو۔''

بے بسی حد سے تجاوز کر جائے تو آنکھوں کے راستے رِسنے لگتی ہے۔ وہ ہچکیاں لینے لگی۔ ہچکیوں کی تال پر پورا جسم دھڑکنے لگا۔

دوسری طرف عالمگیر اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ ''ہر مرد اپنی محبوبہ کو خوش اور آسودہ رکھنا چاہتا ہے، میں کیسا مرد ہوں کہ جسے چاہتا ہوں، اُسے ہر لمحے نئی مصیبت کے منہ میں ٹھونس دیتا ہوں۔ رئیس کے گھر سے خوشیوں کے پھولوں بھرے ٹوکرے سر پر اُٹھا کر نکلنے والی لڑکی نے اپنے ہاتھوں سے ہی ٹوکرے کو ملک انیس کی کوٹھی کے گیٹ پر پھینک کر پھولوں کو پیروں تلے مسل دیا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملک امجد فرید ایک ماہ کی رخصت لے کر نور پور پہنچا تو اُسے پہلا جھٹکا لگا جب بتایا گیا کہ اُس کا باپ اپنے بھائی سے ملنے لاہور گیا ہے۔ اُس نے بھائی سے پوچھا۔ ''کیا چچا ظہور کی فیملی لاہور والی کوٹھی میں شفٹ ہو چکی ہے؟''

''دو تین سال سے لاہور میں ہی مقیم ہیں۔''

''ہوں!'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔ توقف کے بعد مستفسر ہوا۔ ''یہ ابا جی کو بیٹھے بیٹھائے انکل کے گھر جانے کا خیال کیونکر آ گیا؟ جب انکل یہاں آتے تھے تو وہ ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اب کیا ہو گیا ہے؟''

بھائی نے بتلایا۔ ''ابا جی آج کل چوہدری باسط کی بیٹیوں کے رشتوں کیلئے پریشان ہیں۔ تم اُن کی فکر چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ تم پر نزلہ گرنے والا ہے۔ ابا جی کا خیال ہے کہ چوہدری باسط کی ایک بیٹی کو تمہارے سر پر سوار کر دیا جائے۔ ایک کو رئیس کی دلہن بنا دیا جائے۔ آزادی کا تم نے کافی لطف اُٹھا لیا ہے۔ زمانے کے مسائل نبٹاتے پھرتے ہو، ہم نے سوچا ہے کہ ازدواجی کیس نبٹانے کیلئے گھر میں کچہری لگائے بیٹھے بہت اچھے لگو گے۔''

وہ حیرت زدہ ہو گیا۔ استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔ ''عجیب بات ہے کہ ابا جی نے مجھ سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ میری شادی میری مرضی سے ہونی چاہیے۔''

بھائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں جنتے وقت بھی تم سے مشورہ کرتے؟ تمہیں سکول میں داخل کرانے سے پہلے تم سے مشورہ طلب کرتے؟ تم پر محبتیں نچھاور کرتے ہوئے، تم پر لاکھوں کروڑوں کی انویسٹ منٹ کرتے ہوئے بھی تم سے پوچھتے کہ میاں بتلاؤ! سول جج تم نے بننا ہے، کیا تمہاری مرضی ہے؟ اگر صاحب بہادر کی خواہش ہوتی تو پیار کیا جاتا، تم پر کروڑوں روپے خرچ کئے جاتے ورنہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔ ہے ناں؟''

بھائی کے استہزائیہ لہجے اور فقروں نے اُسے شرمسار کر دیا۔ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ بھائی ٹھیک کہتا تھا۔ آج تک گھر میں اُس کے باپ کے حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل درآمد کیا جاتا رہا تھا۔ کبھی اختلافی صورت حال سامنے نہیں آئی تھی اور نہ ہی ایسا ہوا تھا کہ باپ نے کوئی غلط فیصلہ اُن کے سر پر مسلط کر دیا ہو۔ محبت کرنے والوں کے غلط فیصلوں پر بھی سر جھکانے میں کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔

سر دست خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ پا کر ہٹ گیا۔ چوہدری باسط کے ڈیرے کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ "یہ مجھے کس امتحان میں ڈال دیا گیا ہے؟ میں نے اُسے دیکھ کر پہلی نظر میں پسند کر لیا تھا۔ اُس نے اپنا آپ دکھا کر مجھے پرے ہٹا دیا ہے۔ کاش! اُس نے مجھ پر ایسا اعتماد نہ کیا ہوتا تو میں اَن دیکھی مکھی آسانی سے نگل لیتا۔"

وہ پڑھا لکھا تھا۔ باشعور تھا۔ قانون کی تعلیم اُسے یاد دلانے لگی۔ "تمہیں یہی پڑھایا گیا ہے کہ عورت قابلِ احترام ہوتی ہے۔ وہ بھی احترام کی حقدار ہے، چاہے جانے کے لائق ہے۔ اُس پر ظلم کا پہاڑ توڑا گیا ہے۔ اُس کی مرضی شامل ہونے کی صورت میں اُس پر جرم عائد کیا جا سکتا تھا۔ بے قصور ہونے کی صورت میں اُسے کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔"

یہ تو سب ٹھیک تھا مگر اُترن پہننے کو جی نہیں مان رہا تھا۔ بے نام غیرت پہلو میں کچوکے لگانے کیلئے بیٹھ گئی تھی۔

اُس کی جانب سفر کر رہا تھا۔ دور ہونے کیلئے مزاحمت بھی کر رہا تھا۔ ڈیرے پر پہنچ کر ہارن بجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ "یہ کیا ہے؟ میں جس سے دور ہونا چاہتا ہوں، اُسی نے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا ہے۔ کہیں مجھے محبت تو نہیں ہو گئی؟"

دل کی کشمکش کو چھپائے اُس کے سامنے بیٹھا تو پھر آپوں آپ ہی فیصلہ ہو گیا۔ اُس کے چہرے کی سوال کناں معصومیت نے اُسے کنارے لگاتے ہوئے کہہ دیا۔ "میں بے قصور ہوں۔ ایک باحیا عورت ہونے کے ناتے چاہے جانے کی خواہش رکھتی ہوں۔ اگر میں اپنے وجود کی گرانی کی اپنے منہ سے خبر نہ دیتی تو کیا میں کچھ اور دکھائی دیتی؟ کوئی بن بتائے بُوجھ سکتا ہے کیا؟ مجھے پاکیزہ سمجھ کر دیکھو تو اَب بھی میں دنیا میں سب سے بڑھ کر خوبصورت دکھائی دے سکتی ہوں۔ میرا حُسن دیکھنے والے کی آنکھ میں رَچا ہوا ہے۔"

وہ آنکھیں چرانے لگا۔ وہ بولی۔ "سر! آپ نے گزرے دنوں میں میرے لئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ کیا؟"

وہ بولا۔ "ہاں! میں نے ویگن ٹریس کی ہے۔ وہ لاہور کے ایک اربن روٹ پر چلتی ہے۔ وہ گزشتہ تین چار ماہ کے دوران شہر سے باہر نہیں لے جائی گئی۔ میں تمہیں لینے کیلئے آیا ہوں۔ شہر چلتے ہیں۔ جن راستوں کی نشاندہی کرو گی، انہی راستوں پر چل کر مذکورہ کوٹھی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی مضبوط سراغ مل جائے۔"

وہ بولی۔ "زری کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اُسے کچھ یاد رہا ہو۔"

اُس نے کندھے اُچکا کر کہا۔ "ایز یُو وِش!"

اماں سے اجازت لے کر تینوں شہر کی جانب عازم سفر ہوئے۔ دوپہر تک سڑکوں کی آوارہ گردی کرنے اور مختلف رہائشی کالونیوں کی خاک چھاننے کے بعد بتول نے مایوسی سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ میں راستہ پوری طرح بھول چکی ہوں۔ زری کا بھی یہی حال ہے۔"

دوپہر سر پر آ چکی تھی۔ وہ واپسی کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ امجد کے فون پر اُس کے بھائی کی کال آ گئی۔ اُس نے موبائل آن کرتے ہوئے پوچھا۔ "جی بھائی! خیریت تو ہے ناں؟"

دوسری طرف کی بات سننے کے بعد فون بند کرتے ہوئے بولا۔ "بھائی نے ایک کام میرے ذمہ لگا دیا ہے۔ ہمارے شہر والے گھر میں کچھ پیسٹی سائیڈز پڑی ہیں، وہ اُٹھا کر نور پور لے جانی ہیں۔ تھوڑی سی دیر لگے گی۔"

تھکی ماندی دونوں بہنوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بتول آنکھیں موند کر ستانے لگی۔ گاڑی رکنے پر اُس نے شیشے کے پار امجد کی کوٹھی کی طرف دیکھا تو یوں لگا جیسے کسی نے تیز دھار آلے سے اُس کا پہلو کاٹ کے رکھ دیا ہو۔ زرینہ عام سی نگاہوں سے کوٹھی کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے وہ قیامت انگیز فلم نہیں دیکھی تھی۔ اگر دیکھی ہوتی تو اُس کی کیفیت بھی کسی طور پر بتول سے مختلف نہ ہوتی۔

امجد گاڑی سے اُتر کر کوٹھی کے اندر چلا گیا تھا۔ اُس کے آنے تک وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سڑک پر سے نظر آنے والی بالائی منزل کو دیکھ رہی تھی۔ وہی کاریڈور، اُسی رنگ کی دیوار، وہی دروازہ...... سب کچھ وہی تھا۔ وہ گاڑی سے اُتر کر کوٹھی کے اندر گھس گئی۔ اُس کی ٹانگوں میں واضح طور پر کپکپاہٹ محسوس کی جا سکتی تھی۔

جونہی داخلی برآمدے میں پہنچی، اندر سے امجد ایک بڑا سا شاپنگ بیگ اٹھائے برآمد

ہوا۔ اُسے دیکھ کر حیرت اور استعجاب بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”میں بالائی منزل دیکھنا چاہتی ہوں۔“

اُس نے غور سے دیکھا۔ کافی بدلی بدلی دکھائی دے رہی تھی۔ بولا۔ ”بتول! تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو، خیریت تو ہے ناں؟“

وہ کچھ نہیں بولی بلکہ سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر جانے لگی۔ وہ شاپنگ بیگ رکھ کر تیز تیز قدم اُٹھاتا اُس کے برابر میں پہنچ گیا۔ سڑک پر سے دکھائی دینے والے کمرے تک آئی۔ دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ وہی منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ امجد اُس کے پہلو سے نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف اور سراسیمگی کے تاثرات کو بھانپ کر پوچھنے لگا۔ ”کیا بات ہے بتول؟“

وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر کبھی کمرے کے وسط میں بچھی ہوئی مسہری کو دیکھتی، کبھی امجد کو دیکھتی۔ دروازے کی آہنی چوکھٹ کو تھامے سرکتی ہوئی دیوار کی جڑ میں ڈھیر ہو گئی۔ اُس کے وجود نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں جیسے پتھرا سی گئی تھیں۔ انگلی سہارا دینے والے کے سینے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم...... تم نے ہی مجھے اغوا کرایا تھا امجد...... اِسی کمرے میں مجھے اور میری بہن کو اغوا کر کے کئی گھنٹے رکھا گیا تھا۔ ہائے اللہ زخم لگانے والے سے ہی مرہم طلب کرتی رہی۔“

وہ ہونقوں کی طرح اُسے دیکھ رہا تھا۔ بتول کی حالت زار اور باتیں اُس کی سمجھ میں آ کر بھی نہیں آئی تھیں۔ اُسے جھنجوڑ کر بولا۔ ”بتول! ہوش میں آؤ۔ یہ کیا بے ہودگی ہے؟“

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اب ہی تو ہوش میں آئی ہوں۔ تمہارے کارندوں نے تمہارے یا تمہارے بھائی کے کہنے پر ہی مجھے اغوا کیا تھا۔ میں احمقوں کی طرح تجھے مدد کیلئے پکار بیٹھی۔ چھوڑ دو میرے ہاتھ۔ یہ تمہارے گناہ میں لتھڑے ہوئے ہیں۔“

وہ خوف اور دکھ کے آخری زینے پر قدم رکھ کر جھول گئی۔ اُس کا بدن بے ترتیب انداز میں فرش پر بکھر گیا۔ کئی ساعتیں وہ ہونقوں کی طرح اُس کو دیکھتا رہا۔ سنبھلا تو اُسے سنبھالنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ اُسے اٹھانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ دھان پان سی دکھائی دینے والی کا بے اعصاب بدن خاصا بھاری ہو گیا تھا۔ دونوں بانہوں میں بھر کر اُٹھایا تو سنبھالنے کی بجائے خود بے خود ہونے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوچنے لگا۔ ”آج تک کسی لڑکی کو بانہوں پر اُٹھایا نہیں۔ آج پتہ چلا کہ جوان بدن آگ کی طرح دہکتا رہتا ہے خواہ خوابیدہ ہو یا بے حواس۔ چند لمحے خالی الذہنی کی کیفیت میں پڑ کر کھڑا رہا۔ پھر اُسے لے کر مسہری تک آیا۔ وہ اتنی بھی بھاری بھرکم نہیں تھی کہ تین چار قدم اُٹھانے پر سانس پھول جاتا مگر خاصا خوش جسامت ہونے کے باوجود سینہ دھونکنی کی طرح اوپر نیچے ہونے لگا۔ چند ثانئے تک اپنا سانس قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ بھول گیا کہ جب تک بے سدھ پڑی ہوئی لڑکی کے بولتے ہوئے اعضاء کو دیکھتا رہے گا، تب تک اپنی سدھ گنواتا رہے گا۔ گھبرا کر پلٹا اور سر جھٹکنے لگا۔

اُس کے وجود سے نظریں چُرا کر بھاگا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آیا۔ کوٹھی میں موجود اکلوتے ملازم کو فوری طور پر ڈاکٹر کو لانے کا حکم دیتے ہوئے بھاگ کر گیٹ پر کھڑی گاڑی تک پہنچا۔ زرینہ کو لے کر واپس کمرے میں آ گیا۔ جب اُس نے اپنی بہن کو بے ہوش پڑے دیکھا تو گھبرا کر امجد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ”یہ اِس کمرے کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئی ہے۔ مجھے کہہ رہی تھی کہ اغوا کرنے والوں نے تم دونوں کو یہاں محبوس رکھا تھا۔ تم کیا کہتی ہو؟“

وہ اپنی بہن کے قریب بیٹھ کر اُس کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے گال تھپتھپانے لگی۔ یوں لگا جیسے اُس نے امجد کی بات سنی ہی نہیں۔ نبض اور دھڑکن چیک کرنے کے بعد خودکلامی کے سے انداز میں بولی۔ ”باجی آج تک کبھی بھی ایسے بے ہوش نہیں ہوئی۔“

کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑانے لگی۔ کبھی شناسائی کی لہر آنکھوں میں دوڑ جاتی، کبھی بے یقینی بھر جاتی۔ اچانک کمرے کی نکڑ پر نگاہ ڈالتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔ ”نہیں...... یہ وہ کمرہ نہیں ہے۔ اِس میں موجود فرنیچر اُس فرنیچر سے ملتا جلتا ضرور ہے مگر یقیناً یہ وہ کمرہ نہیں ہے۔“

وہ پانی کا ایک گلاس بھر لایا۔ بتول کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ زرینہ آوازیں دیتے ہوئے گال تھپتھپانے لگی۔ ایسے میں اُس نے زرینہ سے دریافت کیا۔ ”تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ وہ کمرہ نہیں ہے؟“

وہ بولی۔ ”مجھے اُس نکڑ میں چارپائی کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ دیوار کی جڑ میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ فرش سے بالشت بھر اوپر دیوار میں ایک بجلی کا بورڈ نصب تھا۔“ پھر نفی میں سر

ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔''

بتول نے آنکھیں کھول دیں۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ وہ زرینہ کو اُس کا خیال رکھنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کی عدم موجودگی میں بتول کمرے کے بارے میں فیصلہ کر لے۔ دس منٹ کے بعد ادھیڑ عمر ڈاکٹر کی معیت میں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ پوری طرح اپنے حواس میں تھی مگر ابھی تک شاید اُس نے زرینہ کے مؤقف کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے پیشہ وارانہ انداز میں اُس کا چیک اپ کیا۔ تسلی دینے کے سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں۔ چند ٹیبلٹ دے رہا ہوں، بہتر یہی ہوگا کہ دودھ یا ملک شیک وغیرہ کے ساتھ انہیں کھلا دیجئے۔ کچھ ہی دیر میں بالکل نارمل ہو جائیں گی۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ بیڈ پر اُس کی پائنتی کی طرف سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آہستگی سے بولا۔ ''مجھے تمہاری اِس کیفیت نے دکھ دیا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ پھر سر جھکا کر انگلیاں چٹخانے لگی۔ اُس کے اندر اضطراب یوں پھیلا تھا کہ سب کچھ جلا کر خاکستر کر گیا تھا۔ بیڈ سے اُترتے ہوئے بولی۔ ''کافی دیر ہو چکی ہے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔ میں چاہوں گی کہ آپ میرے ساتھ چل کر وہ فلم دیکھ لیں۔ کمرہ وہ نہیں ہے، میں مانتی ہوں مگر یہ کوٹھی وہی ہے۔ فلم دیکھ کر آپ کو بھی ماننا پڑے گا۔''

وہ کندھے اُچکا کر بولا۔ ''وائی ناٹ! میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔''

تینوں کمرے سے باہر آئے۔ بتول نے کاریڈور کے تینوں کمروں میں جھانک کر دیکھا۔ سیڑھیوں کے پاس رُک کر اُسی کمرے کی جانب دیکھتی رہی جہاں چند منٹ قبل بیٹھی تھی۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ بری طرح ذہنی انتشار کا شکار ہو چکی تھی۔

کار میں بیٹھنے سے پہلے وہ کوٹھی کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ کسی کو بالخصوص مخاطب کئے بغیر بولی۔ ''کوٹھی کا وِیو اچھی طرح دیکھ لیں۔''

دونوں نے اُس کے کہنے پر غور سے کوٹھی کو دیکھا پھر سر ہلا کر کار میں بیٹھ گئے۔

بتول نے اپنے بیڈ روم میں دونوں کو بٹھانے کے بعد پلیئر آن کیا۔ ٹی وی کی تار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس سے منسلک کرنے کے بعد اپنی الماری سے فلم نکال لائی۔ ڈسک پلیئر کی ٹرے میں رکھ کر اُن کی طرف مڑی۔ ''فلم کے آغازی دو تین منٹ میں کوٹھی کا فرنٹ ویو دیا گیا ہے۔ میں فلم وہیں تک چلاؤں گی۔''

فلم چل پڑی۔ دونوں انہماک سے سکرین پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ایک منٹ میں ہی فیصلہ ہو گیا۔ امجد پُر استعجاب لہجے میں بولا۔ ''واقعی! یہ تو ہماری کوٹھی ہے۔''

بتول پلیئر آف کرنے ہی لگی تھی کہ سکرین پر دروازے میں گھسنے والے سفید کپڑوں میں ملبوس شخص کی پیٹھ دکھائی دی۔ امجد بے اختیار چیخ اُٹھا۔ ''یہ تو بڑے بھائی ہیں۔ کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔''

کسی کو پیٹھ سے دیکھ کر پہچان لینے کی طاقت صرف بھائی یا بہت ہی قریبی شخص رکھتا ہے۔ بتول ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ ''دیکھا! میں نہ کہتی تھی کہ بالکل یہی کوٹھی ہے جہاں ہمیں رکھا گیا تھا۔'' اِس کے ساتھ ہی اُس نے پلیئر آف کر دیا۔ امجد گہری سوچ میں پڑ گیا۔

زرینہ نے کہا۔ ''باجی! جس کمرے میں ہمیں رکھا گیا تھا اُس میں تمہارے بائیں ہاتھ پر اٹیچڈ باتھ روم کا دروازہ تھا۔ ہم دونوں باہر چل کر بیٹھتے ہیں، تم فلم دیکھو۔ اِس نشانی کو دیکھو۔ یہ ذہن میں رکھنا کہ دروازہ بالکل برابر تھا۔ اُس پر کوئی ڈیزائن نہیں بنا ہوا تھا۔''

امجد نے ستائشی نظروں سے زرینہ کو دیکھا۔ اتنے کڑے حالات میں بھی اُس نے کمرے کی بناوٹ کو بہ نظرِ غور دیکھا تھا اور بڑی بات یہ تھی کہ اِتنے دن گزرنے کے بعد پوری طرح یاد بھی رکھا تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔ صحن کے وسط میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر امجد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''بہنا! اگر ممکن ہو تو مجھے چائے پلوا دو۔ تمہاری باجی نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔''

وہ آزردگی سے مسکراتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ نہائت غیر متوقع صورتِ حال سے واسطہ پڑا تھا۔ زرینہ چائے کے تین کپ ٹرے میں رکھے کچن سے نکلی، بتول اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی ہو گئی۔ دونوں نے اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کا چہرہ فرطِ جذبات سے سرخ تھا۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''زری درست کہتی ہے۔ مجھے ماننا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پڑا ہے کہ سرسری طور پر دیکھنے پر دونوں کمرے ایک سے دکھائی دیے۔ غور کرنے پر صاف پتہ چلتا ہے کہ اُس کمرے کو آپ کی کوٹھی کے کمرے سے مشابہت دینے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔"

چوکھٹ تھام کر چند لمحے کھڑی رہی۔ پھر ہولے ہولے قدم اُٹھاتے اُن کے پاس آکر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چائے کا کپ تھام کر بولی۔ "مگر ایسا کیوں کیا گیا ہے؟"

امجد نے کہا۔ "اگر زرینہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو وہ لوگ اپنا مقصد حاصل کر چکے ہوتے۔ وہ غالباً یہی چاہتے تھے کہ تفتیش ہونے پر یا بات کھلنے پر تمہاری نظروں میں ہم مجرم ٹھہریں۔ ابتدائی طور پر تم نے ایسا ردعمل ہی پیش کیا تھا۔ بھلا ہو زرینہ کا جس نے تمہاری طرح عجلت میں احمقانہ رائے قائم کرنے کی بجائے ہوشمندی کا ثبوت دیا۔"

وہ شرمندہ سی ہو کر چائے پینے لگی۔ زرینہ نے کہا۔ "بھائی! مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اغوا کرنے والے ہمارے آس پاس...... بہت قریب رہتے ہیں۔ اُن کی رسائی آپ کی کوٹھی کے اُس کمرے تک ہے، ہمارے دونوں خاندانوں کے مابین گہرے مراسم سے بھی باخبر ہیں اور انہوں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ ہمارے بلیک میل نہ ہونے پر، بات کے کھلنے پر اُن پر حرف آنے کی بجائے آپ لوگوں پر الزام آئے۔ وہ کون ہے؟ ...... اَب ہمیں یہ سوچنا ہے۔"

اُس نے پتے کی بات کی تھی۔

امجد پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "میں چلتا ہوں، انکل چوہدری کے فون میں محفوظ فون نمبروں کو ٹرائی کرتا ہوں۔ اگر کوئی کلیو ملا تو فون پر بتلاؤں گا۔ ورنہ صبح ملاقات ہوگی۔ تم دونوں بہنیں بھی اِس بارے میں سوچنا۔"

اُس کے جانے کے بعد زرینہ نے اُس کی جانب پیٹھ کرتے ہوئے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "باجی! تمہیں اپنا چیک اَپ کروالینا چاہیے۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "کیوں؟ ڈاکٹر کہہ تو رہا تھا کہ وقتی صدمے کے باعث شاک پہنچا ہے، کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "جو میں کہہ رہی ہوں، اُسے سمجھنے کی کوشش کرو باجی!"

سمجھنے کی کوشش کی تو زری کی بات نے دل کو دہلا کر رکھ دیا۔ اُس نے اِس رخ سے

سوچا ہی نہیں تھا۔ دل میں سوچنے لگی۔ "میں بڑی ہوں، زری چھوٹی ہے۔ اتنا بڑا خدشہ اُس کے ذہن میں سانپ کی طرح لہرا گیا، میری نگوڑی عقل میں کچھ نہ آیا۔ ہائے! اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا؟"

ابھی کچھ نہیں ہوا تھا مگر دل انجانے ڈر سے بری طرح کانپنے لگا۔ چہرے پر پیلاہٹ طاری ہوگئی۔ زری چونکہ اُس کی طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی، ایسی بات کہتے ہوئے اُسے اخلاقی طور پر بڑی بہن کا سامنا کرنے کی جرات نہ ہوئی تھی مگر اتنا ادراک ضرور رکھتی تھی کہ باجی کی طویل خاموشی درد کا نہ جھیلا جا سکنے والا سفر بن گئی ہے۔ سر جھکا کر بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ اللہ ہمیں کسی اور امتحان میں نہیں ڈالے گا مگر اِس یقین کی دلیل ہمیں لیبارٹری سے ہی مل سکے گی۔"

وہ سر جھکائے کمرے میں آ گئی۔ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹ کر سسکنے لگی۔ اندیشے نے اُس کے دل کو بری طرح ڈرا دیا تھا۔ جانے والے نے سوچنے کا ہوم ورک دیا تھا۔ وہ ہوم ورک کرنے کی بجائے رَب سے دعا کرنے لگی۔ "میں نے ہمیشہ تمہارا حکم مانا ہے۔ آج تک کوئی غیر شرعی کام نہیں کیا ہے۔ نہیں جانتی کہ جو سزا مل چکی ہے، وہ کس جرم کی پاداش تھی۔ یہ بھی نہیں جانتی کہ سزا پانے کے بعد میرا گناہ دھل گیا ہے یا نہیں۔ اگر سزا باقی ہے تو اپنے سوہنے حبیب کے واسطے مجھے معاف کر دے۔ یا باری تعالیٰ! میں اتنی مضبوط نہیں ہوں۔ اگر تمہاری رحمت کے پاس میرے لئے معافی کی گنجائش نہیں رہی تو اتنا کرم کر دے کہ کسی اور رنگ میں سزا دے دے۔ بیمار کر دے، میری سانس کو تھکا دے، میری زندگی مُکا دے یا کچھ بھی کر دے مگر ہائے! ایسا نہ کرنا کہ میں دنیا میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں۔"

ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ ایسے میں اُس کی ماں اُس کے پاس آ گئی۔ بیٹی کو زاروقطار روتے دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔ ماں نے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "اے کرموں جلی! کیوں روتی ہے؟ مرنے والا سرتاپیر میرا تھا۔ اُس میں کسی کی کوئی شراکت نہیں تھی۔ میں اپنے سائیں کی بخشش کی دعا کرتی رہتی ہوں۔ تم اپنے ہونے والے سائیں کی سلامتی کی دعا کیا کرو۔"

وہ اپنی ماں کے لرزاں وجود سے لپٹ گئی۔ ایک چیخ لبوں پر آ کر دم توڑ گئی۔ "اماں! وہ تیرا سائیں تھا مگر میرا باپ تھا۔ باپ کے بغیر بیٹیاں یوں ہوتی ہیں جیسے کھلے رقبے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سر جھکائے کھڑا ہوا بیری کا درخت جسے ہر گزرنے والا پتھر مارتا ہے۔ پکے ہوئے بیر توڑ کر لے جاتا ہے۔ اُس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا، اُسے کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔"

ماں نے پوچھا۔ "تم آسمان تلے ننگے سر کھڑی بیری نہیں ہو، چوہدری باسط کی بیٹی ہو۔ تم پر کسی نے انگلی اُٹھائی ہے کیا؟ بول! میں اتنی بھی بے سکت نہیں ہوں کہ اپنی بیٹیوں کی حفاظت بھی نہ کر سکوں۔"

وہ کہنا چاہتی تھی کہ جس درخت کو تم نے سات پردوں میں چھپا رکھا تھا، اُس کے پھل تو رہے ایک طرف، لوگ ٹہنیاں تک کاٹ کر لے جا چکے ہیں۔ ہونٹ دانتوں تلے کچل کر اُس نے بات روک لی۔ نادان یہ نہیں جانتی تھی کہ ہونٹوں پر دانتوں تلے بات کو کچل دینے سے وہ مرتی نہیں بلکہ زخم بن کر رسنے لگتی ہے۔ رستے ہوئے زخم کو مرہم تلے رکھ کر چھپانا پڑتا ہے۔ مرہم رکھنے والا دور دور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اماں نے اُس کے گھنے سیاہ بالوں میں کسی چاہنے والے کی طرح انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! تم پڑھی لکھی ہو۔ تمہارے باپ نے تمہیں پڑھا لکھا کر باشعور بنایا ہے۔ میں اَن پڑھ ہوں۔ دل دونوں کا ایک جیسا ہوتا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم نے اپنے من میں ملک امجد کو دیوتا بنا کر سجا لیا ہے۔"

وہ روتے روتے چونک اُٹھی۔ عجیب سی نظروں سے اپنی اماں کو دیکھنے لگی۔ اماں نے اُس کی آنکھوں کو باری باری چوما اور کہا۔ "یوں نہ دیکھ! دل پر اختیار نہیں ہوتا۔ کتابیں سمجھاتی پڑھاتی ہیں، دل میں کسی کو بسانے سے نہیں روکتیں۔ میں تو فقط اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ مرد سے چار بالشت کے فاصلے پر رہا جائے تو وہ قدر کرتا ہے۔ آگے جانے والی کے پیچھے سر جھکائے چلتا رہتا ہے۔ پیچھے چلنے والی کو نظر انداز کر کے آگے والی کو پکڑنے کیلئے لپکتا ہے۔ تم اپنی ٹہنیوں کو قدِ آدم سے بلند کر لو۔ وہ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر بیر توڑنے کے چکر میں بے تابی کے کچے دھاگے میں بندھا کھڑا رہے گا۔ ذائقہ منہ میں گھلنے تک اپنی حیثیت اور کشش رکھتا ہے۔ گھل کر بے وقعت ہو جاتا ہے۔ ایک بیر کھا لینے والا پوری بیری کو چکھ لیتا ہے اور دوسری کی طرف بڑھ جاتا ہے۔"

سوچنے لگی کہ ماں ان پڑھ ہونے کے باوجود اتنی گہری باتیں کیسے کر لیتی ہے۔ بولی۔ "اماں! تمہیں اتنی باتیں کس نے سکھائی ہیں؟"

وہ بولی۔ "تو بھی بالکل جھلی ہے۔ یہ باتیں سکھائی تھوڑی جاتی ہیں، سیکھی جاتی ہیں۔ جب میری عمر تک پہنچو گی، خود بخود سمجھ جاؤ گی مگر تب تک بہت سا پانی پل کے نیچے سے گزر چکا ہوگا۔"

درد کی بنجر دھرتی میں ایک پھول کھل اٹھا۔ اوس میں بھیگے ہوئے چہرے پر خوشی کا عکس لہرا گیا۔ بولی۔ "اماں! تم کہتی تھیں کہ کسی مرد کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا۔ جب دیکھا ہے تو مارنے پیٹنے اور گالیاں دینے کی بجائے نیا سبق دینے لگی ہو۔ کیا تمہیں میرا امجد سے یوں آزادانہ طور پر ملنا جلنا برا نہیں لگا؟"

"تم نے گندم کی فصل دیکھی ہے ناں۔ پکنے تک اُس میں سے ہم اپنی بکری تک کو گزرنے نہیں دیتے۔ ایک خوشہ توڑنے والے کا ہاتھ توڑنے کو آ جاتے ہیں۔ جب پک جاتی ہے تو اُسے کٹائی کیلئے مزدوروں کی درانتیوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔" اماں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا اور دوپٹے کے پلو سے چہرہ پونچھتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

ماں نے عجیب مثال دی تھی۔ روتے چہرے پر جذبات کی قوس قزح اُتر آئی۔ خود کو ٹٹولتے ہوئے بڑبڑائی۔ "اِس کا مطلب ہے میں پک چکی ہوں اور مجھے ایک ایک پور کاٹنے والی درانتیوں کے حوالے کرنے کا موسم آ گیا ہے۔"

ڈرے ہوئے دل کو اِس احساس نے مزید ڈرا دیا۔ اَن دیکھی چیز کے ملنے کی برسوں سے خواہش تھی۔ جس رنگ میں ملی تھی، اُس نے مرمریں بدن میں دراڑیں ڈال کر اینٹھن بھر دی تھی۔ سوچنے لگی۔ "ہائے! یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ مزارعوں کی نو بیاہتا بیویاں بتلاتی ہیں کہ عورت کی پوری زندگی ایک طرف، کسی کے نام لکھ دی جانے والی زندگی کی پہلی رات ایک طرف ہوتی ہے۔ میں کیسی نابیاہتا لڑکی ہوں۔ ایسی بختوں بھری رات سے صرف اس لئے خوفزدہ ہوں کہ یہ مجھ پر پہلے ہی ظلمت کے آتش بھرے دن میں اُتار دی گئی ہے۔"

زری جب اُسے کھانا لگنے کی اطلاع دینے کیلئے کمرے میں داخل ہوئی تو اُسے گہری نیند میں غافل پایا۔ اُس پر کمبل اوڑھا کر درست کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ "ذہن کو استطاعت سے زیادہ کھپایا جائے تو جلد تھک جاتا ہے۔ تم بھی تھک گئی ہو باجی! تمہیں طعام سے کہیں زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ سو جاؤ...... جیسے تمہارے اور میرے بخت سو گئے ہیں۔"

بڑے دنوں کے بعد دونوں پھر کالج جانے کیلئے ویگن اسٹاپ پر کھڑی تھیں۔ دو تین

ویگنیں گزر گئیں۔ اُن میں گنجائش سے زیادہ سواریاں بھری ہوئی تھیں۔ آتی ہوئی ایک ویگن کو دیکھ کر بتول نے جھرجھری لے کر زری سے کہا۔ ''زری! اَب تو ہر ویگن سے خوف محسوس ہونے لگتا ہے۔''

زری نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پلیز باجی! بار بار اُس واقعے کو یاد کر کے اپنا اور میرا خون نہ جلایا کرو۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ رونے پیٹنے سے وقت کی کیسٹ ریورس نہیں ہو سکتی۔''

وہ ٹھیک کہتی تھی۔ آنے والی ویگن میں اُن کے بیٹھنے کی گنجائش نکل آئی۔ کالج اسٹاپ پر اُترنے کی بجائے بس اسٹینڈ پر اُتر کر رکشا حاصل کیا اور سول ہسپتال کی طرف چل دیں۔ ہسپتال کے سامنے اور اطراف میں کئی میڈیکل اسٹور اور کلینیکل لیبارٹریاں موجود تھیں۔ زری چاہتی تھی کہ پہلی فرصت میں اُسے اپنا چیک اَپ کروانا چاہیے۔

ٹیسٹ کیلئے یورِن دینے کے بعد اُنہیں آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ رپورٹ لفافے میں ڈالتے ہوئے لیبارٹری ٹیکنشن نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وری بیڈ مسز روبینہ! آپ کی رپورٹ نیگیٹو ہے۔ دل پر بوجھ مت لیجئے۔ خدا جلد ہی آپ کی گود بھر دے گا۔''

ٹیکنشن کو رپورٹ کی منفیت پر دکھ ہوا تھا۔ اُنہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یوں لگا جیسے بدن پر پڑا منوں بوجھ ایک دم ہی اتر گیا ہو۔ لفافے پر مسز روبینہ لکھ کر ٹیکنشن نے اُن کی جانب بڑھا دیا۔ زرینہ نے بطور احتیاط اپنی باجی کا نام بتول کی بجائے مسز روبینہ لکھوایا تھا۔

لفافہ تھامے دونوں لیب سے باہر نکلیں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر رکشا کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگیں۔

کالج کی چاردیواری میں پہنچ کر دونوں کے راستے حسبِ معمول جدا ہو گئے۔ بتول اسٹاف روم میں آئی۔ وہاں چند ایک کولیگ لیکچررز موجود تھیں۔ اُنہیں اُس کے باپ کی وفات کا علم تھا۔ وہ افسوس کرنے لگیں۔ ملنے ملانے اور تعزیت میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ وہ پڑھانے کیلئے خود کو فٹ محسوس نہیں کرتی تھی۔ چپڑاسی کو چائے کا کہہ کر لائبریری میں آ بیٹھی۔ شیلف سے ایک کتاب اُٹھا کر اپنے سامنے رکھ لی۔ صفحے پلٹتے ہوئے سوچنے لگی۔

''اگر ٹیسٹ کی رپورٹ پازیٹو آتی تو؟''

خود کو کوسنے لگی۔ جو عذاب جان پر اُترا نہیں تھا، اُس کے بارے میں سوچنا حماقت تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسے میں ہینڈ بیگ میں رکھا ہوا فون دروازہ بن گیا اور دروازے پر کسی نے دستک دینا شروع کر دی۔ اُس نے فون نکال کر سکرین پر ملک امجد کا نام پڑھا۔ آن کرتے ہوئے کان سے لگا لیا۔ ''جی سر! آپ کیسے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''تم کہاں ہو؟ میں اِس وقت حسبِ وعدہ تمہارے گھر پر موجود ہوں۔ اماں جی نے بتایا ہے کہ تم دونوں آج کالج گئی ہوئی ہو۔''

اُسے یاد آیا تو شرمسار سے لہجے میں بولی۔ ''معافی چاہتی ہوں سر! ہم دونوں کو سرے سے یاد ہی نہ رہا کہ آپ نے آنے کا کہا تھا۔ تین بجے تک ہم گھر پہنچ جائیں گی۔ اگر ضروری کام ہے تو اِسی وقت نکل پڑتی ہیں۔''

وہ بولا۔ ''میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر آ رہا ہوں۔ تم سے کچھ باتیں بھی کرنا ہیں۔ کیا ہم شہر میں مل لیں؟''

اُس نے کہا۔ ''کیوں نہیں۔ آپ جہاں کہیں، ہم وہاں آ جاتی ہیں۔''

''میں دو بجے تمہارے کالج کے گیٹ پر تمہارا انتظار کروں گا۔''

اُس نے حامی بھر کر رابطہ منقطع کر دیا۔

دو بجے اُس نے دونوں کو پک کیا اور شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں لے آیا۔ فیملی روم میں بیٹھ کر کھانے کا آرڈر دینے کے بعد بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم میری حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی کو غلط پہناوا نہیں پہناؤ گی۔ کھانے کے دوران ہم گفتگو کریں گے، پھر واپس گھر چلے جائیں گے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کچھ پتہ چلا؟''

وہ بولا۔ ''نہیں۔ اِس ٹاپک پر کھانا کھانے کے بعد میں گفتگو ہو گی۔ تب تک میں تم دونوں کو ہنستے مسکراتے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ دونوں مسکرانے لگیں۔ کھانا ختم ہوا تو وہ بولا۔ ''میں نے تمہارے ابا جی کے فون میں فیڈ تمام نمبروں کو ٹرائی کیا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک نمبر ایسا ہے جو بار بار ٹرائی کرنے پر بھی بند ملا۔ میرا اندازہ ہے کہ اُسی نمبر سے تمہارے ابا جی سے بات چیت کی گئی تھی۔ اُس کے بعد کئی فون اٹینڈ کئے گئے ہیں۔ اِس لئے پتہ نہیں چل سکتا کہ اُس کال کا دورانیہ کیا تھا۔ وقت اور تاریخ دیکھ کر میرے اندازے کو تقویت ملتی ہے۔''

"سمجھ میں نہیں آیا کہ اُنہوں نے پھر مجھ سے کوئی رابطہ کیوں نہیں کیا۔ کیا اُن کا مقصد پورا ہو چکا ہے؟ یا اباجی کی وفات نے اُن کے مشن کو ناکام بنا دیا ہے؟" بتول نے کہا۔

"دونوں باتیں بعید از امکان نہیں ہیں۔" امجد نے کہا۔ "میں تم سے ایک اجازت لینا چاہتا ہوں۔ میں بہت غور و خوض کے بعد اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے سراغ رسانی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میری نظر میں ایک آدمی ایسا ہے جو میری بھرپور مدد کر سکتا ہے۔ اُس سے کام لینے کیلئے اُسے اپنا ہم راز بنانا ناگزیر ہوگا۔ کیا مجھے اُسے ہمراز بنانے کی اجازت دیتی ہو؟"

وہ سہم کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے شاکی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُٹھ کر اُس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ دونوں شانوں سے پکڑ کر زرینہ کے عقب میں دیوار کی طرف لے گیا۔ آہستہ سے بولا۔ "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا دیرینہ ملازم منیر اقصائی ایسے کاموں میں بے انتہا مہارت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ چند ہی دنوں میں ہمارا دشمن بے نقاب کر کے ہمارے سامنے لے آئے گا۔"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں امجد صاحب! پلیز مجھے تماشا نہ بنائیں۔ میں ایک باغیرت باپ کی بیٹی ہوں۔ اُس باپ کی بیٹی جس نے بیٹی کی بے حیائی پر یقین کرنے کیلئے مجھ سے باز پرس کرنے کی زحمت بھی نہیں کی اور جان دے دی۔ مجھ پر کرم کریں اور علاقے میں مجھے یوں برہنہ نہ کریں۔"

زرینہ نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ "امجد صاحب! اگر یہ بات باہر نکل گئی تو سوچیں کہ باجی کی شادی کیسے ہو پائے گی؟"

امجد چند لمحوں تک اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ دل میں اپنا تجزیہ کرتا رہا۔ پھر اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ "بڑے کہتے ہیں کہ انسانی جسم میں خالق کو آنکھیں سب سے پیاری ہوتی ہیں کیونکہ اِنہیں وہ اپنے ہاتھ سے بناتا ہے۔ میں اِن کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تم سے شادی کروں گا۔"

وہ دیدے پھاڑے اپنے چاہنے والے کو دیکھنے لگی۔ ہولے سے بولی۔ "امجد صاحب! محبت اور ہمدردی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عورت کا دل محبت کے نام پر دھڑکتا ہے اور ہمدردی پر احساسِ کمتری کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ آپ کو میں نے اپنے بارے میں تفصیل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بتلا دیا تھا، پھر بھی......"

امجد نے گردن موڑ کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ وہ بے نیازی ظاہر کرنے کیلئے سلاد سے کھیلنے میں مشغول تھی۔ وہ بتول کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولا۔ "میں اِن دونوں جذبوں کے مابین حائل مہین سے پردے کی حیثیت سے بخوبی آگاہ ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں بتول! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میرے باپ نے چند دن قبل تم دونوں بہنوں کو اپنے خاندان میں بیاہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرا چچا زاد بھائی رئیس یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ اباجی نے یہ فرض اپنے سر لینے کے بعد اپنی اَنا کا لحاظ نہیں رکھا اور اپنے بھائی کے پاس جانے اور اُسے اپنا حکم سنانے سے دریغ نہیں کیا۔"

وہ سانس لینے کیلئے رُکا۔ اُس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔ "جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ تمہارے گھر میں دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میری تلاش ختم ہو گئی ہے۔ یوں لگا جیسے تم ہی وہ لڑکی ہو جس کی تلاش میں میں اَب تک مارا مارا پھرتا رہا ہوں۔ ہاں! جب تم نے مجھے نوٹ بک پڑھنے کیلئے دی، میں نے پڑھی تو میرا تمہیں اپنانے کا ارادہ ایک مرتبہ ڈانواں ڈول ہوا۔ جب میں نے یہ سوچا کہ جس گناہ میں تمہاری مرضی شامل نہیں تھی، جس گناہ گاہ کی طرف تم نے اپنی مرضی سے قدم نہیں اُٹھایا، اُس جرم سے تم بری الذمہ ہو۔ جب خدا تمہیں اِس جرم سے بری کرتا ہے تو میں کون ہوتا ہوں تم پر اُنگلی اُٹھانے والا اور ہمدردی کے جذبات رکھنے والا۔ مجھے تم سے ہمدردی نہیں، محبت ہے۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ امجد نے کھلے ہوئے منہ پر بڑی نرمی سے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم کچھ بھی مت کہو۔ تمہاری آنکھیں بولتی ہیں۔ آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں، کبھی ریاکاری نہیں کرتیں۔ یہ پیاری پیاری آنکھیں مجھے خوبصورت سا اعتراف دے رہی ہیں۔ یہ مجھے کہہ رہی ہیں کہ تم بڑے خوش قسمت مرد ہو۔ دنیا سے الگ تر لڑکی نے تمہیں اپنا آپ سونپنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میں ٹھیک سُن رہا ہوں، میں درست دیکھ رہا ہوں۔ ہے ناں؟"

وہ ٹالنا چاہتی تھی۔ ذہن بڑی تیزی سے ریشم کے تانے بننے میں مصروف تھا۔ دل نے کہا۔ "کسی اور کو اپنا ہاتھ تھماؤ گی تو ہاتھوں پر لگی نادیدہ آلائشیں چھپانے میں جوانی گزر جائے گی۔ ہر آن دھڑ کا لگا رہے گا۔ ہر آن عدم تحفظ کا شکار رہو گی۔ اِسے تو تم نے اپنا آپ آئینہ بنا کر دکھا دیا ہے۔ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔ تم نے کوئی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اُس نے

سننے اور پڑھنے میں بھی کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ وہ تمہاری مدد کرنے آیا تھا۔ اپنی مدد کیلئے دامن پھیلائے تمہارے آگے کھڑا ہے۔ اسے بے مراد واپس نہ بھیجو۔"

دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے غور کیا تو یوں لگا جیسے وہ امجد کے نام کا ورد کئے جا رہا تھا۔ کچھ بھی بتلانے کی بجائے اُس نے سر جھکا دیا۔ جھکے ہوئے سر نے امجد کے چوڑے چکلے سینے میں پناہ تلاش کر لی۔ وہ ہولے سے بولی۔ "اگر آپ کی محبت نے مجھے اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر مجھ سے کچھ بھی مت پوچھئے اور جیسا جی میں آئے، ویسا ہی کیجئے۔ میں نہیں جانتی کہ کسے ہم راز بنانا ہے، کس سے اپنا آپ چھپانا ہے۔ میری زندگی تو اماں جی اور زرینہ تک ہی محدود ہے۔"

دروازے میں گرے ہوئے بے جان وجود کو بانہوں میں اُٹھا کر بیڈ پر لٹانے والے کی سانس وہیں رُک گئی تھی۔ آج یہ بھی پتہ چلا تھا کہ بے ہوش وجود اور جوانی کی ہوش میں سانسیں لیتے ہوئے وجود کی تپش اور گداز میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ موسم سرما میں بہتا ہوا نیم مُردہ دریا تھا۔ یہ آگ کا صحرا ہے۔

چاہنے والوں کو کبھی وقت کے گزرنے کا پتہ نہیں چلتا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ زرینہ نے کھانس کر دونوں کو وقت کے گزرنے اور اپنے موجود ہونے کا احساس دلایا۔ وہ جھینپ کر امجد سے الگ ہو گئی۔ سرخ رخسار اور لرزتے ہونٹ لئے ڈائننگ چیئر پر آن بیٹھی۔ محبت آن کی آن میں نئی ادائیں سکھا دیتی ہے۔ وہ برسوں سے چپکی ہوئی زری سے بھی نظریں چرا کر بتلانے لگی کہ وہ اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ اُس کے ساتھ رہنے کے باوجود اُس جیسی نہیں رہی۔ ایک چاہنے والے نے ایک پل میں اُس کی دنیا بدل ڈالی تھی۔ زرینہ نے کہنی پسلیوں میں نرمی سے چھوتے ہوئے سرگوشی کی۔ "آج میری باجی کو میری موجودگی میں چرا لیا گیا ہے۔ لگتا ہے چور سے کہیں زیادہ جلدی چرائے جانے والے سامان کو تھی۔"

وہ شرمسار ہو کر مزید جھک گئی۔

امجد بہت بڑے اور ذمہ دار عہدے پر فائز تھا۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کا عادی تھا۔ عامیانہ سی کوئی بھی حرکت اُس کے اسٹیٹس کو برباد کر سکتی تھی مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ محبت ایسا جذبہ ہے جو بھرے پُرے جوان کو آن کی آن میں بچہ بنا دیتا ہے۔ وہ بچہ بن کر سوچ رہا تھا۔ "کاش! میں جج جیسے اعلیٰ عہدے پر فائز نہ ہوتا تو اِس نزاکت پری کو دونوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وں میں اُٹھا کر ہوٹل کے گراؤنڈ فلور میں ناچتا ہوا جاتا اور دنیا کو بتلاتا کہ میرے دل نے ں کی تمنا کی تھی، اُسے پا لیا ہے۔ ہے کوئی مجھ جیسا خوش قسمت تو سامنے آئے......"

اتنا بڑا بچگانہ قدم تو نہ اُٹھا سکا البتہ اُسے شرارت بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد بولا۔ بت نے دلوں میں تفریق کا بیج ڈال دیا ہے۔ تم دونوں سگی بہنیں ہو۔ زری کو بہن سمجھتا ں۔ تمہیں نہیں۔ تمہیں اپنا سب کچھ مان بیٹھا ہوں۔ آئی لو یو بتول! آئی لو یو......"

وہ کن اکھیوں سے احمقوں کی طرح پورا منہ کھول کر ہنستی ہوئی زرینہ کو دیکھنے لگی۔ سوچنے ں۔ "ہائے! زندگی بھی کیا رنگ دکھاتی ہے۔ پیچھے بھاگو تو آگے آگے بھاگنے لگتی ہے اور ں کو للچاتی جاتی ہے۔ رُک جاؤ تو پلٹ کر احاطہ کرنے لگتی ہے۔ اگر مجھے اغوا نہ کیا جاتا تو ے امجد کی مدد کی ضرورت نہ پڑتی۔ اُسے فون نہ کرتی تو اتنا خوبصورت لمحہ میری زندگی میں ید کبھی نہ آتا۔"

کتنا بڑا سچ ہے کہ دنیا کی تمام قوتوں میں سب سے زیادہ طاقتور قوت، محبت کا ربہ کہلاتی ہے۔ تبھی زندگی کی تمام تر رعنائیاں محبت کرنے والے کے قدموں میں ڈھیر کر ا جاتی ہیں اور کسی زیاں کا، کسی خسارے کا احساس تک نہیں ہوتا۔

❁❁❁

دل میں رہنے والا دل سے دور جانے لگا۔ رئیس کو دل میں جگہ دینے پر پچھتانے لگی۔ لطی کا احساس ہوا۔ اُس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ رئیس بھونرا صفت انسان ہے، اُس کے اظہارِ محبت پر یقین کرتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ دروازے سے ھسے گا تو بری طرح پٹ جائے گا۔ مقابل میں کوئی ایرے غیرے کی بیٹی نہیں تھی۔ قدرت نے اُسے حسن کی چمکتی سیج پر بیٹھا کر سیر بنایا تھا، اس کے باپ کی دولت اور فرعونیت اُسے سوا یر بنائے رکھتی تھی۔ تبھی وہ دبے پاؤں کھڑکی سے چوروں کی طرح بدن کی عمارت میں داخل ہوا تھا اور اپنے گندے پیروں سے دل کی دھرتی تک کو گندا کر گیا تھا۔

لڑکیاں عمومی طور پر چنچل اور شرارتی مزاج انسان کو پسند کرتی ہیں۔ رئیس ایسا ہی تھا۔ اُس کی عادات لڑکیوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھیں۔ کل تک اچھی لگنے والی باتیں شانی کو اب بری لگ رہی تھیں۔ رئیس کے برعکس عالمگیر کی سنجیدہ مزاجی اُسے اپنی جانب راغب کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عالمگیر رئیس کی طرح چھچھوری حرکتیں نہیں کرتا بلکہ بڑے

لوگوں کی طرح ہر وقت سنجیدگی کو خود پر طاری رکھتا ہے۔ وہ بڑی آہستگی سے رئیس کی طرف سے پلٹ کر عالمگیر کی طرف آ رہی تھی۔ ایسے میں اُس کی گاڑی نے ملک زادوں کی کوٹھی کے سامنے خراب ہو کر اُسے زقند بھر کر عالمگیر کی گود میں پہنچنے کی پُرقوت تحریک بخش دی تھی۔

کیمپس میں رئیس اُسے ملا تو اُس کی بے رخی کو بھانپ کر پریشان ہو گیا۔ فری ٹائم میں اُسے روک کر بولا۔ "شاہانہ! تم کچھ کھنچی کھنچی سی لگ رہی ہو۔ کیا میرے گھر والے پسند نہیں آئے؟"

وہ دل ہی دل میں بولی۔ "میں وہاں اُن کو پسند کرنے نہیں، اپنی نمائش کرانے کے لئے گئی تھی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" قدرے بے رُخی سے گویا ہوئی۔ پھر اُسے کوٹھی کا نمبر اور کالونی کا نام بتلاتے ہوئے بولی۔ "کیا یہ کوٹھی تمہاری ہے؟"

وہ عام سے انداز میں بولا۔ "ہاں! یہ ہماری کوٹھی ہے۔"

"کرائے پر دے رکھی ہے؟"

"نہیں۔" وہ اُس کی کرید پر قدرے پریشان ہو کر بولا۔ "لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ کیا کسی کو کرائے پر دینا چاہتی ہو؟"

"نہیں!" وہ اُس پر نگاہیں گاڑتے ہوئے بولی۔ "کرائے پر نہیں ہے، تمہاری فیملی وہاں نہیں رہتی تو پھر خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟"

وہ مسکرانے لگا۔ سینہ پھلا کر بولا۔ "مس شاہانہ! پیٹ تو دس ایکڑ زمین سے بھی بھر جاتا ہے۔ تمہارے باپ نے کیوں سینکڑوں ایکڑ رقبہ خرید رکھا ہے؟ رہائش کیلئے ایک ہی کوٹھی کافی ہوتی ہے، تمہارے باپ کی لاہور والی کوٹھی سمیت پانچ کوٹھیاں ہیں جن میں سے کوئی بھی کرایہ پر نہیں دی گئی۔"

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "میری بات کا جواب دو۔"

"پاپا کی سیاسی ریٹائرمنٹ پر سیاست کی دستار بھائی کے سر پر سجا دی گئی تھی۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ چار پانچ سال کے بعد حلقے میں جانے پر لوگ ووٹ دے دیتے ہیں؟ نہیں مس شاہانہ! سیاست کی گھوڑی بہت اتھری ہوتی ہے۔ دونوں ٹانگوں میں اس کی کمر دبوچ کر رکھنا پڑتی ہے۔ مضبوط ہاتھوں میں لگامیں اور لوہے کی رکابوں میں جما کر پیر رکھنا پڑتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ پھر کہیں جا کر یہ قابو میں آتی ہے۔ جونہی ہاتھوں، پیروں یا ٹانگوں میں سے کسی بھی عضو کی گرفت نرم پڑتی ہے، بدک کر بے قابو ہو جاتی ہے اور اپنے سوار کو زمین پر گرا کر دور بھاگ جاتی ہے۔ ایسی کئی کوٹھیاں سیاست کی الھڑ گھوڑی کو قابو میں رکھنے کیلئے بھائی نے زیرِ استعمال رکھی ہوئی ہیں۔"

وہ بولی۔ "اتنی لمبی چوڑی کہانی سنانے کی بجائے صاف صاف الفاظ میں مجھے بتلاؤ۔ میرا باپ شاہ سوار ہے، میں نہیں ہوں۔"

"اوہو بھئی! یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" وہ اس تذکرے کو ٹالنا چاہتا تھا۔ وہ اَڑ گئی تو بولا۔ "میں نے کہا ہے کہ ہر وہ کام جو عوامی اسٹیج سے اُتر کر سیاست دان کرتے ہیں، وہ اُس کوٹھی میں کیا جاتا ہے۔"

"یعنی سیاسی حریفوں کی کمزوریوں کو پکڑنے اور اپنی دسترس میں رکھنے کے کام......؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "جب سب کچھ سمجھتی ہو تو پوچھتی کیوں ہو؟"

"تمہارے بھائی نے میرے باپ کی طرح مجرموں کو پناہ بھی دے رکھی ہو گی؟"

وہ سمجھ گیا کہ شانی اُسے چھیڑ رہی ہے۔ اُس کا کسی نئے انداز سے امتحان لے رہی ہے۔ ہنس کر بولا۔ "ہاں بھئی! آج کل اقتدار میں اِن رہنے کیلئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جس کا انڈر گراؤنڈ جتنا مضبوط ہو گا، دشمن اتنا ہی دَب کر رہیں گے۔ تم جانتی ہو کہ دَبا کر رکھنے کیلئے طاقت کے ساتھ ساتھ ہوش کے ناخن بھی لینا پڑتے ہیں۔"

"کیا تمہارے بھائی نے کبھی سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے لڑکیاں اغوا کی ہیں؟" وہ اُس کی آنکھوں میں براہِ راست جھانکتے ہوئے بولی۔

وہ چونک گیا۔ سٹ پٹا کر دیکھنے لگا۔ وہ کیسا امتحان لے رہی تھی؟ کائیاں باپ کا بیٹا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں تھاما ہوا موبائل فون لے کر چیک کرنے لگا۔ کہیں وہ وائس ریکارڈنگ تو نہیں کر رہی۔ اُس کے فون کا ماڈل دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس ماڈل میں ریکارڈنگ کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اُس کے سراپا کا بہ نظرِ احتیاط جائزہ لیا۔ کہیں کوئی تار یا مائک وغیرہ نظر نہیں آیا تو مطمئن ہو کر بولا۔ "تم نے کوئی اخبار یا میگزین تو جائن نہیں کر لیا؟ اتنے گہرے اور مشکل سوال تو صحافی بھی ہم سے نہیں کرتے۔ بائی دا وے...... میں نے کبھی بھائی کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کیا کرتا پھرتا ہے، اُس کی سیاسی

مصروفیات کیا ہیں، میں اِس پر توجہ نہیں دیتا۔ پاپا اور بھائی بھی مجھے اپنے مشاغل سے رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پہلے تعلیم مکمل کرو، پھر سیاسی تربیت حاصل کرنا۔"

یہ تو وہ جانتی تھی کہ سیاست کے میدان میں نا آموز گھوڑا پہلی جست میں ہی پڑ ہے۔ برسوں کی کٹھن مشق کے بعد مضبوط سانس والا بااعتماد گھوڑا ہی میدان میں اُتارا ہے۔ بولی۔ "اچھا چھوڑو سیاسی باتوں کو۔ رومانٹک گفتگو پر تو کوئی پابندی نہیں ہے ناں؟"

وہ اُس کا بازو تھام کر بولا۔ "آؤ کیفے میں چلتے ہیں۔"

دونوں برابر چلتے ہوئے کیفے میں آئے۔ خالی ٹیبل دیکھ کر بیٹھ گئے۔ وہ بولی۔ "تم حاصل کرنے کیلئے کس حد تک جاسکتے ہو؟"

وہ اُسے عجیب سی نظروں سے گھورنے لگا۔ اُسے سنجیدہ پا کر بولا۔ "شاہانہ! تمہارا رو آج فطری ہرگز نہیں ہے۔ کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے؟"

وہ ٹیبل پر دھرے ہوئے شیشے کے گلاس سے کھیلنے لگی۔ پیشانی پر اضطراب آلود شکنیں اُبھر آئیں۔ آہستگی سے بولی۔ "میرا باپ تمہاری پارٹی کی روائتی مخالف پارٹی کا رُکن اور کبھی بھی اپنی وفاداریاں نہیں بدلے گا۔ کیا ہماری شادی میں پارٹیوں کا فرق پریشانی باعث نہیں بنے گا؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو شاہانہ! ہم شادی کرنے جارہے ہیں ناں کہ اسمبلی پہنچنے کیلئے الیکشن لڑ رہے ہیں۔ ویسے بھی اسمبلی میں ایک دوسرے کو طمانچے اور گھو دکھانے والے نجی زندگی میں ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ گھروں میں تعلقات نوعیت قطعی مختلف ہوتی ہے۔ میڈیائی فورمز پر اور اسمبلی میں اپنی واہ واہ کرانے کیلئے ایک دوسرے کے گریبان پکڑنے والے شام کو فون پر ٹھٹھے لگا رہے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی پرفامنس پر داد کے ڈونگرے برسا رہے ہوتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "پاپا ایسے نہیں ہیں۔"

"تبھی تو پچھلی صفوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔"

طنز برا لگا۔ بولی۔ "یعنی تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہارا بھائی کبھی بھی میرے پاپا کو اپنی پار میں آنے کا مشورہ نہیں دے گا۔"

وہ بے تکی گفتگو سے اکتا گیا۔ کافی کا آرڈر دیتے ہوئے بولا۔ "تم آج مِس فٹ ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں جانتا کہ ایسی کیوں ہو مگر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں تجھے کیفے میں رومانوی گفتگو کیلئے لے کر آیا ہوں۔ پلیز! وائنڈ اَپ دِس آل شاہانہ ڈیئر! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میرے گھر والوں نے مجھے لائن کلیئر کا اشارہ دے دیا ہے۔ پاپا تمہاری تعریف کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ یوں لگتا ہے جیسے کوئی چاندرات کے پچھلے پہر میں چپکے سے اُترا ہو اور ایک جھلک دکھلا کر غائب ہو گیا ہو۔"

انگلیاں میز پر بجاتے ہوئے، اُس کی بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گنگنانے لگا۔ "نی چنبے دِیے بند کلیے، تینوں جیہڑے ویلے رَب نے بنایا...... سوچاں وچ آپ پے گیا، ایہہ دُوجا چن کِدھروں چڑھ آیا...... نی چنبے دیے بند کلیے......"

اُس کا گنگنانے اور حسن کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑنے کا انداز بڑا والہانہ اور جاندار تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ جی جان سے نثار ہو جاتی۔ مگر اِس وقت اُسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بولی۔ "مسٹر رئیس! ہم بہت اچھے دوست ہیں۔ پاپا میری شادی اپنے کسی دوست کے بیٹے سے کرنا چاہتے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے فون پر بتلایا ہے کہ انہوں نے تقریباً ہاں کر دی ہے۔ ویسے بھی محبت روگ بن جائے تو اُسے چھوڑنا بھلا ہوتا ہے۔"

گاڑی ریورس کرتے ہوئے سامنے نہیں دیکھا جاتا۔ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا جاتا ہے۔ وہ پلٹ نہیں سکتی تھی۔ نظریں جھکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "مجھے یقین ہے کہ ہماری دوستی عمر بھر قائم رہے گی۔ آئی ایم ویری ساری ڈیئر!"

اُس کی ساری شوخی ہوا ہو گئی۔ اُسے شاہانہ کی طرف سے اتنی بے رخی کے ساتھ قطع تعلق کی توقع نہیں تھی۔ کئی ساعتوں تک اُس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی۔ خود پر قابو پانے کے بعد بولا۔ "میں قیس یا دھید و نہیں ہوں، تم لیلیٰ یا ہیر نہیں ہو۔ تم جیسی زمانے میں لاکھوں لڑکیاں موجود ہیں۔ میرے جیسے چاہنے والوں کا شمار بھی ممکن نہیں ہے۔ ہم جس کلاس سے تعلق رکھتے ہیں، اُس میں اولاد کی مرضی کے بغیر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے۔ یہ مڈل کلاس اور لوئر کلاس کی پرابلمز ہیں جن سے ہم لوگ جان چھڑانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔"

وہ بہت آہستہ آواز میں بول رہا تھا۔ اطراف کی میزوں تک اُس کی آواز نہیں جارہی تھی۔ بولا۔ "جیسے مجھے اپنے لئے لڑکی چننے کا حق حاصل ہے، تمہیں بھی اسی طرح اپنا جیون ساتھی چننے کی مکمل آزادی ہے۔ میں تم سے محبت کرتا تھا اور تم نے بھی ایسے ہی جذبات کا

اظہار کیا تھا۔ آج ثابت کر رہی ہو کہ میرا دل رکھنے کیلئے تم نے جھوٹ بولا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ جو مل رہا ہے، غنیمت ہے۔ مجھے تمہاری دوستی قبول ہے۔"

شاہانہ کو یوں لگا جیسے اُس پر پڑا منوں بھاری پتھر آنِ واحد میں اُتر گیا ہو۔ عافیت کی سانس لے کر بولی۔ "مجھے تمہاری وسعتِ قلبی سے یہی توقع تھی۔ تم بہت اچھے ہو۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ "مس شاہانہ! کیا تم دوستی اور محبت کے فرق کو سمجھتی ہو؟"

"کیا مطلب؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے متعجب ہوئی۔

"محبت دنیا میں کسی ایک سے ہوتی ہے۔" وہ سمجھانے لگا۔ "دوستی ہر ایک سے ہوتی ہے۔ دوستی کو خراج دے کر زندہ رکھنا پڑتا ہے۔ خراج بھی ایسا کہ جو بدن سے لے کر روح تک کو سرشار کر دیتا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں کبھی بھی دوستی محبت میں نہیں بدلی بلکہ اپنی مخصوص ڈگر پر ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے۔ ان تعلیمی اداروں میں ہماری سوسائٹی کے لڑکے اور لڑکیاں زندگی کو انجوائے کرنے کیلئے آتے ہیں۔ میں بھی۔ تم بھی۔ سارے۔"

وہ اُس کے بیان کردہ فلسفے کو سرے سے سمجھ ہی نہیں رہی تھی۔ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ میز پر جھکتے ہوئے اُس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "کم آن مس شاہانہ! بے دریغ خرچ کرنے سے بھی کبھی نہ ختم ہونے والے جذبات کو دوستی کی ٹرے میں رکھ کر سجائیں، لطف آگیں خراج بنائیں۔ آؤ! چل کر دنیا کے ہجوم میں کہیں تنہائی تلاش کرتے ہیں۔"

اُس کا چہرہ کانوں کی لووں تک سرخ ہو گیا۔ سمجھنے میں بہت دیر لگی تھی۔ سمجھ کر پچھتانے لگی کہ نہ سمجھا ہوتا تو اچھا تھا۔ یکبارگی غصے کی ایک تند و تیز لہر آنکھوں سے مترشح ہوئی اور شعلے کی طرح لپک گئی۔ اُس نے پانی سے بھرا ہوا گلاس دائیں ہاتھ میں تھاما اور کھڑی ہو گئی۔ دانت پیستے ہوئے بولی۔ "تم واقعی گھٹیا انسان ہو۔ کچھ وقت گزرنے پر تم نے میری محبت بھی اُسی ٹرے میں سجانے کی خواہش ظاہر کرنا تھی جس میں دوستی کے جذبے کو رکھ بیٹھے ہو۔ میں تمہاری دوستی اور محبت دونوں پر چار حرف بھیجتی ہوں مسٹر رئیس!"

وہ بولا۔ "ہم دونوں ایک ہی سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسی فرسودگیاں کب کی مر چکی ہیں جن کا تم ذکر کر رہی ہو۔ تم خود بھی ایسی پارسا نہیں ہو جیسی بن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دکھا رہی ہو۔"

اِس سے آگے کہے ہوئے رئیس کے الفاظ نے اُس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ یہ آگ لطف دینے والی ہرگز نہیں تھی۔ اُس نے پانی کا بھرا گلاس اس پر الٹ دیا۔ وہ نہایت غیر فطری انداز میں بیٹھا رہا۔ بالوں سے پہلے چھلکتے بعد میں ٹپکتے ہوئے پانی کو آنکھیں اوپر کر کے دیکھتا رہا۔ زبان کو گیلے ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولا۔ "تم مغرور ہی نہیں، نہایت احمق اور خود سر بھی ہو۔ جلد ہی کسی اور رنگ میں ہماری ملاقات ہو گی۔"

وہ اُس کی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے کیفے سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف چل دی جہاں عالمگیر اُس کا منتظر تھا۔

گھر پہنچ کر سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی۔ رحمت بی کو بلا کر کہنے لگی۔ "عالمگیر کو بلا کر لاؤ۔"

چند منٹوں کے بعد عالمگیر کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اجازت کا طلبگار ہوا۔ اندر آنے پر سوالیہ نگاہوں سے اُسے خاموشی سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "تم ہمارے ملازم ہو۔ ملازم اپنے مالک کو خوش رکھنے کی تنخواہ لیتا ہے۔ کیا تم مجھے خوش کر سکتے ہو؟"

وہ حیرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ملازم خوش رکھنے کی تنخواہ لیتا ہے۔ تم خوش کرنے کی بات کر رہی ہو۔ کھل کر کہو، تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

وہ پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کئی لفظ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ادا کرتے ہوئے انسان آنکھیں ملانے کی تاب نہیں رکھتا۔ بولی۔ "میری کلاس کی تمام لڑکیاں ہفتے مہینے میں ایک دن اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ تنہائی میں گزارتی ہیں۔ میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کی نظروں میں گرنا چاہتی ہوں۔ تم جانتے ہی ہو کہ میرے باپ کا شملہ اتنا اونچا ہے کہ اُس پر لگا ہوا داغ میلوں دور سے دکھائی دینے لگے گا۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ اُس کی ننگی گردن کو دیکھ کر بہ مشکل خود پر قابو کئے کھڑا تھا۔ ہر لفظ اِس سے بڑا امتحان بن کر اُس پر اترنے لگا تھا۔ جذبات آلود آواز میں بولا۔ "نادان نہیں ہوں۔ جانتا ہوں کہ تمہاری تنہائی تمہیں کھانے لگی ہے۔ میں سمجھتا ہوں مگر تمہارے لئے کسی بوائے فرینڈ کا انتظام کرنے سے قاصر ہوں۔ ملازم پر اگر مالک کو خوش رکھنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو

اُس کے فرائض میں بھی یہ بھی شامل ہوتا ہے کہ وہ ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دے کر راست پر لے آئے۔"

وہ اچانک پلٹ پڑی۔ عالمگیر نے دیکھا کہ فرطِ جذبات سے اُس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی وحشت تیر رہی تھی۔ بولی۔ "تم بوائے ہو۔ میرے بن کر بوائے فرینڈ ہی کہلاؤ گے۔"

عالمگیر کے پورے بدن میں عجیب سی بے نام لہر سرائت کر گئی۔ دو قدم پیچھے ہٹتے ہو بولا۔ "مس شاہانہ! خود پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ انسان کی کوئی سطح نہیں ہوتی، کوئی کا نہیں ہوتی۔ صرف خود پر ضبط کرنے کی صلاحیت میں کمی یا زیادتی پر اُس کی کلاس کا انتخا کیا جاتا ہے۔ تم تھرڈ کلاس بن کر پستی میں گرنے کی بجائے فرسٹ کلاس بن کر بام عروج دستک دو تو اچھی لگو گی۔ میں تمہارا فرینڈ نہیں بن سکتا اور نہ ہی تمہیں تمہارے مقام گرنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ آئی ایم ویری ساری مس شاہانہ!"

وہ بجلی کی سرعت سے لپک کر اُس تک پہنچی۔ گریبان کو پکڑ کر دونوں ہاتھوں جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ "عالمگیر! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ میں بھی تو انسان ہوں۔ جیتے جاگتے ماس سے بنائی گئی ہوں۔ جوانی بذات خود آگ ہوتی ہے جو بدن کو جلاتی رہتی ہے ایسے میں پانی ڈالنے سے ہی ذہن معتدل ہوسکتا ہے۔ پانی کی طرح مجھ پر اپنی محبت ٹپکاؤ۔ پلیز! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

وہ اُس کی بات سمجھ چکا تھا۔ گریبان چھڑانے کی کوشش کی تو اس نے گرفت مزید مضبوط کر لی۔ اُسے ساتھ لئے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کے قریب آیا۔ پانی کا بھرا ہو جگ اُٹھایا مسکراتے ہوئے اُس کے سر پر انڈیل کر بولا۔ "چند دن قبل میرے تن بدن میں آگ تھی۔ تم نے دیکھا تھا کہ میں نے ٹھنڈا ٹخ پانی سر میں انڈیل کر اس آگ کو بجھا دیا تھا تمہاری مشکل بھی حل کئے دیتا ہوں۔ تمہارا بدن بھی آن کی آن میں ٹھنڈا ٹھار ہو جائے

پانی نے اپنا کام دکھا دیا۔ وہ تیورا کر بیڈ پر پہلو کی جانب گر گئی۔ اُس کے پیروں سلیپر اُتار کر عالمگیر نے اُسے بیڈ پر ترتیب سے لٹا دیا۔ وہ کھلی کھلی آنکھوں سے اُسے رہی۔ روکنے کی سکت نہیں تھی۔ پانی نے اُس کے نصف بالائی بدن کو تر کر دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اُس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ چند ہی منٹوں میں اُس کی حالت غیر ہونے لگی۔ گرم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک ٹھنڈا ہوا تھا۔ سنبھل کر پھر حرارت پکڑنے لگا تھا۔ حرارت کی نوعیت مختلف تھی۔ اُس نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ دھڑکن کی رفتار کا پتہ نہیں چلا۔ ٹمپریچر کی زیادتی پر متفکر ہوگیا۔ اُس کی گیلی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ ٹھنڈی ٹھار تھی۔

وہ خالی خالی نظروں سے اُسے لرزتا دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اَب کیا کرے؟...... اُسے ہولے ہولے پکارنے لگا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ اچانک اُسے اُس کی کیفیت کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ بھاگ کر نیچے آیا۔ ڈرائیور کو فوری طور پر ڈاکٹر کو اٹھا لانے کی تاکید کی۔ اُلٹے قدموں بھاگ کر شانی کے کمرے میں آیا۔ اُس کی حالت پہلے کی نسبت زیادہ بگڑ چکی تھی۔ اَب تو اُس کا جسم جھٹکے لینے لگا تھا۔ اُس نے جلدی سے اُس پر اونی کمبل ڈال کر اچھی طرح لپیٹ دیا۔ سرہانہ گیلا ہوگیا تھا۔ سر کے نیچے سے نکال کر بدل دیا۔ رحمت بی کو آوازیں دینے لگا۔ وہ بھاگی چلی آئی۔ چھلانگ لگا کر بیڈ پر چڑھ گئی اور شانی کے سر کو گود میں لے کر دبانے لگی۔ سوالیہ نگاہوں سے عالمگیر کو دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اسے نمونیہ ہوگیا ہے؟"

وہ شانی کے گیلے بالوں پر دوپٹہ پھیرتے ہوئے بولی۔ "سر میں اتنا سارا پانی کہاں سے آیا؟"

وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔ "میں نہیں جانتا۔"

ڈاکٹر پہنچ گیا۔ اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اُس نے یکے بعد دیگرے تین انجکشن لگائے۔ چند گولیاں دیتے ہوئے سمجھانے لگا۔ رحمت بی کے پوچھنے پر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ بے بی کو نمونیا ہوگیا ہے۔ میں نے دوا دے دی ہے۔ چند منٹوں میں ہی سنبھل جائے گی۔ دودھ گرم کر کے پلایئے گا اور گھنٹہ بھر کے بعد مجھے فون پر مکمل کیفیت سے آگاہ کردیجئے گا۔"

وہ چلا گیا۔ عالمگیر نے اُس سے کرید کرید کر پوچھا۔ خطرے کی کوئی بات نہ پا کر شانی کے کمرے میں آگیا۔ وہ نسبتاً سکون میں تھی۔ اُسے دل ہی دل میں افسوس ہونے لگا۔ ماں کو کوسنے لگا۔ اُسے تو کبھی بھی پانی سر میں ڈالنے پر نمونیا نہیں ہوا تھا۔ اِسے کیوں ہوگیا؟...... وہ بیڈ کی پائنتی کی جانب قالین پر فوم سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رحمت بی اُس کے خوابیدہ بدن کو سہلا رہی تھی۔ ایسے میں لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے شانی نے عالمگیر کو پکارا۔ وہ اُس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے نزدیک گھسٹ گیا۔ اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ''مس شاہانہ! میں اِدھر ہی ہوں
آنکھیں کھولو پلیز!''

اُس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ بڑبڑائی۔ ''تم میرے قریب رہو۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو
ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے مجھے بلندی سے نیچے پھینکا جا رہا ہے۔ ہائے عالمگیر! میرا دل بُری
طرح ہول کھا رہا ہے۔''

وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔ رحمت بی کے ہاتھ تیز ہو گئے۔ شکوہ کناں نظروں سے
عالمگیر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم مجھے اصل بات نہیں بتلا رہے ہو۔ شانی بی بی کو
ہوا ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں نے کہا ناں کہ نمونیا ہو گیا ہے۔''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔''

''اور کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

''اِس کے سر کے بال اور قمیص بھیگی ہوئی کیوں ہے؟''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''یہ بدتمیزی کرنے لگی تھی۔ میں نے پانی کا جگ اِس پر انڈیل دیا ہے۔''

وہ اُسے کوسنے لگی۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے اُس کی بددعائیں سنتا رہا۔ جان چھڑانے
کیلئے اُسے دودھ گرم کر کے لانے کیلئے کچن میں بھیجا اور خود شانی کے گالوں کو تھپتھپانے لگا
سویا ہوا حسن اَبھی تک آگ پکڑے ہوئے تھا۔ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ''شاہانہ!
کیا تم ہوش میں ہو؟''

اُس نے یکبارگی آنکھیں کھول دیں۔ اردگرد دیکھا۔ اُس پر نگاہ پڑی تو نگاہ ٹھہر گئی۔
منٹ بھر بغیر پلکیں جھپکائے اُسے دیکھتی رہی۔ جونہی آنکھیں بند کیں، پانی کی دو لکیریں
آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر کانوں کی طرف رینگ گئیں۔ اُس نے ہاتھ کی پوروں سے
اُس کے آنسو پونچھے اور گہرے تاسف سے کہا۔ ''مجھے معاف کر دینا شاہانہ! میں
تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔''

نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر ضبط کرنے لگی۔ وہ بولا۔ ''مجھے برا بھلا کہو، مجھ پر
ٹھنڈے پانی کا جگ انڈیل دو، اپنے باپ سے کہہ دو کہ وہ مجھے نوکری سے فارغ کر دے
میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں مگر یوں روؤ مت، مجھ سے تمہارا رونا دیکھا نہیں جاتا۔''

اُس نے اچانک اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر اُس پر مرکوز کرتے ہوئے تلخی سے کہا۔
''میرے رونے کا تم پر اثر پڑتا ہے؟''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ہوں۔''

''مجھے بیمار کر کے بستر پر پھینک سکتے ہو، روتے دیکھ نہیں سکتے؟'' وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔
عالمگیر نے دیکھا کہ اُس کے پُرگداز ہونٹ پر دو دانتوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ بولی۔ ''میں
[illegible]ری ہوں۔ آگ لگی تو چیخ پڑی کہ ہائے آگ لگ گئی ہے۔ تم اپنی آگ کو بنا کسی کو خبر کیے
پانی سے بجھاتے رہتے ہو۔ مجھے بھی پانی سے ٹھنڈا کرنے کے چکر میں مجھے بیمار کر بیٹھے ہو۔
تمہارا قصور نہیں۔ میں ہی بری ہوں۔''

وہ لجاجت سے بولا۔ ''میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ معافی مانگی ہے۔ تم میرے لفظوں کو
معتبر کر دو۔ دوبارہ تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔''

اُس نے باقاعدہ طور پر اُس کے سامنے دونوں ہاتھ باندھ دیے۔ اُس نے سچ کہا تھا۔
معافی مانگنا اُس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ وہ چند لمحے بےیقینی کے عالم میں اُسے گھورتی
رہی۔ کروٹ بدل کر اُس کی طرف مڑ آئی۔ ایک ہاتھ سے اُس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو
تھام کر بولی۔ ''تم اور رئیس دیکھنے میں ایک جیسے ہو۔ وہ ہائی کلاس کا ہے، تم لوئر کلاس کے
ہو۔ وہ سمجھتا ہے کہ اعلیٰ سوسائٹی کے خاندانوں کی لڑکیوں اور لڑکوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔
اپنی خواہش پر جو جہاں چاہے، جیسے چاہے اپنی عزت سے کھیلتے ہوئے دوسرے کی عصمت
کی دھجیاں بکھیر دے۔ میں اُس سے محبت کرتی تھی۔ وہ مجھ سے دوستی رکھنا چاہتا تھا۔ جانتے
ہو وہ دوستی کس تعلق کو کہتا ہے؟''

وہ بولا۔ ''تم زیادہ باتیں نہ کرو۔ میں اِن لوگوں کو تمہاری نسبت زیادہ بہتر انداز میں
جانتا ہوں۔''

وہ کراہی۔ ''تم نہیں جانتے ہو اِن درندوں کو۔ یہ انسان نہیں ہیں۔ آج کے دن
میں نے اُس کی دوستی کی پیشکش پر اُس کے سر میں پانی انڈیلا۔ آج کے دن ہی تم نے
مجھے پانی میں نہلاتے ہوئے اپنی عظمت کا ثبوت دیا۔ ہائے کتنے اچھے ہو تم! ہائے کتنی بری
ہوں میں!''

وہ اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے اور لبوں پر پھیرنے لگی۔ ایسے میں رحمت بی

دودھ کا پیالہ تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ اپنے سر کو اوپر نیچے حرکت دینے لگی۔ یوں جیسے وہ آن کی آن میں شانی بی بی کے بیمار ہونے کے سبب تک پہنچ گئی ہو۔ عالمگیر کے قریب تپائی پر دودھ کا پیالہ رکھ کر بولی۔

"تم نے ہی بی بی کو ٹھنڈا کیا تھا، اَب اپنے ہاتھ سے دودھ پلا کر گرم بھی کرو۔"

ایک نگہِ غلط دونوں پر ڈال کر اُلٹے پیروں کمرے سے نکل گئی۔ عالمگیر نے ہاتھ چھڑائے، پیالہ اُٹھا کر اُسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کہنیوں کے بل اُٹھ بیٹھی۔ خاموشی کی زبان میں کہنے لگی۔ "رحمت بی نے کہا ہے کہ اپنے ہاتھوں دودھ پلا کر گرم کرو۔ کیا تم نے رحمت بی کی بات کو سنا نہیں یا سمجھنا نہیں چاہ رہے ہو۔"

اس نے آہستگی سے دودھ کا پیالہ اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ ایک گھونٹ بھرتی، اُس پر ایک نگاہ ڈالتی۔ اِس طرح شاید اُس نے زندگی میں کبھی بھی دودھ نہیں پیا تھا۔ ہر نگاہ چیخ کر کہتی تھی۔ "دودھ کا گھونٹ پیٹ میں اترتا ہے، تمہیں نظر کے راستے سیدھا دل میں اتار رہی ہوں۔"

وہ ہولے سے بولا۔ "شاہانہ! تمہارا کہنا سچ ہے، سوچنا جھوٹ ہے۔ ہم دونوں کی کلاسوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ ٹھنڈا پانی تمہارے دماغ کا بخار اُتار دے گا مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے الٹا اثر لے لیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک انسان ہونے کے ناتے مجھے بھی محبت کرنے کا پورا حق حاصل ہے مگر یہ بھی درست ہے کہ میں لوئر کلاس سے تعلق رکھنے والا عام سا مرد ہوں جو تمہارے باپ کے نزدیک ایک کتے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔"

وہ بے چین سی ہوگئی۔ زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولی۔ "مجھے صرف اتنا یقین دلا دو کہ مجھے میری خامیوں سمیت قبول کرلو گے۔ میرے گناہوں پر اپنی محبت کو سایہ کُنا کردو گے تو میں ہر تفریق کو مٹا دوں گی۔ عالمگیر! میں ایک محبت کرنے والے جھوٹے کو ایک سچے دلدار کیلئے ہمیشہ کیلئے چھوڑ آئی ہوں۔ پلیز! مجھے یقین دلا دو۔"

پیالہ خالی ہو چکا تھا۔ اُس نے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ رہی خامیوں کی بات، تو یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی انسان بھی خامیوں سے مبرا نہیں ہے۔ ہم ہر اُس خامی سے نباہ کر لیتے ہیں جس کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ کبھی دیکھ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی بھی نگلنے پر تیار نہیں ہوتا۔"

وہ اپنے خشک ہوتے ہونٹ زبان سے تر کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمہیں بڑے غور سے دیکھا ہے، پرکھا ہے، تم لوگوں سے ہٹ کر ہو۔"

وہ اچانک مسکرانے لگا۔ وہ استفہامیہ نگاہوں سے اُسے گھورنے لگی۔ وہ بولا۔ "ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دودھ کے ساتھ گولیاں کھانی ہیں۔ میں نے تمہیں دودھ پلا دیا، گولیاں کھلانا بھول گیا۔ اَب تمہیں دودھ کا ایک اور پیالہ پینا پڑے گا۔ میں ابھی رحمت بی سے لے کر آتا ہوں۔"

وہ روکتی رہی مگر وہ رکا نہیں اور پیالہ اُٹھا کر کچن کی طرف چل دیا۔ پانچ دس منٹ بعد دودھ کا پیالہ تھامے کمرے میں آیا۔ گولیاں پتوں میں سے نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھیں اور دودھ کا پیالہ اُس کی سمت بڑھایا۔ وہ مسکرائی۔ "کیا اتنی دیر میں میں بالکل ٹھیک ہوگئی ہوں جو تم دودھ پلانے کی بجائے پیالہ میری طرف بڑھا رہے ہو؟"

وہ بے بسی سے دیکھنے لگا۔ بہانہ بنانے کیلئے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ وہ اُسے بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے سگریٹ کا دھواں بہت ناگوار لگتا ہے۔"

وہ لمبا کش لے کر بولا۔ "اور میں اِس کے بغیر رہنا نہیں چاہتا۔"

وہ پیالہ تھامے ساکت بیٹھی تھی۔ دل میں سوچنے لگی۔ "اگر اپنے ہاتھ سے پینے میں مزہ رکھا ہو تو ساقی گری کیا ہے؟ مَے خانہ کیا ہے؟ پینے والے کی دیوانگی کیا ہے؟...... میں اگر اسے پھر کہوں کہ مجھے اپنے ہاتھ سے دودھ پلاؤ تو بے توقیر ہو جاؤں گی۔ اپنے ہاتھ سے پیوں گی تو بے ذائقہ لگے گا۔ ایسے میں کوئی تو ہو جو میری مدد کرے!"

مدد کرنے والا عین موقع پر پہنچ گیا۔

سوئچ بورڈ پر لگے بٹن کو آن کرتے ہی کمرے میں روشنی پھیل جاتی ہے۔ کبھی کبھی دعا بجلی کی طرح غیر معمولی سرعت سے اوپر جاتی ہے اور اِسی رفتار سے قبولیت کا ہار پہنے پلٹ آتی ہے۔ اُس کی دُعا نے بھی ایسی ہی پرواز کی تھی۔ دروازے میں آ کر ٹھہرنے والی رحمت بی نے کہا۔ "اے عالمگیر! میں نے تجھے کہا تھا کہ بی بی کو اپنے ہاتھوں سے دودھ پلانا۔ تم اس کے ہاتھ میں پیالہ تھما کر اِس نگوڑی سگریٹ کو پینے میں جُت گئے ہو۔ تم پر تف ہے!"

وہ چونک گیا۔ رحمت بی کی طرف شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا۔ پھر شاہانہ کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا۔ وہ شرارت اور امید بھری نگاہوں سے دیکھ کر خاموش التجا کر رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ لمحے شاید اِسی وقت کے انتظار میں تھے۔ شب خون مار کر دونوں کی آدھی عمریں چُرا لے گئے۔ سیانے سچ کہتے ہیں کہ برسوں کے سوئے ہوئے احساسات کو محبت کا پہلا لمحہ ہی جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا ہے۔ اُس نے شاہانہ کے ہاتھ سے پیالہ تھام لیا۔ مریضہ نے پانی کے ساتھ گولیاں حلق میں اُتاریں۔ محبوب کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی زندگی کی شراب کو منہ سے لگاتے ہوئے کن اکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ عالمگیر کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں۔ ''اے بھاگتے رہنے والے! تمہیں میں نے ایک لمحے کو ساکت کر ہی دیا ناں! اب بھاگ کر دکھاؤ تو جانوں۔''

اُس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ دل دھڑک اُٹھا۔ ''میری طرف کیا دیکھتے ہو؟ میں تو پہلے ہی اُسے اپنے تخت پر براجمان کئے بیٹھا ہوں۔ تم ہی اَنا کا راگ الاپتے رہتے تھے۔ اب اَنا کے راگ ملہار کو چھوڑ کر پیار کے رباب کی مدھر تانیں چھیڑو۔ یہی وقت اور جوانی کا تقاضا ہے۔''

اُس نے سر نیہوڑا لیا۔ واقعی یہی اُس وقت کی پکار تھی جسے سننا ضروری تھا۔

وہ دودھ پی کر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی گہری نیند میں چلی گئی۔ عالمگیر کچھ دیر تک وہیں بیٹھا رہا پھر اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ چونکہ وہ دن میں سونے کا عادی نہیں تھا، اس لئے ٹہلنے کیلئے نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی اِس شغل سے بھی جی اکتا گیا تو پلٹ آیا۔ دروازہ بند کرنے سے کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیل گیا۔ ٹیوب لائٹ آن کرکے صوفے میں ڈھے سا گیا اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب تک حالات نے اُسی کی خواہش کے مطابق کروٹیں بدلی تھیں۔ آگے کیا ہونے والا تھا؟ یہ اُس سمیت کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

سگریٹ سلگانے کیلئے گیس والا لائٹر جلایا۔ نیلا شعلہ سگریٹ کی طرف لپکا۔ یوں لگا جیسے اُس کا بدن سگریٹ سے چھو کر سگریٹ بن گیا ہو۔ روئیں روئیں میں آگ کی تپش بھر گئی۔ اُس نے لائٹر کو آن ہی رکھا۔ شعلے میں اُس کی ماں کے خال و خد واضح ہونے لگے۔ وہ نظریں جمائے عدم سے وجود میں آنے والی کو دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ''تم نے برائیاں کرتے کرتے اچھائی کا ایک بیج بو دیا ہے۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ تم عالمگیر سے پھر علم دین بن جاؤ! تاکہ میری روح کو قرار مل جائے۔''

وہ مسکرایا۔ ''ماں! تم دیکھتی جاؤ کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میری فصل پکنے والی ہے۔ آسمان تک دکھائی دینے والے اونچے پیڑ پر بیٹھ کر تمہیں دکھاؤں گا کہ علم دین سے عالمگیر بننے میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ باپ مجھ پر اعتماد کرتا ہے، بیٹی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں دونوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں، آنے والا وقت تمہیں بتلا دے گا۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر لائٹر کے پُش بٹن پر دھرا ہوا عالمگیر کا انگوٹھا غیر ارادی طور پر اپنی گرفت کھو بیٹھا جس کی وجہ سے شعلہ بجھ گیا اور ماں اوجھل ہو گئی۔ اُس نے جلدی سے لائٹر آن کیا مگر جانے والی اپنی نصیحتیں سمیٹ کر جا چکی تھی۔ خواہش کے باوجود لوٹ کر نہیں آئی تو وہ بجھی ہوئی سگریٹ کو سلگانے لگا۔

صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا اور شانی کے بارے میں سوچنے لگا۔ چشمِ تصور میں برف میں لگی ہوئی آگ کا نظارہ کرنے لگا۔ ایسے میں موبائل فون کا بزر بول پڑا۔ سردار فضل خان رابطہ کر رہا تھا۔ اُس نے فون آن کرتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو سردار! کہو کیسی گزر رہی ہے؟''

''یار عالمگیر! وہ رفیع اللہ یہاں پہنچ گیا ہے۔ کل شام مجھ سے ملنے کیلئے آیا تھا۔ اُس کے بارے میں جو کچھ سُن رکھا تھا، اُسے سچ پایا۔ اُس نے چائے کا ایک کپ پینا بھی گوارا نہیں کیا۔ مجھے دھمکا کر گیا ہے۔ کہتا تھا کہ جب تک وہ اِس علاقے کے تھانے میں رہے گا، ہمیں اپنی ڈفلیاں اپنی بغلوں میں دبا کر رکھنا ہوں گی۔''

عالمگیر نے پوچھا۔ ''تمہارا رویہ اُس کے ساتھ کیسا رہا؟''

''ظاہر ہے کہ میں نے بھی اُسے ڈرایا دھمکایا۔ اُسے بتلایا کہ میری پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ بہتر ہے کہ وہ مجھ سے دور رہے۔''

''ایسا نہیں کرنا تھا سردار!'' عالمگیر نے پریشان ہو کر کہا۔ ''ایماندار پولیس آفیسر کے اختیارات اور قوت کا ہم لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ بہرحال بشیر خان سے کہو کہ وہ اپنی سرگرمیاں محدود کر دے۔ رفیع اللہ پائنچہ پکڑ کر کمر تک پہنچ جاتا ہے۔''

''اِس طرح تو لوکل الیکشن ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

''چوہدری باسط کی ناوقت موت نے پہلے ہی ہمیں بے دست و پا کر دیا ہے۔ ملک فرید کس امیدوار کو کھڑا کر رہا ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہ اپنے منجھلے بیٹے ملک ارشد فرید کو سامنے لا رہا ہے۔ اُس کے ساتھ وہی شکور پٹھان بطور نائب ناظم کھڑا ہوگا۔" سردار کی پریشانی بجا تھی۔ حریف کا مقابلہ کرنے کیلئے وہ بے سپر ہو چکا تھا۔ اُسے پورے حلقے میں سے دونوں کی ٹکر کا امیدوار نہیں مل سکتا تھا۔ بولا۔

"بڑی سرکار کا ہر روز خفگی بھرا فون آتا ہے۔ اوپر والے میری مجبوری کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ تم دس پندرہ دنوں کیلئے یہاں آ جاؤ۔"

"میں وہاں آ کر کیا کر لوں گا؟"

"مجھے یقین ہے کہ تم کوئی نہ کوئی راہ نکال لو گے۔"

"میرا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ شاہانہ ایک لمحے کیلئے بھی مجھے اپنے پاس سے ہٹنے نہیں دیتی۔" وہ بولا۔ "مجھے اِس اعتراف میں کوئی عار نہیں ہے کہ میں رفیع اللہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہماری تمام کاروائیوں کے عقب میں پولیس والوں کی بے ایمانی کھڑی ہوتی ہے۔ رفیع اللہ ہماری کوئی ترکیب بھی کارگر نہیں ہونے دے گا۔ اِس لئے بہتر ہے کہ ہم اُس سے دور رہیں۔ مار کھانے سے بھاگ جانا بہتر ہوتا ہے۔"

سردار نے بتلایا۔ "سننے میں آیا ہے کہ ملک فرید اپنے بیٹے کی شادی چوہدری باسط کی بیٹی سے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ابتدائی بات چیت بھی ہو چکی ہے۔ تم ایسا کرو کہ لڑکی کی تمام وڈیو کیسٹیں ضائع کر دو۔ تمام ثبوت تلف کر دو۔ چونکہ چوہدری باسط مر چکا ہے اور ہمارے کام نہیں آ سکتا، اِس لئے ان چیزوں کو جلا دینا ہی بہتر ہوگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ چوہدری کی گردن کیلئے تیار کیا ہوا پھندا ہمارے گلے میں پڑ جائے۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم واقعی درست کہتے ہو سردار! میں ایسا ہی کروں گا۔ مگر اُس فلم کی کاپی یا کاپیاں بڑی سرکار کے گرگوں کے پاس بھی موجود ہوں گی۔ اُن کا کیا کیا جائے؟"

سردار نے کہا۔ "دو دن بعد میں بڑی سرکار سے ملنے کیلئے شہر جا رہا ہوں۔ اُس سے بات کروں گا۔"

پھر سردار اُسے شانی کی حفاظت کی تاکید کرنے لگا۔ رابطہ منقطع ہونے پر عالمگیر کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تیر گئی۔ دل ہی دل میں سردار پر لعنت بھیجتے ہوئے سوچنے لگا۔

"تمہارے تابوت میں ٹھونکی جانے والی کیلوں کو ضائع کر دوں؟ ایسا کرنے پر کون مجھے عقلمند

کہے گا؟"

اُس نے بشیر خان اور منیرے قصائی سے یکے بعد دیگرے رابطہ کیا اور حلقے کی صورتِ حال سے آگہی حاصل کی۔ سردار نے سچ کہا تھا۔ رفیع اللہ کی آمد نے نظمِ سیاست کی تیزی سے چلتی گاڑی کے پہیوں سے ہوا نکال دی تھی۔ فون بند کر کے الماری تک گیا۔ الماری میں چھپا کر رکھے چرمی بیگ کو نکالا اور میز پر رکھ کر کھول دیا۔ بیگ کھلنے سے ایک دنیا برآمد ہوئی اور گلوب کی شکل اختیار کرتی گئی۔ بہت سی فائلیں، کاغذات کے پلندے، دو آڈیو کیسٹیں، دو وڈیو ڈسکیں اور تین وڈیو کیسٹیں بھی نکلیں جنہیں پولی تھین کے لفافوں میں بڑی احتیاط سے بند کیا گیا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں اَن گنت اور بے نام خواب سجائے اُنہیں فرطِ اشتیاق سے دیکھتا رہا اور ایک خاص ترتیب سے رکھتا رہا۔ یہ سردار فضل خان کی زندگی کا کچا چٹھا تھا جس کے کھلنے کا وقت آنے والا تھا۔ عالمگیر کی تین سالوں کی محنت اپنا ثمر تلاش کرنے کیلئے اس بیگ سے نکلنے کیلئے بے تاب تھی۔

وہ اِس چرمی بیگ کو کسی بھی اعلیٰ عدالت میں جا کر کھول دیتا تو سردار فضل خان پر خونخوار کتوں کا جنگلا کھل جاتا اور اُس کی تکا بوٹی کر دی جاتی۔ سفارشیں، پرمٹ، غیر ملکی ایجنسیوں سے تعلقات کے ثبوت، راتوں رات زمین سے آسمان تک بلند ہونے والے اکاؤنٹس کی مصدقہ تفصیلات، سردار کے جرائم کے مکمل سمعی و بصری ثبوت، شاہانہ کے اغوا کی داستان اور نہ جانے کیا کچھ اُس نے سمیٹ رکھا تھا۔ انسان محبت اور نفرت میں حد سے گزر جاتا ہے۔ دہکتی ہوئی آگ پر برہنہ پا چل سکتا ہے۔ وہ بھی نفرت کی انتہا پر پہنچ کر یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ اُس کے وجود میں بچپن سے آگ کا الاؤ دہکتا چلا آ رہا تھا۔ سر میں پانی ڈالنے سے بدن کی بیرونی تہہ ٹھنڈی ہو جاتی تھی۔ اندر کے شعلوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس آتش کو سرد کرنے کیلئے وہ گزشتہ تین سالوں سے جگ میں پانی بھر رہا تھا۔ کسی مناسب وقت کے انتظار میں اُس کا چرمی بیگ بھرتا چلا گیا تھا۔ شاہانہ اُس کی مٹھی میں آ رہی تھی۔ نٹنے کی کوشش اُسے بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ اُس محاذ کی طرف سے مطمئن ہو کر اُس نے دیاسلائی جلا کر نیا چولہا جلاتے ہوئے پانی بھری کیتلی چڑھا دیا۔ موبائل فون میں نئی سم ڈال کر سردار فضل کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر آواز اور لہجہ بدل کر بولا۔ "میں سردار فضل خان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں سردار فضل خان بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے تعجب آمیز آواز اُبھری۔ "آپ کون ہیں؟"

وہ بولا۔ "میں دو شکاریوں کے درمیان فاصلے مٹانے والا تھرڈ مین ہوں۔ تم مجھے اسی نام سے پکار سکتے ہو۔"

سردار کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ "کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم اپنی چھوٹی سی ریاست کے راجہ ہو۔ راج ہمیشہ مہاراج کی شہہ پر قائم رہتا ہے۔ مہاراج نے تمہارے راج کے دن گننا شروع کر دیے ہیں۔ تم یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ راج کے چھن جانے پر ماضی کے راجے محل کے چور دروازوں سے نکل کر مزدوروں کا بھیس بدل لیتے تھے اور حیاتی کے رہتے دن گمنامی میں چوروں کی طرح گزار دیتے تھے۔" عالمگیر کے لہجے میں بے حد سفاکی تھی۔

"کک...... کون ہو تم؟" سردار کا گھبراہٹ میں لہجہ لکنت زدہ ہو گیا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کھل کر کہو۔"

وہ اپنے لہجے کو مزید ہولناک بناتے ہوئے بولا۔ "میں کون ہوں؟ یہ تمہیں بتایا جا چکا ہے۔ کیا چاہتا ہوں، یہ بھی اشاروں کی زبان میں بتا چکا ہوں۔ تفصیل سننا چاہتے ہو تو سنو۔ تم یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ ملک کے طول و عرض پر انڈر ورلڈ کی حکمرانی قائم ہے۔ تم سب نادیدہ انگلیوں پر ناچنے والے مُہرے ہو۔ وہ نادیدہ ہاتھ تمہیں سیاست کی بساط سے اوجھل کرنا چاہتے ہیں۔"

سردار کی برداشت جواب دینے لگی۔ چلاتے ہوئے بولا۔ "میرے پاس تمہاری بکواس سننے کا وقت نہیں ہے۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔"

وہ بے ڈھنگے انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔ "تمہارا ایک شاہ زور ہماری نظروں میں آ گیا ہے جسے تم نے اپنی بیٹی کی حفاظت کیلئے بھیجا ہے۔ اُس جیسے سینکڑوں کتے انڈر ورلڈ کے مہاراج کے پھٹوں تلے غراتے رہتے ہیں۔ تمہارے پاس موجود تمہارے گینگ پر بھی ہماری نظر ہے۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی عافیت چاہتے ہو تو میرا ہر حکم بلا چون و چرا مانتے جاؤ ورنہ تم پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔"

زندگی میں کبھی کسی نے اُس کے سامنے اتنے بڑے بول نہیں بولے تھے۔ ڈر گیا۔ اندر سے کمزور تھا، بظاہر دلیر بنتے ہوئے بولا۔ "میرا آج تک انڈر ورلڈ کے بڑوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ اگر تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو تو خالی خولی دھمکیاں دینے کی بجائے اپنے بازو کی قوت دکھاؤ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عالمگیر کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تیر گئی۔ سردار اُس کے بچھائے ہوئے جال میں بڑی آسانی سے پھنس رہا تھا۔ وہ بولا۔ "اَب تم نے عقلمندوں والی بات کی ہے۔ کچھ چیزیں تمہارے دستِ راست عالمگیر پاس دو دن تک پہنچا دی جائیں گی۔ وہ تم تک پہنچا دے گا۔ انہیں دیکھ کر، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ گردن اکڑائے رکھنے سے کٹ جائے گی۔ عقلمندوں کی طرح جھکا دینے سے جان بچ جائے گی۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں۔ عالمگیر کو مت دینا۔ تم کوریئر سروس کے ذریعے بھجوا دو۔"

"تاکہ ایجنسیاں تمہارے پیچھے لگ جائیں اور تم وقت سے پہلے ہی پھانسی کے پھندے پر لٹک جاؤ۔ احمق سیاست دان! راز کو دیواروں کی اندھی آنکھوں سے بھی بچا کر رکھنا پڑتا ہے۔ اگر تم عالمگیر پر اعتماد نہیں رکھتے تو کوئی بات نہیں، جہاں کہو، وہیں پہنچا دی جائیں گی۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے تمام کارندوں کا دل ہی دل میں احاطہ کیا۔ سب کی وفاداری کو پرکھا۔ عالمگیر سب پر حاوی پڑتا دکھائی دیا تو ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ تم عالمگیر سے رابطہ کر لینا۔"

"اوکے! تین دن بعد رابطہ ہو گا۔"

اُس نے فون بند کر کے جلدی سے سم بدل ڈالی۔ ابھی فون آن کیا ہی تھا کہ سردار فضل کا نام نئی سکرین پر میوزک کے ردھم پر چمکنے لگا۔ اُس نے کال اٹینڈ کی۔ سردار گھبرائے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ "عالمگیر! تم انڈر ورلڈ کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو، مجھے تفصیل سے بتلاؤ۔"

عالمگیر نے چونک کر پوچھا۔ "سردار! تم اُن لوگوں کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

سردار بولا۔ "ابھی کچھ ہی دیر پہلے انڈر ورلڈ کے تھرڈ مین نے فون پر مجھے دھمکیاں

''اوہ نو سردار! یہ تم کس مصیبت کو گلے لگا بیٹھے ہو!'' عالمگیر نے گہری تشویش کا ا
کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو بہت ظالم اور طاقتور لوگ ہیں۔ تھرڈ مین نے کوئی مطالبہ پیش کیا؟''
''ابھی تو اُس نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اُس کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہو
اُسے کہا ہے کہ وہ انڈر ورلڈ کے ہاتھوں میں دَبے پتے شو کرائے۔ وہ تمہارے توسط
اپنے پتے دو تین دنوں میں مجھ تک پہنچا دے گا۔'' سردار فضل کا لہجہ کھوکھلا ہوتا جا رہا تھا۔
عالمگیر نے کہا۔ ''تم نے بہت بڑی غلطی کی سردار! اب اگر اُس کا فون آئے تو بلا چو
چرا اُس کا مطالبہ مان لینا۔ اِسی میں تمہاری عافیت ہے۔''

سردار کو ڈرانے کیلئے وہ انڈر ورلڈ کے مظالم اور غیر معمولی دسترس کو ظاہر کرنے وا
خونیں واقعات سنانے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سردار ہر آنے والے لمحے میں بزدل پڑتا جا
تھا۔ سامنے کھڑے دشمن سے ڈرنے والا نہیں تھا، سات پردوں میں چھپے ہوئے بڑے
کے ڈر سے اُس کا پتہ پانی ہونے لگا تھا۔ منت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ ''میری طاقت تم
مجھے اِس افتاد سے نکالنے کیلئے شیروں کی طرح اُن کی کچھار پر جھپٹ پڑو۔ انہیں مجھ تک
پہنچنے نہ دینا۔''

وہ لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے بولا۔ ''اُن سے ٹکر لینے کیلئے ہزاروں کی مسلح نف
بھی ناکافی ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ ایک جان ہے، کہو تو تم پر لُٹا دوں، کہو تو شانی بی بی پ
نثار کردوں۔ تمہاری مرضی ہے۔ یہاں رکھو یا اپنے پاس بلا لو۔''

چند لمحے دونوں طرف سنگین خاموشی طاری رہی۔ طویل سانس نتھنوں سے خارج کر
ہوئے سردار نے کہا۔ ''تم بی بی کے پاس رہو۔ لگتا ہے میرا تختہ اُلٹنے والا ہے۔ میں ا
طور پر کچھ کرتا ہوں۔ آگے اللہ مالک ہے!''

رابطہ منقطع ہونے پر عالمگیر مسکرانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ چرمی بیگ میں چھپے ہو
سانپوں کی تنجیں دیکھ کر سردار کی بولتی بند ہو جائے گی۔ پھر وہ جیسا کہے گا، وہ آنکھیں بند
کر کے ویسا ہی کرے گا۔ گزشتہ تین سالوں میں وقتاً فوقتاً فرضی کہانیاں سنا کر سردار فضل کے
شعور میں اُس نے انڈر ورلڈ کا ڈراؤنا ہَوّا کھڑا کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے کہا تھا:
''سردار! تمہاری متروک حویلی اور اُس میں رہنے والے لشکری تمہاری طاقت ہیں۔ ا
ایک ہزار گنا بڑھاؤ تب جا کے انڈر ورلڈ کے برابر طاقتور بنو گے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سردار فضل اپنی تمام عمر میں بمشکل ایک چھٹانک ہو پایا تھا۔ سیر اور سوا سیر سے ٹکراؤ کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ منوں وزنی پڑوں میں ہاتھ ڈالنے کی جرأت کیسے کر سکتا تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھانے کیلئے گھر کی بنیادیں ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر کھوکھلی کر دی تھیں۔ عالمگیر کو صوفے میں بیٹھے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ پیشانی کو مسلتے ہوئے عجیب سوچوں میں گم تھا۔ ایسے میں رحمت بی نے اُس کی محویت توڑ کر شانی بی بی کا پیغام سنایا۔ ''وہ تمہیں بلا رہی ہے۔''

''کیوں؟''

عجیب سی نگاہ اُس پر ڈال کر وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ اُس کی نگاہ نے جیسے اُسے کہا ہو۔ ''میں بھی دو بڑوں کے بیچ میں کھڑی تھرڈ ویمن ہوں۔ کہانیاں سنانے بیٹھ گئی تو پس جاؤں گی۔ میرا ہوا کے جھونکوں کی طرح آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آتی ہوں تو عشق کے سینے میں آکسیجن بھر جاتی ہے۔ پلٹ کر جاتے ہوئے تمہاری الائشیں دور پھینکنے کیلئے اُٹھا لے جاتی ہوں۔''

وہ انگڑائی لے کر کھڑا ہو گیا۔

دونوں بہنیں سر جھکائے اپنی اماں اور ملک فرید کے سامنے بیٹھی اپنے ناخنوں سے کھیل رہی تھیں۔ ملک نے بتول کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔ ''میں نے اپنے بچوں کو سونے کے نوالے کھلائے۔ چاندی کی مسہری پر سلایا۔ اُن کی ہر فرمائش پوری کی مگر اُن کی شادی اپنی مرضی پر کی۔ باسط میرا یار تھا۔ سگے بھائیوں سے بھی پیارا تھا۔ اُس کے مرنے پر میں خود کو تم دونوں بہنوں کا سرپرست سمجھتا ہوں۔ تم باشعور ہو۔ سلجھی ہوئی ہو۔ کہی اور اَن کہی کو سمجھنے کی قدرت رکھتی ہو۔ مجھے اشارے سے ہی سمجھا دو کہ میں نے درست کہا ہے یا غلط!''

بتول نے چونک کر اُسے دیکھا۔ سر جھکا کر بولی۔ ''ابا جی کے بعد آپ کو ہی بڑا مانتی ہیں۔''

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دونوں میں سے ایک کو اپنے گھر میں چاند بنا کر اُتار لوں۔ ایک کو اپنے بھائی کے گھر کی زینت بنا دوں۔'' سانس لینے کیلئے رُک کر انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ چہرے کے تاثرات سے جواب کھوجنے لگا۔

چھوٹی بولی۔ ''انکل! سر اُٹھا کر آپ کی بزرگی کا مان توڑنا نہیں چاہتی ہوں مگر یہ سوچ کر کہ ابا جی ہماری غلطیوں پر خاموشی اختیار کر کے ہمیں معاف کر دیتے تھے۔ آپ بھی ایسا ہی کریں گے۔ باجی آپ کی خدمت کرنے پر آمادہ ہے۔ میں آپ کے بھائی کے گھر میں نہیں جانا چاہتی۔''

وہ اچنبھے سے بولا۔ ''کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟''

''آپ پر اعتماد ہے تو باجی نے سر جھکایا ہے، سر گھمایا نہیں۔ آپ کے بھائی اور اُس کی اولاد کو میں نہیں جانتی، باجی نہیں جانتی، یہاں کوئی بھی نہیں جانتا۔ اَن دیکھا قصرِ زبیدہ اب نہیں بکتا۔ پلیز انکل! میری بات کا بُرا مت منایئے گا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملک فرید کی مسکراہٹ نے اُسے سمجھا دیا کہ اُس نے زرینہ کے انکار کو بڑی فراخ دِلی سے قبول کر لیا تھا۔ بولا۔ ''میں نے بھائی سے بات کی تھی۔ اگر وہ یہاں آ گیا تو انکار کرتے ہوئے مجھے بہت سبکی محسوس ہوگی۔''

بتول نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا۔ ''اُس کی آپ فکر نہ کریں۔ اُن کے یہاں آنے پر آپ کو یا ہمیں انکار کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اُنہیں لڑکی پسند ہی نہیں آئے گی۔''

ملک نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں دیکھ کر کوئی انکار کرے، چوک میں سرِ عام کھڑا کر کے کلیجے میں گولی نہ اتار دوں تو میرا نام ملک فرید نہیں۔ کاش میرا ایک اور کنوارا بیٹا ہوتا تو مجھے باہر جانا ہی نہ پڑتا۔''

زری مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کہا ناں انکل! آپ بے فکر ہو جائیں۔ لڑکیوں کو اگر خوبصورت دکھائی دینے کا ہنر آتا ہے تو بدصورت نظر آنے کے فن میں بھی یکتا ہوتی ہیں۔''

وہ سمجھ گیا تھا یا نہیں، مطمئن انداز میں سر ہلا کر بتول کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں نے فیصلہ کیا ہے کہ جمعہ کے روز تم دونوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں ڈال کر ایک کھونٹے پر باندھ دیا جائے۔ امجد کو کوئی اعتراض نہیں، تمہیں اگر ہے تو مجھے باپ سمجھ کر بتلا سکتی ہو۔''

وہ شرما کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے ہونے والے سسر کی طرف پیٹھ کر کے بولی۔ ''اگر انہیں کوئی اعتراض نہیں تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

ملک فرید باوقار انداز میں چلتا ہوا اُس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ چہرے پر لرزاں خوشی اور طمانیت کی قوسِ قزح دیکھ کر اُس کے سر پر روائتی انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم بہو بن کر نہیں، بیٹی بن کر میری چھوٹی سی جنت میں اُترو گی۔ تمہارے اجالوں کے سبب میرا بڑھاپا نور سے بھر جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بیٹا زندگی بھر تمہاری دل آزاری نہیں کرے گا۔''

وہ ملک فرید پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ وہ شرما کر بھاگ جانے والی کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھ کر مسز باسط سے محوِ گفتگو ہو گیا۔

بتول کے پیچھے پیچھے زری دوڑتے ہوئے اُس کے کمرے میں پہنچی۔ والہانہ انداز میں

اُس سے لپٹتے ہوئے خوشی سے چلائی۔ "ہائے باجی! تمہارا ٹانکہ تو بھر دیا گیا ہے۔ اب ہر روز کان کھول کر، جی بھر کر سنتے رہنا...... آئی لو یو بتول! آئی لو یو......"

ایک جھٹکے سے اُسے الگ کر کے بانہوں میں سر دے کر شرم سے گلنار ہوتے ہوئے بڑ پر بیٹھ گئی۔ زبان نہ نہ کر رہی تھی، دل چٹکیاں لے رہا تھا کہ امجد کے نام پر چھیڑنے والی کے ہاتھ کو مت روکو۔ زری کی شرارتیں اُس کے جوان مرمریں بدن میں الوہی ترنگ بھر رہی تھیں اور وہ بے خود ہوتی جا رہی تھی۔

باپ کے جانے کے گھنٹہ بھر کے بعد بیٹا کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا۔ دروازے کے بیچ کھڑا ہو کر طاق پر انگلی کی ضربیں لگاتے ہوئے اجازت کا طلبگار ہوا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ مسکراتے ہوئے کرسی پر براجمان ہو گیا۔ بولا۔ "کیسی ہو؟"

"ٹھیک۔ آپ کیسے ہیں؟"

"میں بھی ایک دم فِٹ!"

زری اُٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ اُسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کتنے عام سے انداز میں تمہاری اماں نے تمہیں میرے نام کر دیا ہے۔ کوئی دھماکہ نہیں ہوا، کوئی دھما چوکڑی برپا نہیں ہوئی، کوئی ہاہا کار نہیں مچی......"

وہ مسکراتے ہوئے نظریں چُرانے لگی۔ "دھماکے اور چھناکے دل ٹوٹنے پر سنائی دیتے ہیں، دل آباد ہونے پر نہیں۔"

اُٹھ کر اُس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک دو فٹ پیچھے کھسک گئی۔ وہ بولا۔ "قریب آنے دو۔ میں اَب تمہارا ہوں۔ اپنی چیز سے دور ہٹنا اچھا نہیں ہوتا۔"

وہ بولی۔ "اپنی چیز پر جھپٹنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ ہنسی میں زندگی تھی، جان تھی، وقار تھا۔ بولا۔ "میرے باپ اور بھائی نے فیصلہ کیا ہے کہ انتخابات کے فوری بعد ہماری شادی کر دی جائے گی۔"

وہ بھی ہنسنے لگی۔ گھٹنوں پر بانہیں رکھیں، اُن پر پیشانی ٹکا کر چہرہ چھپا لیا۔ چاند بدلیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ بولی۔ "تب آپ کو اپنی چیز پر جھپٹنے کا پورا حق حاصل ہو گا۔"

زندگی...... اپنی رعنائیاں اوڑھے پیچھے کی اَور ہٹ رہی تھی۔ زندگی کا طلبگار اُس کے لمس کی آشنائی کشید کرنے کیلئے مرمٹ رہا تھا۔ برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ سن کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلدی سے اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنے والی زری تھی۔ وہ چائے ٹرے میں رکھ کر لائی تھی۔ دونوں کو خاموش بیٹھے دیکھ کر شرارت سے بولی۔ "لگتا ہے آپ دونوں نے موقع سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ چلیں کیا یاد کریں گے۔ چائے پئیں اور ایک بار پھر موقع سے فائدہ اُٹھائیں۔"

وہ کھسیانی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ چائے رکھ کر زری لہراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ کمرے کی فضا میں پھر خوشبوئیں پھیلنے لگیں۔ امجد نے کہا۔ "بتول! میں نے منیرے قصائی کو راز داری کی شرط پر تمام قصہ سنا دیا ہے۔ وہ اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے ہمارے دشمن کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا ہے۔ اُس نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ اِس کھیل کے پیچھے بڑی سرکار کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ بڑی سرکار سردار مظفر علی خان کا نِک نیم ہے۔"

وہ بولی۔ "اُسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

اُس نے سمجھایا۔ "یہ سیاست کی کتاب کے کالے اوراق ہیں۔ تم سمجھ نہیں پاؤ گی۔ منیرے کا خیال ہے کہ تمہارے باپ کو جیتنے کے بعد اپنی پارٹی میں لانے کیلئے وہ بلیک میل کرنا چاہتا ہو گا۔ اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ غیرت مند باپ بیٹی کے بدن کی برہنگی پر بلیک میل نہیں ہوتے، دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

وہ پشیمانی سے سر جھکا کر بولی۔ "ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔ کیا ہم بڑی سرکار سے ماسٹر کاپی حاصل کر سکتے ہیں؟"

امجد حقیقت پسند انسان تھا۔ جھوٹے دعووں کی بیساکھی پر چلنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ بولا۔ "اُس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میرے اختیارات کی حد سے کہیں باہر...... ہاں مگر منیرے کی صلاحیتوں پر مجھے اعتماد ہے۔ جو ترکہ چھینا نہ جا سکتا ہو، وہ چُرا لیا جاتا ہے۔ منیرا کسی نہ کسی طرح ماسٹر فلم حاصل کر لے گا۔"

بتول نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ امجد کے پہلو کی جیب میں سے ایک معروف گیت کی دھنیں پھوٹ پڑیں۔ اُس نے موبائل فون نکال کر نمبر دیکھا۔ بولا۔ "منیرا مجھے کال کر رہا ہے۔"

پھر فون آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ "ہاں بھئی منیرے! کہاں ہو تم؟"

دوسری طرف کی بات توجہ سے سنتا رہا۔ پھر کچھ ہدایات دے کر فون بند کرتے ہوئے بولا۔ "منیرا کہہ رہا تھا کہ اُس کا اندازہ درست نکلا۔ فلم بڑی سرکار کے گرگوں نے اُسی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حکم پر بنائی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے اغوا کرنے میں سردار فضل خان کے بندوں کا بھی ہاتھ ہو۔"

دس منٹ کے بعد پھر منیرے نے رابطہ کر کے بتلایا۔ "ملک جی! میں نے اپنے ایک سنگی سے رابطہ کیا ہے۔ وہ سردار فضل خان کا دستِ راست ہے۔ آج کل لاہور میں رہ رہا ہے۔ اُس نے مجھے بتلایا ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد یہاں آئے گا اور بڑی سرکار کے گرگوں سے فلم حاصل کر کے ہمیں دے دے گا۔"

ملک نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا۔ "وہ فلم ہمیں دینے کی بجائے سردار فضل خان کے ہاتھ میں بھی تھما سکتا ہے۔ اس طرح تو ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جائیں گے۔"

منیرے نے تسلی دی۔ "نہیں ملک جی! عالمگیر ایسا بندہ نہیں ہے۔ وہ گھٹیا کام نہیں کرتا۔ بہت پڑھا لکھا اور مرد مزاج انسان ہے۔ میں اصل میں بڑی سرکار کے گینگ سے واقف نہیں ہوں۔ جتنی دیر میں اُن کا سراغ لگاؤں گا، اتنی دیر میں وہ مجھے فلم اُن کی دسترس سے نکال کر دے دے گا۔"

ملک کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو جان چھڑاتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے فلم چاہیے۔ تمہیں جو مناسب لگے، کرو۔ خدا حافظ!"

نچلے ہونٹ پر پپڑیاں نوچنے کے سے انداز میں چٹکیاں بھرتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ بتول امید بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ بولی۔ "کیا کوئی پریشانی ہے؟"

"نہیں!" وہ چونک کر بولا۔ "جب تک میں تمہیں اپنانے کے فیصلے تک نہیں پہنچا تھا، پریشان تھا۔ جب دل نے تمہیں اپنا آپ سونپ دیا، ہر پریشانی آناً فاناً ختم ہوگئی۔ تمہارے مستقبل کے بارے میں پریشانی لاحق تھی۔ اَب تمہارا مستقبل میرے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری بنائی گئی فلم تمہارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتی۔ ماسٹر فلم ملے، نہ ملے، تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

وہ متشکرانہ نظروں سے اپنے من مندر کے دیوتا کو پوجنے لگی۔ سوچنے لگی۔ 'دنیا میں کوئی بھی اُترن اپنے تن پر سجانے کی خواہش نہیں رکھتا۔ جو مسلے ہوئے لباس کو نظر انداز کر کے نیا لباس خریدنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اگر پلٹ کر گریبان دریدہ اُترن کی طرف آئے تو اُس کے اُٹھنے والے پہلے قدم پر ہی عشق جائے نماز بچھا کر سجدہ گزیں ہوجاتا ہے۔ میری

طرف پلٹنے والے! زندگی کے ہر موڑ پر اپنی آنکھیں تمہارے پیروں تلے بچھاتی رہوں گی۔'

وہ متفسر ہوا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

اُس نے بانہوں کے اوپر سے آنکھوں کو پورا کھول کر اپنے محبوب کو دیکھا اور مدھم سی آواز میں بولی۔ "کچھ بھی تو نہیں......"

گلابی ڈوروں والی آنکھوں اور شرم سے لال گوں آدھے چہرے کو دیکھ کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور لپک کر قریب آگیا۔ اُس کے سنبھلنے اور پیچھے ہٹنے سے پہلے ہی اُس نے دونوں شانوں سے پکڑ کر اُس کی آنکھیں چوم لیں۔ جلدی سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ جذبات کی حدت پر مضطرب تنفس کو قابو میں لیتے ہوئے سوچنے لگا۔ "میں انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر سوچا کرتا تھا کہ لوگ کیسے بے قابو ہو کر جرم کر بیٹھتے ہیں۔ ضخیم کتابیں جس نکتے کی آج تک وضاحت نہیں کر پائیں، محبوبہ کی ایک ادا نے ہی وضاحتوں کے اَن گنت باب کھول کر میرے سامنے رکھ دیے ہیں۔"

شرمساری آنکھوں میں بھر کر جلدی سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنے عاشق کی بے ساختہ جسارت پر بے دم ہو کر پیچھے کی طرف گر پڑی۔ دایاں ہاتھ منہ پر، بایاں بازو آنکھوں پر رکھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ میلوں دوڑنے سے بھی سانس یوں پھولا نہیں کرتا۔ سوچنے لگی۔ "ہائے اللہ! آن کی آن میں یہ کیسی آگ تن بدن میں بھڑک اُٹھی ہے۔ کوئی شعلہ، کوئی انگارہ، کوئی لو تک دکھائی نہیں دیتی مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پورے کا پورا بدن شعلوں کی آنچ پر دہکنے لگا ہو۔ جب مجھ برف پر لگی ہوئی شیشے کی بے داغ اور اَن چھوئی بوتل کو اُٹھا کر دہکتے ہوئے تنور میں ڈالا گیا تھا، تب بدن نے تپش نہیں پکڑی تھی۔ مُردوں کی طرح شکست خوردہ بساط پر ٹھنڈا ٹھار پڑا رہا تھا۔ اَب کیسے چھونے پر انگارہ بن اُٹھتا ہے۔ ہائے! کوئی تو بتلائے کہ یہ سب کیا ہے؟ اے مٹی کی مورتی میں جان ڈالنے والے! تم تو کائنات کے ہر اسرار کے امین ہو۔ ایک یہی راز مجھ پر کھول کر احسان کر دو ورنہ میں پاگل ہوجاؤں گی۔"

پاگل کرنے والا اُسے اپنی چشم تصور میں بیٹھا کر اپنے بھائی کیلئے حلقے میں ووٹ مانگنے کیلئے نکل کھڑا ہوا تھا۔

❀❀❀

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عالمگیر کار پورچ میں کھڑا شاہانہ کا منتظر رہا۔ وہ نہیں آئی۔ آدھے گھنٹے کے ناکام انتظار کے بعد اُس کے کمرے تک آیا۔ دستک دی۔ دروازہ بدستور بند رہا۔ دوسری......پھر تیسری بے نتیجہ دستک پر وہ جھنجلا اُٹھا۔ دروازہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا۔ وہ کاہلی سے دروازے پر آئی۔ کھولتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ ''کیا زلزلہ آ گیا ہے؟ کھول تو رہی ہوں۔ اتنا سا بھی صبر نہیں ہوتا تم سے!''

سامنے عالمگیر کو کھڑے دیکھ کر شرمساری سی ہوگئی۔ ''میں سمجھی تھی رحمت بی دستک دے رہی ہے۔''

عالمگیر جھنجلایا ہوا تھا۔ غصے میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر خوابیدہ حسن کی جولانیوں کی زد میں آ کر بے خود سا ہوگیا۔ چہرہ بازو پر رکھ کر سوتے رہنے کے باعث بائیں کان کی لو سے ناک کی اَساس تک دو انچ چوڑی سرخ لہر موجزن دکھائی دے رہی تھی۔ ایک رنگ کی زندہ قوسِ قزح زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُسے ندیدوں کی طرح دیکھتے پا کر کاہلی سے بولی۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

وہ سنبھل کر بولا۔ ''کچھ نہیں۔ کافی انتظار کے بعد پتہ کرنے آیا ہوں کہ تمہارا کہیں جانے کا ارادہ ہے یا نہیں؟''

وہ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گئی۔ بائیں گال کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں......جی نہیں چاہ رہا۔''

وہ ناقدانہ نگاہوں سے اُس کے سراپا کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔ ''طبیعت تو خاصی سنبھلی لگتی ہے۔''

''میں نے کہا ناں کہ جی نہیں چاہ رہا۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے ایک دو ضروری کام نبٹانا ہیں۔ گھنٹہ بھر کے بعد واپس آ جاؤں گا۔ گاڑی پر جا رہا ہوں۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر انگیائے جذبوں کی آنچ پر لہرا کر انگڑائی لینے لگی۔ جوانی کی بے ربط اور سستی زدہ انگڑائی بھی دلکش رقص کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ آنکھوں کی مستی مے خانے کے چھلکتے جام کی صورت میں پُر دعوت بن کر خردمند کو خرد سے بیگانہ کرنے لگتی ہے۔ اُس نے سر جھٹک کر اپنی خرد کو خرمن میں لگی آگ کی لپٹوں سے نکالنے کیلئے منہ پھیر لیا۔

چند لمحے کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر کندھے اُچکا کر کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ بند کر کے ہنستی ہوئی ٹی وی کی طرف بڑھی۔ آن کیا اور ریموٹ کنٹرولر ہاتھ میں لئے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ عالمگیر کی آنکھوں سے چھلکتی والہانہ ستائش کی شراب اپنا نذر رنگ دپے میں ٹپکانے لگی تھی۔ بدن شکن انگڑائی لیتے ہوئے ہونٹ پر ہونٹ چڑھا کر سوچنے لگی۔ ''میں نے قیامت نہیں دیکھی۔ آئینہ کہتا ہے کہ میری جوانی قیامت ہے۔ دل کہتا ہے، قیامت ایسی ہی ہوگی۔ جس پر میرے جلوؤں کی بجلی گرتی ہے، اُس پر قیامت اُتر آتی ہے۔ عالمگیر کی نگاہیں پڑھ کر آئینے کے جھوٹ پر یقین کر لینے کو دل بے قرار ہے۔''

سر کے اوپر انگڑائی کی زنجیر میں بندھے ہاتھ چھڑا کر ہنسنے لگی۔ اپنے بدن کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ کوئی چھیڑے تو آگ لگتی ہے۔ اپنے ہاتھ چھیڑنے لگیں تو گدگدی ہونے لگتی ہے۔ اُس کی ہنسی بے قابو ہونے لگی۔ ایسے میں اچانک اُس کی نظر ٹی وی اسکرین پر دکھائے جانے والے فیملی پلاننگ کے اشتہار پر پڑ کر ٹھہر گئی۔ منہ اُدھ کھلا رہ گیا۔ قہقہے نے دم توڑ دیا۔ دل میں اَن گنت اندیشے سر اُٹھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگے تھے۔ وہ بڑبڑائی۔ ''ہائے اللہ! میں نے اِس طرف تو توجہ ہی نہیں دی تھی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ نہانے سے بدن پر لگی میل اُتر جاتی ہے۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ گناہوں کی میل بدن کے اندر تک اُتر جائے تو کیا کچھ ہوسکتا ہے۔''

دِل کو سمجھانے لگی۔ ''کوئی ضروری تو نہیں کہ ایک پتھر سے ہی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ جائے۔ پہلے چھرّے سے ہی غبارہ پھٹ جائے۔ ایک فائر میں ہی ہرن زخمی ہو کر گر پڑے۔''

دماغ ٹھنک کر بولا۔ ''ڈرائیور کے ہاتھوں کی پہلی لغزش جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے۔ ایک ہی بیج زمین میں دَب کر تناور درخت بن سکتا ہے۔ ٹائی ٹانک کا پہلا سفر آخری ثابت ہوسکتا ہے تو سمجھ لو کہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ احمقانہ خیالات کو نمو دینے کی بجائے عقل کی ڈوری تھامو اور اپنا چیک اَپ کراؤ۔ داغ زدہ چہرہ کسی کو دکھانے کے لائق نہیں رہتا۔ چمکتی جلد پر دانے نکل آئیں تو اُنہیں ظاہر ہونے سے پہلے اِن کا علاج کرنا ہی عقلمندی کہلاتی ہے۔''

وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ دیکھا سنا نہیں تھا، نہ ہی تجربہ تھا۔ میڈیا اور کتابوں نے جو کچھ پڑھا رکھا تھا، دل دہلانے کیلئے وہی کافی تھا۔ سوچنے لگی کہ وہ کیا کر سکتی ہے۔ اپنی لیڈی ڈاکٹر کے پاس جائے گی تو باپ تک خبر اُس کے گھر پہنچنے سے پہلے

پہنچ جائے گی۔ لیبارٹری میں جانے پر عالمگیر چونک اُٹھے گا۔ اکیلے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ حسن پر نمی اُترنے لگی۔ آنسو رخساروں تک ڈھلک آئے۔ روتے ہوئے خود کو کوسنے لگی۔ ''اِس بے شرمی کی زندگی سے کہیں بہتر ہے کہ میں بے حیا وجود کا گلا گھونٹ دوں۔ ہائے! کس مصیبت میں پڑ گئی ہوں۔ کسی کو راز دار بھی نہیں بنا سکتی، کسی سے مدد بھی نہیں لے سکتی۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا، کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟''

وہ سردار فضل کی بیٹی تھی۔ چوہدری باسط کی بیٹی نہیں تھی کہ سچ کو تحریر کی شکل میں ڈھال کر اپنے عاشق کے سامنے رکھ دیتی۔ اُسے اِس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ سچ وہی ہوتا ہے جو اپنے منہ سے بولا جائے۔ وہ سچ نہیں ہوتا جسے کوئی دوسرا گدی سے کھینچ کر پڑھ پائے۔ وہ رحمت بی کو بھی ہمراز نہیں بنا سکتی تھی۔ اُس کے خیر خواہ اُس کے باپ کے تنخواہ دار تھے۔ خیر خواہی سے کہیں زیادہ ضروری تنخواہ میں ملنے والے کرارے کرارے نوٹ پیارے ہوتے ہیں۔

غار کے منہ پر پتھر آن گرا تھا۔ بڑے باپ کی بگڑی ہوئی بیٹی اکیلی غار میں پھنس گئی تھی۔ کہیں پڑھ رکھا تھا کہ راستہ مسدود کرنے والا پتھر طاقت سے نہیں، گریہ سے ہٹتا ہے۔ گریہ کیلئے دامن میں جھانک کر دیکھا۔ کوئی نیکی دکھائی نہیں دی۔ کس بل پر وہ گریہ کرتی اور راستہ مانگتی۔ ایسے میں قسمت کو اُس کی تہی دامنی پر ترس آ گیا۔ غار کے دہانے کو تھوڑا سا عریاں کرتے ہوئے بولی۔ ''پگلی! کیا بھرے شہر میں تمہاری فیملی ڈاکٹر کے علاوہ کوئی مسیحا نہیں ہے؟ کسی اور سے رابطہ کرو گی تو باپ تک خبر نہیں جائے گی۔''

وہ اتنی عقلمند نہیں تھی۔ اگر رَتی بھر عقل بھی رکھتی تو سامنے کی بات کو کسی کے سمجھائے بغیر سمجھ لیتی۔ قسمت نے پتھر کو اور سرکایا۔ ''کنوارپن کوئی بندیا نہیں، کوئی تِلک نہیں ہوتا جو پیشانی پر چپک کر دیکھنے والے کو اپنا آپ دکھا دیتا ہے۔ تم نئی ڈاکٹر کے سامنے خود کو شادی شدہ ظاہر کر کے اپنا کام نکال سکتی ہو۔''

ابھی وہ پتھر کے ہٹنے سے نمودار ہونے والے راستے میں سے گزرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ قسمت نے ہنس کر دھکا دیا اور بھاری پتھر کو پرے پھینکتے ہوئے کہا۔ ''پگلی! تم عالمگیر سے ڈرنے لگی ہو۔ اپنے نوکر سے چھپانا چاہتی ہو۔ سنو! عورتوں کو ایک یہی مسئلہ درپیش نہیں ہوتا جس کو سلجھانے کیلئے وہ ڈاکٹر کے پاس جایا کرتی ہیں۔ تم کسی اور بیماری کا بہانہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر کے اُسے اپنے ساتھ لے جا سکتی ہو۔ کلینک کے گیٹ پر گاڑی میں اُسے بیٹھا کر خود ڈاکٹر سے ملنے کیلئے جا سکتی ہو۔ اب ہینگ بھی تمہاری ہتھیلی پر ہے، پھٹکڑی بھی تمہاری ہتھیلی پر دھری ہے۔ جتنا رنگ لانا چاہتی ہو، لے آؤ۔''

وہ خوش ہو گئی۔ قسمت مہربان ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کھلے آسمان سے مینہ کی خوشگوار پھوار برسنے لگی ہو۔ دھکا دیتی ہے تو بھری دنیا میں کہیں قدم جمائے نہیں جمتے۔ وہ اُس پر مہربان ہو گئی تھی۔

عالمگیر گھنٹے کی بجائے آدھا دن گزار کر واپس آیا۔ وہ اُس کی منتظر تھی۔ بولی۔ ''تم نے جلد آنے کا کہا تھا۔ پورا دِن ضائع کر دیا۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ تم تھے نہ گاڑی تھی۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''ہاں! کچھ پرابلم درپیش آ رہی ہے۔ سوچا ڈاکٹر سے مل کر مشورہ کر لوں۔''

اُس کے جگمگ سراپے پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرایا۔ ''اِس انداز میں کسی میل ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی تو کبھی واپس نہیں آ سکو گی۔ لیڈی ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی تو تمہارا علاج کرنے کی بجائے وہ رشک اور حسد کے مارے غش کھا کر گر پڑے گی۔''

وہ نظریں چُرا کر مسکرانے لگی۔ دکھاوے کی خفگی ظاہر کرنے لگی۔ ''اب میں ایسی اپسرا بھی نہیں ہوں۔''

وہ ہاتھ میں تھاما ہوا شاپنگ بیگ لہراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر کے بعد گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو وہ سمجھ گئی کہ عالمگیر اُسے پورچ میں بلا رہا ہے۔ وہ پرس جھلاتی سیڑھیاں اُترنے لگی۔

ایک گائنا کالوجسٹ کے کلینک کے سامنے اپنے محافظ کو انتظار کی سولی پر لٹکتا چھوڑ کر اندر چلی گئی۔ اُسے تاکید کر گئی کہ وہ اِدھر اُدھر نہ ہو۔ وہ کسی وقت بھی باہر آ سکتی ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میرے پیچھے پیچھے اندر نہ آئے۔ اتنا تو وہ جانتا ہی ہوگا کہ گائنا کالوجسٹ کے نرسنگ ہوم میں بغیر بلائے گھسنے والا اُترا ہوا منہ لے کر باہر نکلتا ہے۔

لیڈی ڈاکٹر ادھیڑ عمر کی خوش شکل عورت تھی۔ لہجے سے شہد ٹپکتا تھا۔ ہمت باندھ کر بولی۔ ''ڈاکٹر صاحبہ! میں آپ کے پاس اپنی امید پَرکھنے کیلئے آئی ہوں۔''

ڈاکٹر مسکرائی۔ ”تم شکل سے امید کی کرن دکھائی دیتی ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہیں ازدواجی زندگی نے چھوا تک نہیں۔ بائی داوے! کتنا عرصہ ہوا شادی کو؟“

وہ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ ”اِس بارہ کو تین ماہ ہوجائیں گے۔“

ڈاکٹر نے علامات پوچھیں۔ وہ کچھ جانتی نہیں تھی، بتلاتی کیسے؟ مایوس ہوکر ڈاکٹر نے لیٹر پیڈ پر کچھ آڑے ترچھے شبد ڈال کر اُسے اپنی اسسٹنٹ کے ہمراہ دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ ٹیسٹ رپورٹ لے کر وہ ڈاکٹر کے آفس میں داخل ہوئی اور لرزتے ہاتھوں سے رپورٹ تھماتے ہوئے بولی۔ ”اِس پر صرف 'پازیٹو' لکھا ہے۔ اِس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“

ڈاکٹر نے شوخ انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”تم جو دعا لے کر یہاں آئی ہو، وہ پوری ہوگئی ہے۔ پازیٹو کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری زرخیز دھرتی نے بیج کو وصول کر کے نمو کا عمل شروع کر دیا ہے۔ مبارک ہو!“

اُسے یوں لگا جیسے اُس کے پیروں نے اُس کا وزن اُٹھانے سے انکار کر دیا ہو۔ کرسی پر بے دم ہوکر ڈھے سی گئی۔ سردی کے باوجود پیشانی پر ننھے ننھے قطرے جگمگانے لگے۔ ڈاکٹر اُس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو گہری نظروں سے جانچ رہی تھی۔ روز کا کام تھا۔ اَن گنت معصوم چہروں پر سیاہی سے رقم کی گئی اندوہ ناک تحریریں پڑھتی رہتی تھی۔ اَن بتلائی کو بھانپتے ہوئے بولی۔ ”لڑکیاں یہ سمجھتی ہیں کہ بیاہی اور بن بیاہی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر تم اُٹھنے کے قابل ہو تو اُس دیوار پر لگے آئینے میں جا کر اپنی صورت دیکھو۔ ثواب اور گناہ کے فرق کا پتہ چل جائے گا۔“

ڈاکٹر کے لفظ لفظ میں نفرت، استہزاء اور کھلا طنز تھا۔ وہ کٹ کر رہ گئی۔ سارا اعتماد ”پازیٹو“ کے لفظ نے آنِ واحد میں چاٹ لیا تھا۔ رہی سہی کسر شہد ٹپکاتے لہجے میں عود کر آنے والی نفرت نے پوری کردی۔ میز پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔ ڈاکٹر اُٹھ کر اُس کے قریب آ گئی۔ دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔ ”جو ہونا تھا، ہو چکا۔ ہونی کو فیس کرنے کیلئے تمہیں اِسی اعتماد کی ضرورت ہے جس کی بیساکھی پر چل کر مجھ تک پہنچی ہو۔“

وہ ہچکیاں لینے کے دوران بولی۔ ”ڈاکٹر صاحبہ! میں گناہ گار نہیں ہوں۔ ہائی سوسائٹی میں پلنے بڑھنے کے باوجود میں اَن چھوئی ہوں۔ میرے ساتھ ظلم میری بے ہوشی میں کیا گیا ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر کو سٹوریاں سننے کا شوق نہیں تھا۔ پیشہ وارانہ انداز میں بولی۔ ”وقت گزرنے پر سب ہی کہتی ہیں۔ تمہیں کچھ دوائیاں لکھ دیتی ہوں۔ ایک ہفتہ استعمال کرنے کے بعد میرے پاس آنا۔“

فیس ادا کر کے وہ کلینک سے باہر آئی۔ گاڑی میں بیٹھی تو عالمگیر نے کہا۔ ”کلینک میں جانے سے پہلے تم پر جوانی تھی۔ واپسی پر بڑھاپا طاری ہے۔ کیا بات ہے؟“

اُس نے۔ ”اونہہ“ کہہ کر منہ پھیر لیا۔

میڈیکل سٹور سے تجویز کردہ ادویات لے کر گھر پہنچی۔ کمرے میں بند ہوکر رونے لگی۔ قسمت نے راہ سجھائی تھی، غار کے منہ پر پڑے ہوئے بھاری بھرکم پتھر کو ہٹا دیا تھا مگر یہ نہیں بتلایا تھا کہ غار سے باہر جانے والے راستے میں کانٹے ہی کانٹے بکھرے پڑے ہیں۔ بیچ رَستے پہنچ کر پاؤں کے تلوؤں نے کانٹوں کی خبر دی تھی۔ اَب وہ نہ آگے جا سکتی تھی، نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔

عالمگیر تھک کر ستانے کیلئے دراز ہوگیا۔ زندگی میں بارہا اپنے کیے پر ندامت محسوس کی تھی۔ مگر آج جس پشیمانی نے دامن تھاما تھا وہ سب سے الگ تر اور روح فرسا تھی۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”بہت غلط ہوا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرے مقابل میں سردار فضل خان سینہ سپر ہوکر کھڑا تھا۔ اُس کی بیٹی نے میرا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا، میں نے خوامخواہ اُس کا چہرہ بگاڑ دیا ہے۔“

اچانک اُسے اپنی پیشانی پر ممتائی ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ چونک کر آنکھیں کھولیں۔ ماں کے اُجلے وجود کو خود پر جھکے دیکھا۔ اِس سے پہلے کبھی اتنا قریب نہیں آئی تھی۔ اچانک عالمگیر کا دل بھر آیا۔ روتے ہوئے بولا۔ ”ماں! تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں نے علم دین سے عالمگیر بن کر اپنی دنیا اور عاقبت دونوں کو خراب کر لیا ہے۔ مجھے عورت ذات کی عزت کرنا چاہیے تھی نہ کہ اُس کی عزت کو پیروں میں پامال کر کے فتح کا جشن منانا چاہیے تھا۔“

ماں پیار سے پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگی، خاموشی سے سہلانے لگی۔ وہ سسکا۔ ”ماں! آج خاموش کیوں ہو؟ طنز کے تیر میرے پہلو میں چبھوتی کیوں نہیں ہو؟“

ماں نے سرگوشی کی۔ ”میں تمہارے ضمیر کو جھنجوڑ کر بیدار کرنے کیلئے آیا کرتی تھی۔ آج تمہارا ضمیر بغیر جھنجوڑے بیدار ہوگیا ہے تو میں کیا کہوں؟“

"ماں! جو کچھ میں نے آج دیکھا ہے، پہلے دیکھ لیتا تو تمہاری باتوں پر یقین آ جاتا۔ شانی کلینک میں جانے سے پہلے خوش اور پُروقار تھی۔ لوٹنے پر یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے دِق نے اُس کا اندر چاٹ ڈالا ہو۔"

"پگلے! تم جس چیز کو خوشی اور وقار قرار دے رہے ہو وہ تقدس تھا۔ جسے دِق کہتے ہو، وہ گناہ ہے۔ گناہ انسان کو گھن کی طرح چاٹ لیتا ہے۔ اِس سے بھی بُرا ناکردہ گناہ ہوتا ہے۔ وہ ناکردہ گناہ کی بھینٹ چڑھ کر کھوکھلی ہوگئی ہے۔ اُس کے اندر گناہ ہی گناہ ہے، زندگی نہیں رہی۔"

اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے ہاتھ کو تھامنا چاہا تو کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ماں کے وجود سے بھر جانے والا کمرہ خالی ہو چکا تھا۔ جانے والی جا چکی تھی۔

وہ سونا چاہتا تھا مگر آنکھوں کے اندرونی پردوں پر ثبت شانی کی اُجڑی ہوئی شبیہ نے اُسے مضطرب کر دیا تھا۔ ذہنی انتشار بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر یوں لگا جیسے دل پسلیوں کے قفس سے نکل کر کن پٹیوں پر جا ٹکا ہو اور کان کے قریب دھڑکنے لگا ہو۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو سختی سے دبایا۔ افاقہ نہ ہونے پر جھنجلانے لگا۔ جھنجلاہٹ ہمیشہ بے بسی کو جنم دیتی ہے۔ بے بسی برداشت کی سرحد عبور کرنے کیلئے آنکھوں کے گوشوں سے رسنے لگتی ہے۔ ندامت کے آنسو گرم نہیں ہوتے۔ نمکین نہیں ہوتے۔ کچھ اور طرح کے ہوتے ہیں۔

فون کا بزر بجنے پر خالی الذہنی کی کیفیت میں فون سیٹ کو دیکھنے لگا۔ تیسری یا چوتھی بیل پر اُسے اُٹھایا، آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ "ہاں بھئی منیرے! کیسے بھول کر یاد کر بیٹھے ہو؟"

منیرا بولا۔ "یار! اپنے ملک امجد کو سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگے ہیں۔ بڑے ملک نے اُس کی شادی چوہدری باسط کی بڑی بیٹی سے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تمہاری مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

وہ اچھل پڑا۔ جلدی سے بولا۔ "یہ بول کہ ہوا کیا ہے؟"

"کچھ عرصہ پہلے کسی نے باسط کو بلیک میل کرنے کیلئے اُس کی بیٹی کی وڈیو فلم بنائی تھی۔ باسط کو پتہ چلا تو اُسے دل کا دورہ پڑ گیا جس کے نتیجے میں وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اَب اُس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹی نے اپنے ہونے والے شوہر کو تمام تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے فرمائش کی ہے وہ اُس فلم کی ماسٹر کاپی کو حاصل کرے۔" منیرے قصائی نے تفصیل بتلائی۔

اُس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ بدقت تمام بولا۔ "یار! بڑی عجیب بات کر رہے ہو۔ کیا اُس نے شادی سے پہلے ملک امجد کو بتلا دیا کہ......"

وہ بولا۔ "ہاں! اور مزے کی بات یہ ہے کہ اپنے ملک صاحب نے یہ کڑوا گھونٹ ہنستے ہوئے پی لیا ہے۔ میں نے اپنے طور پر پتہ چلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ کاروائی کون خبیث کر سکتا ہے۔"

"پھر کون سامنے آیا؟" اُسے اپنا لہجہ بھی عجیب لگ رہا تھا۔

"یہ رزالت بڑی سرکار نے کی ہے۔"

"اوہ......ہو......" عالمگیر نے سینے میں بھرا ہوا سانس آہستہ آہستہ خارج کیا۔ "پھر مجھے یہ سب کچھ بتلانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مشکل وقت میں بندہ اپنے یاروں پیاروں کو ہی آواز دیتا ہے۔ تم سے رابطہ نہیں کروں گا تو کس سے کروں گا۔ میں بڑی سرکار کے نیٹ ورک کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم جانتے ہو۔ کسی طرح اُس فلم کی ماسٹر کاپی حاصل کر کے مجھ تک پہنچا دو۔ تم جانتے ہو کہ ملک امجد کس ذہنیت کا آدمی ہے۔ وہ فلم لینے کیلئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

عالمگیر نے دلاسہ دیا۔ "یار منیرے! میری جان! تم فکر نہ کرو اور لمبی تان کر سو جاؤ۔ میں ایک دو ہفتوں میں تمہاری پریشانی دور کر دوں گا۔"

رابطہ منقطع ہونے پر عالمگیر اندیشوں میں گھر گیا۔ اُس کی توقع کے برعکس بتول نے راز کو خود ہی طشت از بام کر دیا تھا۔ سوچنے لگا۔ "اگر منیرے کو میری انوالومنٹ کا سراغ مل گیا تو معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔"

عافیت کا سانس لیا کہ ابھی تک وہ محفوظ تھا۔ اُس نے یہ ارادہ کر لیا کہ آنے والے دس بارہ دنوں میں وہ فلم کی بہترین کاپی کر کے منیرے کی طرف روانہ کر دے گا اور اُسے بتلا دے گا کہ راز رکھنے کی شرط پر بڑی مشکل سے حاصل کی گئی ہے۔ وہ مطمئن ہو کر اِس معاملے کو گول کر دے گا۔

ایسے میں اُسے کچھ یاد آیا۔ فون پر اپنے کسی ساتھی سے رابطہ کر کے اُسے ہدایات دینے

لگا۔ کلینک کا نام و پتہ اور مریضہ کا نام بتلا کر بولا۔ "تم نے ہر صورت میں اس مریضہ کی رپورٹ حاصل کرنی ہے۔ رپورٹ گم نہیں ہونی چاہیے۔"

کال منقطع کر کے کچھ سوچنے لگا۔ پھر بزر بج اُٹھا۔ اب کے سردار فضل اُس سے مخاطب تھا۔ بولا۔ "تھرڈ مین نے تم سے رابطہ کیا ہے یا نہیں؟"

وہ بولا۔ "ابھی تک تو کوئی سامنے نہیں آیا۔ میں نے اپنے طور پر پتہ چلانے کی کوشش کی ہے کہ تھرڈ مین کے پیچھے کون ہے۔ مجھے شک ہے کہ داؤد سبحانی تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"داؤد سبحانی...... وہ فاکس گروپ والا سیٹھ؟" سردار نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ یوں لگا جیسے داؤد سبحانی کا نام سُن کر اُس کا دل بیٹھ گیا ہو۔

وہ بولا۔ "ہاں وہی سیٹھ داؤد سبحانی......"

"پھر تو واقعی معاملہ بہت سنگین ہے۔ تم ایسا کرنا کہ جونہی تھرڈ مین تم سے رابطہ کرے اور کوئی ثبوت فراہم کرے تو تم فوری طور پر یہاں چلے آنا۔ دونوں مل کر سوچیں گے۔" سردار نے کہا اور رابطہ ختم کر دیا۔

وہ مسکرانے لگا۔ جانتا تھا کہ شانی اُسے نہیں جانے دے گی۔ باپ اپنی لاڈلی بیٹی کی ضد پر سر جھکا لیتا تھا۔ گھنٹہ بھر کے بعد پھر فون بول پڑا۔ اُس کا وہی ساتھی رابطہ کر رہا تھا جسے اُس نے شانی کی رپورٹ حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اُس نے کہا۔ "میں تمہاری کوٹھی سے دو تین سو فٹ کے فاصلے پر سفید سوزوکی میں بیٹھا ہوں۔ آ کر اپنی چیز لے جاؤ۔"

وہ فون بند کر کے بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ دونوں طرف دیکھا۔ شمال کی طرف دوسری کوٹھی کے گیٹ کے سامنے سفید سوزوکی کھڑی تھی۔ وہ نزدیک جا کر جھک کر اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ "کتنے پیسے لگے؟"

"دو ہزار روپے ڈاکٹر کی اسسٹنٹ نے مجھ سے جھاڑ لئے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ تمہیں دو سے ضرب لگا کر پہنچا دوں گا۔"

ایسے کاموں میں ایسا معاوضہ دیا اور لیا جاتا ہے۔

سفید لفافہ پینٹ کی ہپ پاکٹ میں ٹھونستے ہوئے واپس آ گیا۔ کمرے میں پہنچ کر رپورٹ ملاحظہ کی۔ شک یقین میں بدل گیا۔ اپنے چرمی بیگ میں لفافے کو سنبھال کر رکھتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے سوچنے لگا۔ "چھوٹے باپ کی بیٹی نے اپنے وجود کو شفاف شیشے میں بند کر کے اپنے محبوب کے سامنے رکھ دیا اور ہر فکر سے آزاد ہو گئی۔ بڑے باپ کی بیٹی اپنے ناکردہ گناہ کو سات پردوں میں لپیٹ کر چھپانا چاہتی ہے۔ جتنا چھپاتی ہے، اتنا ہی نظروں میں آتی ہے۔"

اُس کی محبت پر شک کرنے لگا۔ سوچنے لگا۔ "محبت کرنے والے جھوٹ نہیں بولتے۔ اُن کی ذات شفاف شیشہ بن جاتی ہے۔ بال بھی آئے تو دور سے دکھائی دینے لگتا ہے۔" دل سے ہوک اُٹھی۔ "ہائے کاش! اِس مغرور حسینہ نے مجھ سے پورے اعتماد کے ساتھ محبت کی ہوتی!"

یکبارگی ایک خیال برقی رو کی طرح اُس کے ذہن میں کوندا اور وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ہنستے ہنستے بے حال ہونے لگا۔ کھڑکی میں آن کھڑا ہوا اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ بے تحاشا ہنسنے سے آنکھوں میں پانی آ گیا۔ پردے کی پٹی سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ جتنی چینی ڈالی جائے گی، چائے میں اتنی مٹھاس ہی ہو گی۔ بتول اور امجد کی محبت دونوں طرف سے پاکیزہ ہے۔ میری اور شانی کی محبت میں دونوں طرف ریا ہے، دونوں طرف جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ سچ اور جھوٹ میں کوئی فرق نہ ہوتا تو ماں کیوں میرے پاس آتی اور نصیحتیں کرتی۔"

سر جھٹک کر اپنے آئندہ داؤ کے بارے میں سوچنے لگا۔ مخصوص فون نمبر چالو کر کے شاہانہ سے رابطہ کیا۔ فون کان سے لگایا اور لہجہ بدل کر بولا "ہیلو شاہانہ فضل! بڑے دنوں کے بعد رابطہ کر رہا ہوں۔"

تھکے تھکے لہجے میں بولی تو یوں لگا جیسے رو رہی ہو۔ "بولو! میں سن رہی ہوں۔"

"تم اپنی شامت کو آواز دینے والے اقدامات کرتی پھر رہی ہو۔ میرے بڑوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تمہارے پیروں میں بندھی رسی کو کھینچ لیا جائے تو بہتر ہے۔"

"میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو تمہارے فرعونوں کو پسند نہیں آیا۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

"یہ تم بہتر جانتی ہو۔"

"میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دور کھڑے ہو کر بھونکنے والے کتے ہو۔ بزدلوں کی طرح

بل میں چھپے بیٹھے ہو۔ ایک لڑکی کے سامنے آنے کی جرأت بھی نہیں رکھتے۔" یوں لگا جیسے شانی نے مرنے یا مار دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ غیر معمولی سختی سے بولی۔ "اپنے بڑوں سے جا کر کہہ دو۔ میں نے رسی کو کاٹ پھینکنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم سے جو ہوسکتا ہے، کرو میرا دماغ مت چاٹو۔"

عالمگیر کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تیر گئی۔ بولا۔ "تمہیں ہر پل نگاہوں میں رکھا جاتا ہے۔ کیا کرتی ہو؟ کہاں جاتی ہو؟ کس سے ملتی ہو؟...... بڑوں تک تمہاری ایک ایک حرکت کی رپورٹ پہنچتی رہتی ہے۔ آج تمہیں پتہ چلا ہے کہ ایک وڈیو کیسٹ باہر رہ کر تمہارا خون پی رہی ہے تو دوسری تمہارے بدن میں رہ کر خون چوسنے لگی ہے۔ اُس سے چھٹکارا پانے کی ہر کوشش کیمرے کی آنکھ میں بڑی نفاست سے محفوظ کی جا رہی ہے۔"

دوسری طرف اچانک خاموشی چھا گئی۔ تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ لہجے میں مزید سفاکی سمو کر بولا۔ "اپنے سچے طلبگار کو چھوڑ کر اپنی سطح سے نیچے اُترو گی تو ذلالت کے تہہ خانوں میں دھکیل دی جاؤ گی۔ اشارے کو سمجھو، یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ چند لمحے توقف کے بعد عالمگیر نے رابطہ منقطع کر دیا۔

شام کو ڈائننگ ٹیبل پر اکیلے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے رحمت بی سے شانی کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولی۔ "بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لگتا ہے بخار پوری طرح جسم سے نکلا نہیں ہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا اُس نے۔"

کھانا کھانے کے بعد اُس نے رحمت بی سے شانی کیلئے کھانا ٹرے میں رکھوایا اور ٹرے اُٹھائے اُس کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہ کمبل میں دُبکی پڑی تھی۔ قریب آ کر بولا۔

"مس شاہانہ! اُٹھو۔ کھانا کھا لو۔"

اُس نے منہ پر سے کمبل ہٹایا۔ پتہ چلا کہ وہ رو رہی تھی۔ رونے کا سبب جانتے بوجھتے دریافت کرنے لگا۔ "کیا ہوا؟ کیوں ایسے جاہلوں کی طرح آنسو بہائے چلی جا رہی ہو؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں سختی سے دبا کر اُٹھ بیٹھی۔ ہچکی لے کر بولی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ فرمان تو رحمت بی بھی سن چکی ہے۔"

وہ گیلی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ نظروں کی تاب نہ لا کر نظریں چُرا کر بولا۔ "کھانا لے کر آتا تو اور بات تھی۔ اَب لے آیا ہوں تو کھلائے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔"

وہ انکار میں سر ہلانے لگی۔ وہ اُس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ٹرے سامنے رکھ لی۔ نوالہ توڑ کر اُس کے منہ کے قریب لے گیا۔ وہ سختی سے بولی۔ "کہہ دیا ہے کہ نہیں کھاؤں گی۔ کیوں ضد کر رہے ہو؟"

کوئی جواب دیے بغیر اُس نے نوالہ اُس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ شاید اُس کی دماغی حالت پر شبہ کرنے لگی تھی۔ نوالہ طوعاً و کرہاً نگلنے کی کوشش کی۔ ہچکی لگ گئی۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ پانی دکھائی نہیں دیا تو پھنسی پھنسی آواز میں کراہی۔ "پانی تو ساتھ لے آتے۔"

وہ بھاگ کر ڈائننگ ٹیبل پر سے جگ اور گلاس اُٹھا لایا۔ پانی پلاتے ہوئے بولا۔ "میں جب سے یہاں آیا ہوں، تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں۔ بڑے باپ کی بیٹی ہو اس لئے اپنی پرابلم کسی ہم پلہ سے ہی شیئر کرو گی۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں رئیس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہیے۔"

اُسے اچنبھا ہوا۔ ہونٹوں کے اطراف کی جلد پانی پینے کے دوران گیلی ہوگئی تھی جسے اُس نے صاف نہیں کیا۔ ماتھے پر بل ڈال کر گھورتے ہوئے بولی۔ "کیوں؟"

وہ بولا۔ "کیونکہ وہ تمہارا اچھا دوست ہے۔"

"وہ میرا دوست نہیں رہا بلکہ کبھی بھی نہیں رہا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

شانی نے جواب نہیں دیا۔ عالمگیر نے باتوں کے دوران نوالے توڑ کر اُس کے منہ میں ٹھونسنے کا سلسلہ تواتر سے جاری رکھا تھا۔ بولا۔ "ہوسکتا ہے کہ مجھے کل یا پرسوں کسی وقت تمہارے باپ کے پاس جانا پڑے۔ ایسے میں تمہارے لئے بہتر ہوگا کہ گھر سے باہر نہ نکلو۔"

وہ گھبرا کر بولی۔ "نن...... نہیں...... تم کہیں نہیں جاؤ گے۔"

"کیوں؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اپنے گھر میں ڈر کیسا؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "تم ساتھ ہوتے ہو تو مجھے ڈر نہیں لگتا۔"

"میرا یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم اپنے خول میں سمٹ کر بیٹھی ہوئی ہو۔ کچھ کھل کر بتاتی نہیں ہو۔ مجھے ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ تمہیں کن لوگوں سے خطرہ محسوس ہوتا ہے یا کون لوگ تمہیں گزند پہنچانا چاہتے ہیں۔ بھرے بازار میں کسی طرف سے اچانک گولی نکل کر تمہیں نگل جائے، مجھے پھاڑ دے، میں کیا کرلوں گا؟"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شانی نے سر جھکا لیا۔ سوچنے لگی۔ دل ہر طرف سے واہموں اور اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ کسی پر اعتماد کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ دل میں خیالی گھوڑے کو ایڑ لگا کر دوڑانے لگی۔ "میں لڑکی ہوں۔ کسی ڈاکو کا ہاتھ نہیں روک سکتی۔ کسی کتے کی زبان کو لگام نہیں ڈال سکتی۔ مجھے کسی نہ کسی پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ ڈاکٹر پر اعتماد نہیں کیا تھا مگر اُس نے مجھ پر اعتماد کرلیا تھا۔ آج نہیں تو کل، ہر کسی پر میری بے حیائی کھل جائے گی۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا ورنہ بے موت ماری جاؤں گی۔"

وہ دیکھ رہا تھا کہ شانی گہری سوچ میں مستغرق ہے، اِس لئے خاموشی سے نوالے اُس کے منہ میں ڈالتا رہا۔ بے دلی سے منہ چلاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ "میرے اردگرد محدود تعداد میں مرد موجود ہیں۔ اُن میں سے صرف یہی میری مدد کرسکتا ہے۔ مجھے اِس کو اپنے غیاب اور دورانِ غیاب بیتنے والی روئیداد سنا دینی چاہیے۔ ممکن ہے کہ یہ اُن خبیثوں کے جبڑے توڑ کر مجھے ہمیشہ کیلئے آزاد کرالے۔"

سوچتے ہوئے اُس پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ کھوجتے ہوئے بولا۔ "کیا تم کسی سے محبت کرتی ہو؟"

وہ چند لمحے اُسے ایک ٹک حیرت بھری آنکھوں سے گھورتی رہی۔ ہونٹ کپکپائے گئے۔ سر جھکا کر بولی۔ "ہاں!"

"کس سے؟" اُس نے برسبیلِ تذکرہ پوچھ لیا۔

"تم سے!" آواز اتنی مدھم تھی کہ عالمگیر کو بمشکل سنائی دی۔ مسکرانے لگا۔ دو لفظوں نے اُس کے وجود میں طمانیت بھر دی تھی۔ وہ چند لمحے تک پلکیں جھکائے اُس کے ردِعمل کا انتظار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتی رہی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "عالمگیر! میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے تمہارے آنے پر میرے بدن میں زندگی کی لہر دوڑنے لگی ہے۔"

اُس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہی تو آزردگی سے بولی۔ "مجھے علم ہے کہ کوئی لڑکی اگر اپنے طور پر اعتراف کا پندھ طے کرلے تو وہ بے وقعت ہوجاتی ہے۔ مگر بہ صد کوشش، میں ضبط کرنے میں ناکام ہوگئی ہوں۔"

عالمگیر کی خاموشی اور مسکراہٹ اُسے کھلنے لگی۔ اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو سختی سے دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر دباتے ہوئے بولی۔ "تم اس طرح بت بن کر کیوں بیٹھے ہو؟ کچھ بولو ناں!"

اُس نے آہستگی سے ہاتھ چھڑایا اور نوالہ ٹرے میں رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر بولا۔ "مس شاہانہ! میرا قد بہت چھوٹا ہے۔ تم بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ تمہارے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھاموں گا تو پورا زمانہ مجھ پر تھو تھو کرے گا اور پیٹھ پیچھے مجھے دولت پرست، غاصب اور جانے کیا کچھ کہے گا۔ تمہارے منہ پر تمہاری سکھیاں تمہیں طعنے دیں گی اور کہیں گی کہ دنیا میں تمہیں کوئی ہم پلہ ہی نہیں ملا تھا جو اِس گھٹیا انسان کی پینگ پر جھولنے لگی ہو۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اُس نے دھیان دیے بغیر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں مس شاہانہ! محبت ایسے نہیں ہوتی۔ وہ دور نہیں رہا جب پہلی نظر میں کسی کو دل دے دیا جاتا تھا۔ اب ہر زینے پر سوچ سمجھ کر قدم رکھا جاتا ہے۔ میرا کیا ہے؟ کوئی بھی تمہاری محبت پاکر خود کو دنیا کا خوش قسمت انسان تصور کرے گا۔ تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے باپ کی کروڑوں کی جائیداد اور بینک بیلنس بھی بندھا چلا آئے گا۔ گنگا اشنان پر دیوی کے درشن لئے ہوں تو کون قدموں کو روکتا ہے۔"

وہ ٹہلتا ہوا اُس کے قریب آ گیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "میں اگر یہ پوچھوں کہ تم نے کیا سوچ کر مجھ سے محبت کا فیصلہ کیا ہے تو تم کیا جواب دو گی؟"

وہ گھبرا سی گئی۔ بڑبڑائی۔ "یہ کیا بات ہوئی؟ محبت سوچنے کا موقع ہی کب دیتی ہے؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔ چلو یہ ہی بتا دو کہ تم نے کیا سوچ کر رئیس کو دھتکارا ہے؟"

وہ خاموشی سے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتی گئی۔ اُس کے پاس عالمگیر کی ہر بات کا جواب موجود تھا مگر دے کر لاجواب نہیں ہونا چاہتی تھی۔ آہستگی سے بولی۔ ''عالمگیر! میں تمہارے لائق نہیں ہوں یا شاید تم کسی اور کو چاہتے ہو۔ دونوں صورتیں مجھے مایوس کر دینے والی ہیں۔''

وہ اُس کے مزید قریب ہو کر بولا۔ ''تمہاری سب باتیں بے سروپا ہیں۔ تم کیا ہو؟ میں جانتا ہوں۔ میں کیا ہوں؟ تم نہیں جانتیں۔ میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی اور نہ ہی میں کسی کے پیچھے گیا ہوں۔''

''پھر؟''

''مس شاہانہ! میں نادان نہیں ہوں۔ بچہ نہیں ہوں۔ جانتا ہوں کہ تمہیں کوئی چرکہ لگ گیا ہے۔ کوئی زخم تڑپاتا رہتا ہے۔ میری آنکھوں میں دھول جھونک کر میری محبت کا بھرم اُس پر رکھنا چاہتی ہو۔ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے ہوئے محبت کا اظہار کرتی ہو۔ اگر چاہوں تو ایک دن میں ہی تمہارے زخم کو کرید کر دیکھ سکتا ہوں۔ جو پریشانی تمہیں رات دن بے چین رکھتی ہے، اُس کے سوتے تلاش کر سکتا ہوں مگر میں سوچتا ہوں کہ جب تم مجھ پر اعتماد ہی نہیں کرتی ہو تو مجھے خواہ مخواہ تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔'' لمحاتی توقف کے بعد گویا ہوا۔ ''میں سونے کیلئے جا رہا ہوں۔ تمہارے لئے پوری رات پڑی ہے۔ محبت پر چار حرف بھیجتے ہوئے یہ فیصلہ کرو کہ کیا تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے؟ اگر ضرورت محسوس کرو تو میرے ساتھ اپنی پریشانی شیئر کر لینا ورنہ مجھے یہاں رکھنے کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا، میں واپس چلا جاؤں گا۔ تمہیں بند کمرے میں کڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ میں تمہارے سکھ کیلئے جان دینے اور جان لینے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔'' عالمگیر نے اُسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا اور پلٹ کر باہر کی طرف چل دیا۔ دروازے میں رُک کر بولا۔ ''محبت بچوں کا کھیل ہے، بڑوں کا نہیں۔ بچے سود و زیاں کو خاطر میں نہیں لایا کرتے۔ بڑے شمار و حساب میں پڑ کر پیچھے رہ جاتے ہیں اور پھر عمر بھر پچھتاتے ہوئے اپنے حساب کتاب کی غلطیاں پکڑتے رہتے ہیں۔''

وہ چلا گیا۔ اسے روکنا چاہتی تھی مگر روک نہ پائی۔ دائیں پہلو میں رکھی ہوئی ٹرے کو دیکھا۔ نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا۔ بے ذائقہ لگا۔ کھلانے والا کھانے کا ذائقہ چرا کر اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ لے گیا تھا۔ غیر ارادی طور پر سوچنے لگی۔ ''اب کیا کروں؟ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ شاید مجھے اپنی سطح سے نہیں گرنا چاہیے تھا۔''

پھر سوچنے لگی۔ ''میری سطح کیا ہے؟''

اس کے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بس یوں لگا جیسے بے دھیانی میں اُس نے نیم کے پتے ہتھیلیوں میں مسل کر منہ میں رکھ لئے ہوں۔ نہ ختم ہونے والی کڑواہٹ منہ میں گھل گئی۔

عالمگیر کے کمرے میں اُس کی زندگی کی طرح مضمحل اور اداس رات طاری تھی۔ اُس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تنا ہوا تھا۔ اپنی تعین شدہ منزل کے قریب پہنچ کر اُس کی ذہنی کیفیت متغیر ہونے لگی تھی۔ اُس نے ایک غلطی کی تھی۔ اُسے شانی کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ ندامت روح کی گیرائی تک اُتر گئی تھی۔ ضمیر کو تھپک کر سلانے کیلئے بڑبڑایا۔ ''اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ میرے قریب نہ آتی۔ رئیس کو دھکے دے کر دل کی دنیا سے نہ نکالتی۔ میں نے اُسے زخم دیا ہے، میں ہی زخم پر مرہم رکھ کر حساب برابر کر دوں گا۔''

جب شانی کے بارے میں سوچتا تو غیرت بھی کمرہ امتحان میں کاپی قلم اٹھا کر بیٹھ جاتی۔ وہ اتنا وسیع النظر اور فراخ قلب نہیں تھا کہ ایسے روح فرسا واقعے کو نظر انداز کر کے ہنستا کھیلتا۔ زندگی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ہر آن نیا منظر دکھانے پر تُلی رہتی ہے۔ اگر عالمگیر اُسے بے حیا نہ بناتا تو اُس کے اپنے دل کی دنیا ویران پڑی رہتی اور وہ اپنے مقاصد پورے کرنے میں ناکام رہتا۔ بے حیا بنانے کے بعد احساس ہوا کہ وہ تو اُسے دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگا ہے۔ ایسے میں دل نے عجیب دکھ اوڑھ لیا تھا۔ کیا وہ آئندہ زندگی میں دامن پر لگے ہوئے کردار کے دھبے کو مٹا پائے گا؟

جھنجلا کر ماں کو پکارنے لگا۔ کوئی نصیحت، کوئی طعنہ، کچھ بھی...... مگر وہ نہ آئی۔ شاید ناراض ہو گئی تھی۔ یا شاید اُس کے ضمیر کی بیداری پر مطمئن ہو کر ہمیشہ کیلئے چلی گئی تھی۔ جھنجلا کر بولا۔ ''جب مجھے ضرورت نہیں تھی تو ہر روز سینہ چھلنی کرنے کیلئے آجاتی تھیں۔ آج ضرورت پڑنے پر بلا رہا ہوں تو دکھائی تک نہیں دیتی ہو۔ کیا میری غیرت کی طرح تمہاری ممتا بھی تھک گئی ہے؟''

آنکھوں میں کوئی عکس نہیں لہرایا، کوئی لہر سماعت سے نہیں ٹکرائی تو وہ مایوس ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سوچیں لوریاں دیتے دیتے آخر کار اُسے سلانے میں کامیاب ہو گئیں۔

رات نصف سفر طے کر چکی تھی کہ شانی کا سفر عالمگیر کے کمرے کے دروازے پر آ کر رُک گیا۔ کھلے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ نہیں جاگا تو اندر داخل ہو کر اُس کے بیڈ کے پاس قالین پر ڈھے سی گئی۔ سانس پھول چکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میلوں کا آبلہ پا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔ سونے والے کی قسمت جاگ رہی تھی۔ اُسے جھنجوڑ کر جگاتے ہوئے سرگوشیاں کرنے لگی۔ "اے خوش بخت! دیکھ تو کیا ... بہروپ بدل کر تیرے پاس آن پہنچی ہوں۔ جاگ ورنہ تمام عمر سوتا ہی رہ جائے گا۔"

وہ کسمسا کر رہ گیا۔ نہیں جاگا تو پھر قسمت نے سمجھایا۔ "اُٹھ جا ورنہ میں جس راستے آئی ہوں، اُسی راستے سے پلٹ جاؤں گی۔ تم سمجھتے ہو کہ تم اپنی تدبیر سے منزل تک پہنچنے والے ہو، میں کہتی ہوں کہ میرے التفات نے اُنگلی پکڑ کر تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے۔"

وہ جاگ گیا۔ آنکھیں پٹ پٹا کر اردگرد دیکھنے لگا۔ قسمت جسے نظروں کے سامنے ... چاہتی تھی، وہ قدموں کے پاس فرش پر بیٹھی تھی۔ وہ اوپر دیکھ رہا تھا۔ ایسے میں پھر قسمت ٹھوکہ دیا۔ "تم تو نرے احمق ہو۔ اوپر لٹکتے ہوئے بیر اپنی قوتِ بازو سے حاصل کیے جا... ہیں۔ میں دینے پر آتی ہوں تو تیز ہوا رواں کر دیتی ہوں جو آن کی آن میں جھولیاں بھر... ہے۔ تم اوپر نہیں، نیچے دیکھو۔"

اُس نے نیچے دیکھا۔ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ نائٹ بلب کی نیلی روشنی میں بیڈ سے ... ٹکائے بیٹھی وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے شادی کی دوسری رات میں بیوہ ہونے والی عورت قبر پر بیٹھی ہو۔ وہ کمبل پھینک کر نیچے اُترا اور اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ شانی کے بے جان وجود میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی تو وہ حیرت بھری آواز میں بولا۔ "شانی! یہاں؟ وہ بھی اِس وقت؟"

اُس نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ عالمگیر نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور بیڈ پر بٹھا دیا۔ پتہ چلا کہ اُس کا بدن نہایت سرد تھا۔ جلدی سے کمبل لپیٹتے ہوئے بولا۔ "تم واقعی احمق لڑکی ہو۔ اتنی سردی میں آدھی رات کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بڑبڑائی۔ "بلا ضرورت بھی کوئی آتا ہے کیا؟"

عالمگیر نے کھلے دروازے کو بند کر کے اُس کے قریب آ بیٹھا۔ "کہو تو لائٹ آن کر دوں؟"

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔ ایسے ہی ٹھیک ہے۔"

مٹی کی مورتی کو جہاں رکھو، جدھر پھینکو، جو بھی کرو، خاموش ہی رہتی ہے۔ عالمگیر نے ...ی کی مورتی کو کمبل سمیت نرمی سے گھسیٹ کر لٹا دیا۔ مورتیاں مزاحمت نہیں کرتیں۔ کمبل کو ...ست کر کے باہر نکل آیا۔ کچن میں گیا۔ دودھ گرم کر کے لے آیا۔ کپ میں ڈالتے ہوئے ...لا۔ "تجھے اتنی سردی میں اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ بخار بگڑ جائے تو ...توں اترنے کا نام نہیں لیتا۔"

وہ کپ دیکھ کر مریضوں کی طرح اُٹھ بیٹھی۔ خالی خالی نگاہوں سے کپ کو گھورتی رہی۔ ...ے ذائقہ دودھ نہیں پینا چاہتی تھی۔ وہ بولا۔ "پکڑو ناں!"

اُس کے جسم میں کوئی جنبش دکھائی نہیں دی تو قریب بیٹھ کر اُس کے منہ سے لگاتے ...ئے بولا۔ "تم حد سے زیادہ خوشامدیں کرانے لگی ہو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ مجھے تمہارے باپ ...نوکری چھوڑنا پڑ جائے۔"

وہ عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے دودھ پینے لگی۔ اپنے ہاتھ سے کھانے پینے ...ا توازن رہتا ہے۔ دوسرا پلائے تو کبھی گھونٹ بڑا ہو جاتا ہے کبھی چھوٹا رہ جاتا ہے۔ کبھی ...بھی ہوتا ہے کہ جام لبریز ہو کر چھلک جاتا ہے۔ دودھ پینے کے بعد وہ بھی چھلک پڑی۔ ...ے کندھے سے سر ٹکا کر بے اختیار رونے لگی۔ وہ خاموش بیٹھا اُس کے بولنے کا انتظار ...تا رہا۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "میں بہت بری ہوں۔ مجھے اپنے وجود سے بھی گھن ...نے لگی ہے۔ خود کو چھوتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہاتھ گندگی کو چھو بیٹھے ہوں۔ ...تی ہوں تو ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ میں تم پر اعتماد نہیں کرتی۔ میں کہتی ہوں کہ ...کی پر اعتماد کرنے کے قابل ہی نہیں رہی ہوں۔ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو، میں جانتی ہوں ...میری شرم میرے بولنے سے پہلے ہی میری زبان پر چھالے بنا دیتی ہے۔ تم نے واپس ...نے کی دھمکی دیتے ہوئے مجھے ایک رات کا وقت دیا تھا۔ رات ابھی باقی ہے اور میں

تمہارے ساتھ اپنا دکھ شیئر کرنے کیلئے آ گئی ہوں۔"

وہ بدستور خاموش رہا۔

شانی اُس کے کندھے پر اپنے ہونٹ اور گال رگڑتے ہوئے ہیجانی انداز میں کہہ رہی تھی۔ "تم مجھے محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ چاہتے ہو کہ میں باعزت رہوں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ تمہیں بتانا چاہتی ہوں مگر یہ بھی جانتی ہوں کہ جونہی میری زبان کھلی، تم مجھ پر تھوتھو کرنے لگو گے اور آنکھوں پر بیٹھانے والے ہاتھوں سے دھکے دے کر باہر نکال دو گے۔"

آہستگی سے اُس کے وجود کو پرے ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔ پژمردہ قدموں سے چلتے ہوئے کھڑکی کے پردے کے مقابل آن ٹھہرا۔ شانی کی طرف پیٹھ کر کے بولا۔ "تم یہ سمجھو کہ کمرے میں تمہارے سوا کوئی نہیں۔ اپنے دکھ کو کھل کر آشکار کر دو۔ میں بغیر روکے ٹوکے تمہارے آخری لفظ تک خاموش رہوں گا۔"

عالمگیر نے اُس کی پریشانی کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ اطمینان کا سانس لے کر سوچنے لگی۔ 'کتنا اچھا ہے۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا ہے کہ میں نظریں ملا کر کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوں۔ پیٹھ پیچھے تو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔'

وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کر کہنے لگی۔ "محبت بھیک میں نہیں ملتی۔ محبت پھوکٹ میں نہیں ملتی۔ محبت زبردستی حاصل نہیں کی جا سکتی البتہ مدد مل جاتی ہے، ہمدردی حاصل ہو جاتی ہے۔ میں اعتماد کرتے ہوئے تمہیں سب کچھ بتلا دیتی ہوں۔ محبت دینا، ہمدردی یا مدد بہم پہنچانا یہ سراسر تمہاری مرضی پر موقوف ہوگا۔ تو سنو......"

وہ بلا روک ٹوک بولتی جا رہی تھی۔ سچ بولنے سے اضطراب کم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے تھکے ہوئے بدن کو سچ کی لاٹھی تھما رہی تھی۔ ایسے میں عالمگیر کھڑکی کی طرف منہ کئے سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا رہا، گہرے کش لیتا رہا۔ سسکیوں کی تال پر مچلتی داستان کے تمام ہونے تک سگریٹ کی ناگوار بُو سے کمرہ رچ گیا تھا۔ لفظ ختم ہو چکے تو وہ گھٹنوں پر پیشانی ٹکا کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگ گئی۔

عالمگیر نے کھڑکی کھول دی۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا کمرے میں داخل ہوئی تو سانس لینا قدرے آسان ہو گیا۔ مڑ کر اُس کے قریب آیا۔ چہرہ اُٹھایا۔ دریا نے سیلاب گیلی زمین کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے دردی سے انڈیل رکھا تھا۔ انگلیوں کی پوروں سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "شاہانہ! تم نے جتنا رونا تھا، رو لیا۔ جتنا دُکھ جھیلنا تھا، جھیل لیا۔ اَب میں تمہاری دنیا میں آ گیا ہوں۔ جاؤ! جا کر اطمینان سے سو جاؤ۔"

وہ سسکتے ہوئے استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ سمجھانے لگا۔ "میں نے کہا ناں کہ تمہاری پریشانی ختم ہو چکی ہے۔ اگر تم پہلے دن ہی مجھے تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیتیں تو اتنا کچھ دیکھنا نہ پڑتا۔ جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ وہ واپس نہیں ہو سکتا مگر جو نہیں ہونا چاہیے، وہ کبھی نہیں ہوگا۔ تمہاری طرف آنے والے ہر دُکھ کو، ہر پریشانی کو سنبھال لوں گا۔ اگر اُس کمینے کا فون آئے تو تم اٹینڈ کر کے خاموشی اختیار کر لینا۔ اُس کی کسی بات کا جواب نہ دینا۔"

وہ بولی۔ "بھیک، ہمدردی یا محبت؟"

وہ مسکرا کر اُس کے قریب کھسک آیا۔ آنکھوں کو والہانہ انداز میں چومتے ہوئے بولا۔ "آئی لو یو شانی! بھیک اور ہمدردی تو رہی ایک طرف، میری نظر میں تم آج بھی اِس قابل ہو کہ محبت کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکو۔"

عالمگیر نے ایک ہی جست میں برسوں کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ آنکھوں نے رِسنا بند کر دیا، جھومنا شروع کر دیا۔ آنکھوں کو ملنے والے انعام پر شاید ہونٹ بھی مچل گئے تھے، اِس لئے بڑے دنوں کے بعد لبوں پر مسکراہٹ اُتر آئی۔

کھلی ہوئی کھڑکی کی بدولت فجر کی اذان سنائی دینے لگی۔ دونوں نے چونک کر دیوار گیر گھڑی کی سمت دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شانی گھبرا سی گئی۔ بولی۔ "رحمت بی کے جاگنے کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہارے ساتھ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔"

بیڈ سے اُتر کر سلیپر پہنتے ہوئے بولی۔ "میں چلتی ہوں۔ پاپا کا فون آئے تو انہیں کہہ دینا کہ مجھ سے بات کر لیں۔ تم میرے پاس رہو گے۔"

عالمگیر نے ہنس کر کہا۔ "اَب کون کافر تم سے دور جانے کی سوچے گا!"

وہ بھی ہنس دی۔ پلٹی تو چونک گئی۔ رحمت بی دونوں کولہوں پر ہاتھ رکھے عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھبرا کر عالمگیر کی طرف مڑی۔ وہ بنا مانگے توجیہہ پیش کرتے ہوئے بولا۔ "رحمت بی! یہ تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں آئی تھی۔ تم کہاں تھیں؟"

وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔ ''پھر یہاں بیٹھ کر بی بی نے دو چار گھنٹے میرے آنے کا انتظار کیا۔ یوں ہی سہی۔ بی بی کا انتظار ختم کرنے کیلئے میں آ گئی ہوں۔''

دونوں کھسیا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ رحمت بی نے دونوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر ہاتھ نچا کر کہا۔ ''عشقا وے چھڈ پلا، وِیلے دی ترٹ وِچ۔ ہولیاں دی گل کیہڑی، بھارے ڈِگ پیندے نیں۔۔۔۔۔ جو تم بڑے بن بیٹھے تو کیا بگڑ گیا زمانے کا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ غلطی کو غلطی تک محدود رکھو گے تو میری زبان بند رہے گی۔ غلطی کو گناہ بنانے کی کوشش کرو گے تو میں خاموش نہیں رہوں گی۔ رَب جانتے، غلطی ہوئی ہے، گناہ ہوا ہے مگر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ابھی صرف غلطی سرزد ہوئی ہے۔ گناہ کرنے والوں کے چہروں پر معصومیت نہیں ہوتی۔ تمہارے چہروں پر معصومیت ہے۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے دونوں کے بیچ میں سے ہٹ گئی۔ دیوار فاصلے بڑھاتی ہے، گر کر فاصلے مٹا دیتی ہے۔

ناشتے کی میز تک دونوں اکٹھے رہے، پھر اپنی اپنی دنیا میں لوٹ آئے۔

عالمگیر کیلئے آنے والا دن خاصا مصروف گزرنے والا تھا۔ اُس نے مطلوبہ اشیاء کا پیکٹ بنا کر ڈرائیور کے ہاتھ سردار کے پاس بھجوا دیا۔ فون کر کے بتلایا۔ ''سردار! میں نے کہا تھا ناں کہ تمہاری شامت آنے والی ہے۔ اُن کم بختوں نے تمہیں پھانسی پر لٹکانے کا مکمل بندوبست کر رکھا ہے۔ پیکٹ ڈرائیور کے ہاتھ تمہیں شام تک مل جائے گا۔ کسی کی موجودگی میں کھول کر مت دیکھنا۔''

سردار نے کہا۔ ''تم خود کیوں نہیں آئے؟''

وہ بولا۔ ''میں نہیں آ سکتا۔ شانی بی بی کے ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ اُسے یہاں اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔''

سردار نے پوچھا۔ ''کیا ہے اُس پیکٹ میں؟''

''تم خود دیکھ لو گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ شام کو بات ہو گی۔''

فون بند ہو گیا۔ اُس نے نمبر بدل کر شانی سے رابطہ کیا۔ وہ اِس وقت لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ کال ملا کر اُس نے کہا۔ ''شاہانہ فضل! کیسی ہو؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواب نہیں ملا تو وہ بھڑک کر بولا۔ ''تم بولتی کیوں نہیں ہو؟''

یوں لگ رہا تھا جیسے شانی نے کال ریسیو کر کے فون کو خود سے پَرے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنا غصہ ظاہر کرتا رہا مگر شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے کال منقطع کر دی۔ مسکرانے لگا۔ شانی اُس کی ہدایت پر پوری طرح عمل پیرا ہوئی تھی۔ اُس نے پھر نمبر بدلا۔ منیرے قصائی سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''جانِ عالمگیر! کس حال میں ہو؟''

منیرا آہ بھر کر بولا۔ ''ہائے! کیا حال پوچھتے ہو مجھ خانہ خراب کا۔ اندھا ہوں، سرمہ تلاش کر رہا ہوں مگر نہ تو کوئی سوداگر ملتا ہے، نہ سرمہ دانی ملتی ہے۔۔۔۔۔ تم کہو! میرے کام کا کیا ہوا؟''

وہ بولا۔ ''دو دِنوں سے تمہارے لئے خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔ کل پتہ چلا تھا کہ بڑی سرکار نے یہاں کے کسی گروہ کی خدمات حاصل کی تھیں۔ خدا خدا کر کے گروہ ٹریس ہوا ہے۔ امید ہے کہ کل شام تک ماسٹر کاپی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پھر بول! مجھے کیا انعام دیا جائے گا؟''

منیرے نے خوش ہو کر کہا۔ ''ملک امجد تمہارا منہ چوم لے گا۔''

وہ ہنسا۔ ''میں نے انعام کی بات کی ہے۔''

''جو یار کے منہ سے پھوٹا، وہی ملے گا۔''

''بتا کر انعام لینا یا پوچھ کر دینا، کمینوں کا کام ہوتا ہے۔''

منیرا گالی دے کر بولا۔ ''انسان بن۔ ایسی ڈونگھی باتیں نہ کر میرے ساتھ۔ تو کمینہ مت بن، ہم بن کر پوچھ لیں گے۔''

اُس نے قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔ لان میں آیا جہاں ٹھنڈی شبنم زدہ گھاس پر شانی ننگے پیر چل رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''اتنی سردی میں ننگے پیر چل رہی ہو!''

وہ ہنسی۔ ''تم نے کہا تھا ناں کہ میری طرف آنے والی ہر پریشانی کو سنبھال لو گے۔۔۔۔۔ بیمار پڑ گئی تو سنبھال لینا۔''

وہ حیرانی سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ چند گھنٹوں میں کتنی بدل گئی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ محبت فاتح عالم ہوتی ہے۔ بولی۔ ''اُس کا فون آیا تھا۔ میں نے وہی کیا، جو تم نے کہا تھا۔''

وہ بولا۔ ''بہت اچھا کیا۔ اس کا فون ملا کر مجھے دو۔''

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”کوئی فائدہ نہیں۔ وہ فون بند رکھتا ہے یا سیلولر ماڈیول فون سیٹ سے باہر نکال دیتا ہے۔“

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔ کہاں تک بھاگے گا، آخر ہاتھ لگ جائے گا۔“

اُس کے قدموں کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ مایوسی سے بولی۔ ”آج شہر میں گھومنے کو جی چاہ رہا تھا مگر تم نے مزہ ہی کرکرا کر دیا۔ ڈرائیور کو گاڑی دینے کی کیا تک تھی؟ وہ بس پر بھی جا سکتا تھا۔“

وہ بولا۔ ”کہو تو ٹیکسی منگوا لیتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”نہیں!“

عالمگیر بھی اُس کے مقابل گھاس پر پسر کر بیٹھ گیا۔ شانی نے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے کہا۔ ”پتہ ہے، پاپا تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔“

”ہاں! جانتا ہوں۔ گھوڑا اچھا دوڑتا ہو، کتا اچھا لڑتا ہو، مالک پیار کرتا ہے۔ لنگڑے گھوڑے اور پھدّے کُتے کو گولی مار کر نئے خرید لیتا ہے۔“ اُس کا لہجہ بظاہر عام سا تھا مگر ایک ایک لفظ میں زہر بھرا ہوا تھا۔

شانی نے جلدی سے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ تڑپ کر بولی۔ ”تم غلط کہتے ہو۔ تم انسان ہو، گھوڑا یا کتا نہیں ہو۔ پاپا بھی ایسے نہیں ہیں، وہ واقعی تم سے محبت کرتے ہیں، تم پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔“

وہ بے دلی سے مسکرایا۔ ”شانی! جب تم اُس سے اپنی اور میری شادی کی اجازت مانگو گی تب تمہیں پتہ چلے گا کہ نوکر اور ہم پلہ میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ مر جائے، زمین میں گڑ جائے گا مگر تمہیں ایسا نہیں کرنے دے گا۔“

وہ شادی کے تذکرے پر شرمائی، باپ کی بدخوئی پر تلملائی۔ عالمگیر کو تاثرات کی غیر معمولی آمیزش بھلی لگی۔ یوں لگا جیسے کڑکتی دھوپ میں بارش برسنے لگی ہو۔ جیسے چولہے پر تپتے ہوئے توے پر برف کی ڈلی رکھ دی گئی ہو۔ جیسے سمندر کے پانی پر تیرتے ہوئے تیل نے آگ پکڑ لی ہو۔ وہ اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا میری بات بُری لگی؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نفی میں سر گھما کر، خاموش رہ کر سوچنے لگی۔ ”پاپا سخت ضرور ہیں مگر ایسے بھی نہیں کہ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری کرنے کی بجائے رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ وہ میری بات مان جائیں گے۔“

پھر اچانک سوچ میں پڑ گئی۔ ”میں نے ابھی تک عالمگیر کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ یہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے؟ کیا شادی کیلئے پرپوز کر رہا ہے۔ شاید ایسا ہی ہے۔“

اُسے نظروں ہی نظروں میں جانچتی رہی پھر شرما کر نظریں چُرانے لگی۔ عاشق کے ہاتھ میں رسی کا ایک سرا آ گیا تھا۔ محبت کے ساتھ ہاتھوں پر لپیٹنے لگا۔ فرطِ شوق سے اپنے قد کے برابر تک اُترے ہوئے چاند کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”لاکھ رستے میں اُڑتی رہے، زور لگواتی رہے، ایک نہ ایک دن تو رسی اپنا دوسرا سرا میری تحویل میں دینے پر مجبور ہو جائے گی۔“

ملک فرید نے فون کریڈل پر پٹختے ہوئے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ بڑا بیٹا باپ کے قریب کھڑا تھا۔ بولا۔ ''ابا جی! چاچا کیا کہتا ہے؟''

باپ نے غصے بھری نظر بیٹے پر ڈالی۔ ایسے جیسے بیٹے نے کوئی سنگین غلطی کر لی ہو۔ پلٹ کر ٹی وی لاؤنج کے آخری سرے پر پہنچ کر کہا۔ ''وہ اِس قابل تھا کہ اُسے ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا جاتا۔ میں نے اُس کے گھر میں جا کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔''

امجد قریب آیا۔ ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے بولا۔ ''آپ باپ ہیں، ہم آپ کے بیٹے ہیں۔ اپنے بھائی کا غصہ ہم پر اُتار لیں مگر دل پر نہ لیں۔ ہم تینوں بھائیوں کو اندازہ تھا کہ چاچا جی نہیں مانیں گے۔ رئیس پڑھا لکھا اور لاہور کی بڑی سوسائٹی کا دلدادہ لڑکا ہے۔ وہ کسی طرح بھی ہمارے علاقے کی پسماندگی میں اپنے ارتقائی بیج بونے پر قائل نہیں ہوگا۔ کیا ایسا ہی ہوا ہے؟''

باپ کا غصہ اُتر گیا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر بڑے بیٹوں کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ''یہ ہوتا ہے پوچھنے کا طریقہ! وہ کہتا ہے کہ میرا بیٹا نہیں مانتا۔''

امجد جھپٹ کر سامنے آ گیا۔ ''ابا جی! یہ طریقہ تو بڑے بھائی نے ہی مجھے سکھایا ہے۔ ویسے چاچا کے انکار پر آپ کو خفا ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہیے تھا کیونکہ زرینہ بھی تو شادی پر رضامند نہیں ہے۔ چاچا نے انکار کر کے آپ کو شرمندگی سے بچا لیا ہے۔''

تینوں ہنسنے لگ گئے۔ ماں بولی۔ ''یہ سوچو کہ اَب کرنا کیا ہے؟''

امجد نے لاپروائی سے کہا۔ ''یہ سوچنے کی بات نہیں ہے۔ زری کے نصیب میں جس گھر کی راجدھانی لکھی ہے، وہ اُسی گھر میں پہنچے گی۔ ویسے بھی اَبھی بہت وقت پڑا ہے۔''

باپ نے فکر و تردد میں پڑ کر کہا۔ ''ملک زادو! ایک پہلو تشنہ ہے۔ تم نے سوچا نہیں اَب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک۔ اگر میں اپنی بہو کو بیاہ کر یہاں لے آؤں گا تو اُس کی ماں اور جوان بہن کا کیا بنے گا؟ کیا وہ تنہا رہیں گی؟''

سبھی کو جھٹکا سا لگا۔ اِس رُخ پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ ماں بولی۔ ''تو کیا اَب وہ اکیلی نہیں ہیں؟''

امجد نے کہا۔ ''سب کو یہاں لے آئیں گے۔''

ارشد نے کہا۔ ''سب کو یہاں لانے سے بہتر یہ ہے کہ بھابی کی رُخصتی کی بجائے تمہاری رُخصتی کر دی جائے۔ وہیں بیٹھ کر عدالت لگا لینا۔ کیا جاتا ہے ایسا کرنے میں؟''

سبھی نے اپنے اپنے طور پر سوچا۔ سبھی اِس پر متفق ہو گئے کہ امجد کو اپنی ساس کے گھر میں شادی کے بعد منتقل ہونا چاہیے۔ امجد اَڑ گیا۔ وہ اپنے گھر کو چھوڑنے کے خیال پر گھبرا گیا۔ قطعی لہجے میں بولا۔ ''گستاخی شمار کی جائے، ضد قرار پائے یا کچھ بھی ہو، میں اپنا گھر نہیں چھوڑوں گا۔ ساس کے گھر میں داماد، بہن کے گھر میں بھائی، دونوں کو معاشرہ کتا کہتا ہے۔ میں باپ کے دَر کا کتا بننا پسند کروں گا، کسی اور دَر کا نہیں۔''

بھائیوں اور باپ کے اصرار پر وہ روٹھ کر گھر سے نکل آیا۔ نور پور کی دیکھی بھالی گلیوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ ہر گھر سے اُس کی بچپن کی شناسائی تھی۔ ہر چہرہ اُس کا اپنا تھا۔ کئی گھروں میں گیا۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد پھر بے چینی ہونے لگتی تو اُٹھ کر باہر نکل آتا۔ ایسے میں خیال آیا کہ دنیا میں دل کے درد کو سمجھنے والا ایک ہی مسیحا ہوتا ہے۔ باقی سب وقتی اور عارضی بہلاوا ہوتے ہیں۔ کیوں نہ اپنے مہربان کے پاس جایا جائے۔

رفیق دکان والے سے موٹر سائیکل لی اور محبت کے راستے پر چل پڑا۔ ہوا سامنے سے آ رہی تھی۔ بالوں کو اُڑاتے ہوئے اُس سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے شرارت سے بولی۔ ''میں کچھ دیر پہلے تمہاری محبوبہ کے پہلو سے نکل کر آئی ہوں۔ تم مل گئے، اچھا ہوا۔ تمہیں بتلاتی ہوں کہ جس طرح تم بے چین ہو، ویسے ہی وہ بھی بے قرار ہے۔ ملاقات کر کے تم چین حاصل کرو، وہ قرار حاصل کرتی ہے۔ واپس آؤ گے تو حال پوچھوں گی۔''

وہ ہونٹ سکیڑ کر سیٹی بجانے لگا۔ تیز ہوا کے باعث اپنے ہونٹوں سے نکلتی ہوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر محسوس ہو رہا تھا جیسے روح کی ترنگ سے نکلتے ہوئے سُر ہوا میں بکھر کر اُس کے محبوب تک پہنچ رہے ہیں۔

موٹر سائیکل ڈیرے کے برآمدے میں کھڑی کر کے زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔ قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ بتول صحن میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ قریب آ کر اُس نے کہا۔ ''دوسرے لوگ دکھائی نہیں دے رہے، کہاں گئے ہیں؟''

وہ کھڑی ہو کر بولی۔ ''ایک مزارعے کی بیٹی کی منگنی ہو رہی ہے، دونوں ماں بیٹی اُن کے گھر میں پہنچی بیٹھی ہیں۔''

آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اِس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا؟''

وہ گڑبڑا اُٹھی۔ ''نن......نہیں تو......ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

وہ اُس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا تنہائی سے ڈر رہی ہو؟ یہ سوچ رہی ہو کہ ایسے میں کوئی آ گیا تو کیا سمجھے گا۔ ہے ناں؟''

وہ شرما کر، ہنس کر، دوپٹے کے پلو سے کھیلنے لگی۔ امجد چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ جہاں تھی، وہیں کھڑی رہی۔ دِل اُس کے پاس رہنے کو بے تاب تھا، لجاجت بھاگ اُٹھنے پر اُکسائے جا رہی تھی۔ کبھی دُعا کرتی کہ زرینہ اور اماں فوراً واپس پہنچ جائیں۔ کبھی دِل میں آرزو مچل جاتی کہ عمر بھر کوئی نہ آئے، دونوں کے بیچ میں ہوا تنکوں کو بھی معلق نہ کرے۔

امجد کی شرارت اور چاہت سے معمور نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے کچن کی طرف بھاگ گئی۔ وہ جان بوجھ کر چائے بنانے میں تاخیر برتتے ہوئے کن اکھیوں سے کھلے دروازے سے باہر جھانک کر اُسے دیکھ لیتی۔ دکھائی نہیں دیتا تھا تو مَن میں بے چینی بھری رہتی تھی۔ سامنے آتا تھا تو دل بے طرح دھڑکنے لگتا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ کے شگوفے پھوٹنے لگے۔ کلیوں کو کھلنے سے روکنے کیلئے لبوں پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی۔ ''ہائے امجد! تم کیا ہو؟ پاس ہوتے ہو تو دنیا جہان کی خبر نہیں رہتی۔ دور ہوتے ہو تو اپنی پہنائی ہوئی انگوٹھی کے نگینے میں سمائے رہتے ہو۔ یہ تمہاری محبت کا اعجاز ہے یا میری روح تک اُتر جانے والے کیف کا کمال ہے کہ ہر سمے جی چاہتا ہے کہ میں، میں نہ رہوں، تم ہو جاؤں۔ تم، تم نہ رہو، میں ہو جاؤں۔ ملاپ کی یہ گھڑیاں اِسی لمحے پر کیوں رُک نہیں جاتیں؟''

چائے کپ میں ڈال رہی تھی۔ کپ بھر گیا۔ ٹرے چائے سے بھرنے لگی۔ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں جگمگانے والی انگوٹھی کو دیکھنے لگی۔ ننھا سا ڈائمنڈ امجد کی آنکھ بن کر اُسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھیڑنے لگا۔ وہ بے خود ہونے لگی۔ شرماتے ہوئے سوچنے لگی۔ ''بڑے ظالم ہو امجد! خود کو اِس نگینے میں ڈھال کر غضب ڈھاتے رہتے ہو۔ جب سونے لگتی ہوں تو یہ میرے ہونٹوں سے چمٹتا ہے، میری آنکھوں پر براجمان ہوتا ہے، میرے دل کی دھڑکن سنتا ہے۔ جانتی ہوں کہ یہ بے جان پتھر نہیں، تم ہو۔ پھر بھی سینے سے لگائے رکھنے کو جی چاہتا رہتا ہے۔ اے سنگِ جان کش! کبھی تم جان کھینچنے لگتے ہو، کبھی تمہیں مجھ پر مسلط کرنے والا دھڑکنیں چُرانے لگتا ہے اور کبھی میں آپوں آپ خود سپردگی پر مائل ہو جاتی ہوں۔ کیا ایسے میں زندہ رہ پاؤں گی؟''

سوال اپنے آپ سے کیا تھا۔ جواب دینے کیلئے امجد صحن سے اُٹھ کر کچن میں چلا آیا۔ چائے سے لبریز ٹرے کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بولا۔ ''میرے ساتھ بھی ایسا ہونے لگا ہے۔ عبیداللہ سے ملنے کیلئے نکلتا ہوں اور اُس کے دروازے سے گزر کر خالد کی بیٹھک میں پہنچ جاتا ہوں۔ ماں کہتی ہے کہ بھائی کو فون کر کے کہہ دو کہ واپسی پر ترکاری لئے آئے، میں پاپا کو فون پر پیغام دیتا ہوں کہ ماں کہتی ہے جلد لوٹ آیئے۔''

وہ چونک گئی۔ اپنی حماقت پر شرمندگی ہوئی۔ دل سمجھانے لگا۔ ''فکر نہ کرو۔ جو کام تم میری آسودگی کیلئے نہیں کر سکتی تھیں، میں نے خود کر لیا ہے۔ چاہنے والے کو اپنے جنوں سے آگاہ کر دیا ہے۔''

اُس پر جھک کر امجد نے ٹرے میں رکھا ہوا کپ اُٹھایا۔ اُسے شیلف پر رکھے ہوئے نیپکن پر رگڑ کر پیندا صاف کیا اور لبوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''اباجی چاہتے ہیں کہ میں شادی کے بعد گھر داماد بن کر یہاں آ جاؤں۔ میں ایسا نہیں چاہتا۔ تم سے پوچھا جائے تو میرے کاز کی حمایت کر کے میرا دل رکھ لینا۔''

وہ چوکی پر بیٹھی ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ چولھے میں جلتی آگ کی تپش چہرے پر ثبت ہو چلی تھی۔ ہولے سے بولی۔ ''میں وہاں جاؤں گی جہاں آپ لے جائیں گے۔''

وہ خیرہ نگاہوں سے قدموں میں بیٹھی بتول کے اَدھ ننگے کندھے کو دیکھ رہا تھا۔ ایک لٹ بکھر کر اُسے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کے ہیرے کو دیکھ رہی تھی۔ امجد نے دیکھی جانے والی دونوں چیزوں کا موازنہ کیا۔ بولا۔ ''تم پتھر کو دیکھ رہی ہو، پتھر میں دھڑکن نہیں ہوتی، گداز نہیں ہوتا۔ میں پُر دھڑکن اور پُر گداز

قدرت کے تراشیدہ ہیرے کو دیکھ رہا ہوں۔ تم بے قابو ہو کر پتھر کو چوم نہیں سکتی ہو، میں چوم سکتا ہوں۔"

اُس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اُس نے جھک کر کندھے اور گردن کی درمیانی دل آویز پستی کو چوم لیا۔ وہ۔ "ہائے اللہ" کہہ کر مزید جھک گئی۔ وہ پلٹ کر کچن کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ خمار آلود آواز میں بولا۔ "چائے کا پہلا گھونٹ بہت گرم لگا۔ جھکنے کے بعد سیدھا ہو کر دوسرا گھونٹ پیا تو یوں لگا جیسے چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تو وہ کپ تھامے صحن میں آ بیٹھا۔ اُسے خبر نہیں تھی کہ وہ گھٹنوں میں سر ڈالے پتھر کو دیوانہ وار چومے جا رہی تھی اور دل ہی دل میں کہتی جا رہی تھی۔ "تم کیا ہو کہ پتھر میں دھڑکن نہیں ہوتی، بے گداز ہوتا ہے۔ اِسے بے قابو ہو کر چوما نہیں جا سکتا۔ انجان ہو۔ تم اپنے ہیرے کو ایک بار چوم کر شانت ہو جاتے ہو، میں دن میں ہزاروں بار اِس پتھر کو چومنے کے باوجود پُرسکون نہیں ہو پاتی۔"

وہ کچن میں ہی تھی کہ اماں اور زری آن پہنچیں۔ اماں نے حسبِ عادت بلائیں لیں زری نے چہک کر کہا۔ "ہائے باجی! مجھے فون کر دیا ہوتا تو ہمیں کچھ دیر ہو ہی جاتی......"

وہ شرما کر مسکرانے لگی۔

امجد نے زرینہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "مبارک ہو زری! انکل ظہور تمہیں دیکھنے کیلئے اب نہیں آ رہے۔ تمہاری دُعا قبول ہو گئی ہے۔"

چند ساعتوں تک اُسے امجد کی کہی ہوئی بات کی سمجھ نہ آئی۔ جب سمجھی تو منہ بنا کر بولی "اگر وہ آ بھی جاتے تو بھی میری دُعا قبول ہو جانا تھی۔ میں شاید زندگی بھر اُن لوگوں سے نباہ نہ کر پاتی۔"

❁❁❁

عالمگیر اپنے کمرے میں لیٹا کافی دیر سے سردار سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نیٹ ورک بزی ہونے کی وجہ سے ناکام ہو رہا تھا۔ اچانک کال مل گئی۔ وہ لہجہ بدل کر بولا۔ "ہاں سردار فضل خان! تحفے وصول کرنے کے بعد کیا محسوس کر رہے ہو؟"

دوسری طرف سے کافی دیر تک آواز نہیں آئی تو اُس نے اپنی بات دہرائی۔ سردار تھکے تھکے انداز میں بولا۔ "ہاں ہاں سن رہا ہوں۔ یہ تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے کبھی تم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یا تمہارے بڑوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔"

وہ ہنسا۔ "کیسی بچوں جیسی باتیں کرنے لگے ہو سردار! میں تھرڈ مین ہوں، تمہارا دشمن نہیں یا انڈر ورلڈ کا کوئی بڑا نہیں ہوں۔ میرا کام صرف رابطہ کرانا ہے۔ اِدھر کی بات اُدھر، اُدھر کا پیغام اِدھر پہنچاتا ہوں اور بس...... کس نے کیا کیا ہے؟ میں کچھ نہیں جانتا۔"

سردار کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس نے پہلے وار میں ہی گردن جھکا لینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ بولا۔ "ٹھیک ہے۔ کیا اِس وقت دوسری پارٹی کا پیغام مجھ تک پہنچانے کیلئے فون کر رہے ہو؟"

"تم ٹھیک سمجھے ہو۔ سیٹھ سبحانی چاہتا ہے کہ تم سیاست کے ریس کورس میں دوڑنے کے لائق نہیں رہے ہو، ریٹائرمنٹ لے لو۔ تمہارے اسٹینڈ پر وہ کسی اور کو کھڑا کرنا چاہتا ہے۔"

"ہائیں...... یہ کیسے ممکن ہے؟ بھلا کوئی سیاستدان بھی ریٹائرمنٹ لیتا ہے؟" سردار فضل کا دل بری طرح دھڑک اُٹھا۔

"کوئی ریٹائرمنٹ لیتا ہے یا نہیں، تمہیں لینا پڑے گی۔ یہ سیٹھ کا فیصلہ ہے۔ اگر تمہیں اِس فیصلے سے اختلاف ہے تو کھل کر بات کرو۔ اِس صورت میں تمہیں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، یہ ذہن میں ضرور رکھنا۔"

سردار کشمکش میں پڑ گیا۔ متذبذب لہجے میں بولا۔ "میں فوری طور پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ مجھے کچھ وقت چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہیں کل تک سوچنے کا وقت دیتا ہوں۔ ہاں یا نہ۔ جو جی میں آئے۔ ہاں کرنے کی صورت میں تمہیں فوری طور پر اپنی نشست سے استعفیٰ دینا پڑے گا۔ نہ کرنے کی صورت میں تمہیں عدالت میں گھسیٹ لیا جائے گا۔ اوکے! پھر ملیں گے۔"

عالمگیر نے فون بند کر کے سوچنے لگا۔ "کیا سردار مستعفی ہو جائے گا؟"

اپنی سوچ پر ہنسی آ گئی۔ سردار کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بھیجی گئی فائیلوں میں ایک فائل ایسی تھی جس پر ملک کی ہر عدالت اُسے سزائے موت سے کم سزا نہیں دے سکتی تھی۔ اُس کے جرائم کی فہرست بہت طویل تھی۔ ثبوت ایسے تھے جنہیں کسی فورم پر رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے قالین پر یوں پاؤں جما کر سختی سے رگڑا جیسے پاؤں کے نیچے سردار کی دُم آ گئی ہو جسے رگڑ کر پیس دینا اُس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش رہی تھی۔

جب بھی وہ تھرڈ مین بن کر قہر کے تنور میں سردار کے طمطراق کو ڈال کر آگ دہکاتا تھا، سرور اور کیف کی عجیب وجدانی کیفیت اُس پر طاری ہو جایا کرتی تھی۔ وہ چشم تصور میں اُسے بھیگی بلی بنا دیکھ کر لطف لینے لگتا تھا۔

رات سمٹ کر کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ جانے کیوں غرور اور تمکنت سے بھری چھاتی میں دھڑکتا ہوا دل بیٹھنے لگا ہو۔ وہ الماری تک گیا۔ ایک موم بتی نکال کر لائٹر سے روشن کرنے لگا۔ روشن ہونے پر موم کے چند پگھلے ہوئے قطرے میز پر ٹپکائے، اُن پر موم بتی کو ٹکایا اور خود بیڈ پر آ کر دراز ہو گیا۔ لو پر نظریں جمائے ہوئے بڑبڑایا۔ ”ماں! بہت دن ہوئے، تم نے میرا پتہ نہیں لیا۔ چاہے مجھ سے جھگڑو، برا بھلا کہو، مگر یوں زیادہ دیر کیلئے تنہا چھوڑا کرو۔ دیکھو! میں کتنا تنہا ہوں، دیکھو! میں کتنا اداس ہوں، دیکھو! شیر جیسی طاقت رکھنے والے کے اندر کتنی کمزوریاں بھری ہوئی ہیں۔ چلی آؤ اماں!“

پہلے ماں کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا، آج ملنے کی آرزو کر رہا تھا۔ ماتا کا دل پسیج گیا۔ لو میں سفید آنچل لہرایا تو مچل کر بولا۔ ”ہائے اماں! تم کتنی اچھی ہو۔“

ماں کے چہرے کے جھریوں بھرے خطوط واضح ہونے لگے۔ ہونٹ دکھائی دیے، پھر ہونٹوں سے نکلنے والی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ ”میں سوہنے رب سے تیری سلامتی کی دعا مانگتی ہوں تو تیرے اندر چھپے ہوئے شیطان کی عمر دراز ہو جاتی ہے۔ شیطان کو بددعا دیتی ہوں تو میری ماتا کانپنے لگتی ہے۔ تم نے علم دین سے عالمگیر بن کر مجھے کس عذاب میں ڈال دیا ہے۔ جیسے تم میرے بیٹے ہو، ایسے ہی بتول اور شاہانہ بھی میری بیٹیاں ہیں۔ دنیا کی تمام مظلوم لڑکیاں میرے جیسی ماؤں کے بطن سے نکلی ہیں۔ تم اُن کا دل کیوں دکھاتے ہو؟ تم نے تو بارہا مجھ سے کہا تھا کہ تم صرف سردار فضل کو عذابِ مسلسل میں رکھنا چاہتے ہو، پھر یہ سب کچھ کیا کرتے پھر رہے ہو۔“

وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ ”اماں! بس کر۔ ایک دو ماہ کی بات ہے۔ پھر دیکھنا، عالمگیر پھر سے تمہارا علم دین بن جائے گا۔“

”تب تک تم جو کچھ کر چکے ہو گے، اُس کا حساب کون دے گا؟“

”جیسے میں حساب لے رہا ہوں، ایسے ہی کوئی اور میرا حساب لینے کیلئے کسی نہ کسی دن پہنچ جائے گا۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”تم اس سلسلے کو ختم کیوں نہیں کر دیتے؟“

”اماں! صرف چند دن اور......“

ماں نے رُخ پھیر لیا۔ ننھے سے شعلے میں ماں کا دوپٹے میں ڈھکا ہوا سر عقب سے دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”ماں! یوں منہ پھیر کر نہ جاؤ۔ میں تمہاری ہر بات مان لوں گا۔ یقین مانو! میں برا نہیں ہوں۔ میں بے ضمیر نہیں ہوں۔ میں تمہارا خون ہوں، تمہارا دودھ پی کر بڑھا ہوں، تمہاری دعائیں لے کر جوان ہوا ہوں۔ تمہارے پڑھائے ہوئے تمام سبق مجھے آج بھی اچھی طرح ازبر ہیں۔ خدا کیلئے اپنے خون اور دودھ پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے چند دن کی مہلت دے دے۔“

ماں کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ آنسوؤں سے رُندھی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”تم وہی کچھ کر رہے ہو جو کل تک سردار فضل خان کرتا رہا ہے۔ تم میں اور اُس میں کیا فرق ہے؟ اُس نے تمہارے باپ کو مارا، تم نے اُس کی بیٹی کو جیتے جی مار دیا۔ اُس نے تمہاری ماں کو در در کی ٹھوکروں کے سپرد کیا، تم اُسے در بدر کرنے والے ہو۔ نہ اُس نے عورت کے تقدس کی عزت کی، نہ تم کر رہے ہو۔ میری نظروں میں تم دونوں کی شکلیں ایک سی ہیں، قد ایک سے ہیں، رُوپ ایک سا ہے۔“

ماں ہاتھ لہرا کر اوجھل ہو گئی۔ اُس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا کہ وہ مسلسل روئے جا رہا ہے۔ آنسو پونچھ کر سوچنے لگا۔ ”شاید ماں ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے غلط کیا ہے مگر اب کیا کر سکتا ہوں۔ پیچھے ہٹتا ہوں تو بن موت کے مارا جاؤں گا۔ آگے بڑھتا ہوں تو ماں ناراض ہوتی ہے، ماں کا خدا ناراض ہوتا ہے۔“

بند کمرے میں ہوا کا جھونکا داخل نہیں ہو سکتا۔ موم بتی کے بجھنے کا کوئی جواز نہیں تھا مگر وہ بلک کر بجھ گئی۔ وہ حیران ہوا۔ حیرانی اپنی ہیئت بدلنے لگی۔ میز پر پڑی موم بتی کے بجھنے پر چشم تصور میں ایک سکرین روشن ہو گئی۔ وہ گردن تلے بازو رکھ کر ہونٹ کاٹنے لگا۔ اضطراب بڑھتا جا رہا تھا جوں جوں سکرین پر دکھائی دینے والا منظر ایک واضح شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ایک جواں سال گہری اور لمبی مونچھوں والے شخص کا چہرہ دھند سے نکل آیا۔ سرخ و سپید رنگت، اونچا لانبا قد، علاقائی روایتی لباس...... آنکھوں میں ٹوٹتی آس کی کرچیاں...... ہونٹوں پر تشنگی آمیز پپڑیاں......

وہ کوئی اور نہیں، اُس کا باپ محمد خان تھا۔

باپ کی یہی تصویر اُس کی نظروں میں ثبت رہتی تھی۔ شاید آخری بار دیکھا تھا۔ شاید اُس وقت کا دیکھا یاد رہا تھا جب وہ آخری مرتبہ اپنے بیٹے کو دیوانہ وار چوم کر زمین کی طرف گیا تھا۔ شاید اُس وقت کا دیکھا یادداشت میں نقش ہو گیا تھا جب آخری مرتبہ سکول میں اُسے لینے کیلئے پہنچا تھا۔ باپ کے خیال نے اُسے ماضی کی پر آشوب گہرائیوں میں گھسیٹ لیا۔ جس یاد کو کھرچنا چاہتا تھا، وہ پوری سنگینی کے ساتھ ابھر کر سامنے آ گئی تھی۔

برسوں پرانے واقعات کو اپنے شعور میں ایک خاص ترتیب دینے لگا۔ کہیں کوئی غلطی نہ رہ گئی ہو، کوئی سقم باقی نہ ہو، کہیں کوئی فائل چُرائی نہ گئی ہو۔ کچھ باتیں اُسے یاد تھیں، کچھ ماں نے اَن گنت مرتبہ بتلا کر نقش کر دی تھیں۔ وہ دونوں کے امتزاج سے اپنا ماضی کشید کرنے لگا۔

محمد خان، علم دین یا عالمگیر کا باپ، اپنی پسند کی شادی کرنے کے بعد بھری دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔ اُس کے باپ نے اتنی بڑی جسارت پر اُسے اور اُس کی بیوی کو ایک مربع زمین دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ بہن کوئی تھی نہیں۔ چھوٹا بھائی، فضل خان، باپ کے ناجائز لاڈ پیار میں حد درجہ شدت پسند اور خود غرض بن چکا تھا۔ اُس نے نچلی ذات سے تعلق رکھنے والی بھابی کو قبول نہیں کیا تھا۔ بھائی کو اتنا بڑا قدم اُٹھانے پر ایک آنکھ دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ باپ کی شہہ پا کر اُس نے کچھ زیادہ ہی پر پُرزے نکال لئے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد اُسے بستی کی نمبرداری مل گئی اور باپ کی کمزور روک ٹوک بھی ختم ہو گئی تو اُس کی شدت پسندی اور مغرور طبیعت میں استزاد پیدا ہو گیا۔ وہ فضل خان سے سردار فضل خان بن گیا۔

محمد خان اور اُس کی بیوی رضیہ عرف رَجو اپنے بیٹے علم دین کے ساتھ مطمئن اور پرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ پچیس ایکڑ زرعی اراضی کے عین وسط میں چھوٹا سا گھر واقع تھا جہاں وہ زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نہر کے عین کنارے پر واقع محمد خان کی زرعی اراضی نمبردار فضل خان کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتی تھی۔ محمد خان کی زمین سے متصلہ تیس ایکڑ رقبہ سردار فضل کی ملکیت تھے۔ اُس نے بارہا خریدنے کی کوشش کی مگر محمد خان اپنی آبائی زمین کو بیچنے پر تیار نہیں تھا۔ اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے کاشتکاری کے علاوہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا علم دین پڑھ لکھ کر بڑا سرکاری افسر بنے۔ رَجو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ے اکثر کہا کرتا تھا۔ ”رَجو! دیکھنا ایک دن میرا بیٹا بہت بڑا افسر بن کر بستی میں آئے گا۔ ہر
وئی حیرت بھری نظروں سے اُسے دیکھے گا، یوں جیسے رمضان کے چاند کو نظریں اُٹھا کر
یکھا جاتا ہے۔“

رَجو کی آنکھوں میں تفاخر اور احساسِ مسرت بھر جاتا۔ آسمان پر ٹھہر کر چمکنے والا اُسی کے
ے نکلا تھا، چمک کو دیکھنے والا سَر کا سائیں تھا۔

سردار فضل اور محمد خان کے دِلوں میں کدورتیں اور نفرتیں بڑھتی گئیں۔ ایسے میں بہانے
وں آپ بنتے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ سردار فضل کی پانی کی باری میں مشترکہ کھال محمد خان
ز زمین کی طرف ٹوٹ گیا۔ شگاف پڑ گیا۔ پانی ایک مرتبہ گزر جائے تو پتہ نہیں چلتا کہ پانی
تھا یا توڑا گیا تھا۔ سردار کے نوکر نے فوری طور پر سردار کو اطلاع دی۔ وہ بھاگا چلا آیا۔
اُسے شک گزرا کہ محمد خان نے جان بوجھ کر کھال توڑا ہو گا۔ وہ محمد خان کے ڈیرے پر
۔ اُسے بلا کر کہنے لگا۔ ”تم نے آج میرا پانی توڑ کر دو گھنٹے ضائع کر دیے ہیں۔ بتا! ایسا
وں کیا تم نے؟“

محمد خان نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ”زبان سنبھال کر بات کر فضل خان! میں نے کبھی
ا گھٹیا حرکت نہیں کی اور نہ ہی میرے رقبے کو چوری کے پانی کی ضرورت ہے۔ تمہارے
روں کی غفلت سے کھال ٹوٹ گیا ہو گا۔ میری طرف والا بَنا کمزور ہے۔ پچھلی باری پر دو
ا مرتبہ خود بخود ٹوٹ گیا تھا۔ جنگلی چوہوں نے کھال کے بنے میں بل کھود رکھے ہیں۔“
سردار کی موٹی عقل میں یہ توجیہہ نہ اُتری۔ دھمکیاں دینے پر اُتر آیا۔ محمد خان بات کو
انے کے حق میں نہیں تھا۔ خاموشی سے گھر چلا گیا۔ اُس نے اپنے تئیں یہ سوچ لیا کہ
ختم ہو گئی اور فضل خان بکتا جھکتا اپنے گھر چلا جائے گا مگر یہ اُس کی خام خیالی تھی۔
اگلے دِن شام کو وہ دو چار بندوں کے ساتھ اُس کے ڈیرے پر آ گیا۔ چارپائی پر بیٹھ کر
”محمد خان! میں تمہارا رقبہ خریدنا چاہتا ہوں۔ مُل جگ چار بندے طے کر دیں گے۔“
”مگر میں تو اِسے بیچنا ہی نہیں چاہتا۔ میرے پاس پچیس ایکڑ ہیں، تمہارے پاس تیس
ربعاں ہیں جبکہ دو مربعے رقبہ نور پور میں ہے۔ اپنی ہوس پر قابو پاؤ ورنہ لالچ تمہیں کہیں
نے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔“
”میں تمہاری نصیحتیں سننے نہیں، رقبہ خریدنے کیلئے آیا ہوں۔ اگر بیچ دو تو تمہارے حق

میں بھلا ہوگا۔ اَڑ جاؤ گے تو اپنا اور اپنے خاندان کا نقصان کرو گے۔ زمین پر لڑائیاں بڑی خونیں ہوتی ہیں۔"

محمد خان نے آستین چڑھاتے ہوئے تیوریاں بھی چڑھالیں۔ دبنگ لہجے میں بولا۔ "فضل خان! مجھے دھمکیاں مت دو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ باپ اور بھائی سے دست وگریباں ہوؤں اِس لئے میں نے ایک مربع لے کر دل کو مطمئن کرلیا۔ اَپنا حق چھوڑ کر تم لوگوں سے دور ہو بیٹھا۔ تم سمجھ رہے ہو کہ میں بُزدل ہوں، کمزور ہوں۔ یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میں نے کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں جن کے ٹوٹنے کا مجھے خدشہ ہو۔ جاؤ! جو کر سکتے ہو، کرلو۔ زمین ماں کے جیسی ہوتی ہے۔ میری ماں بکاؤ نہیں ہے۔"

سردار اُسے کافی دیر تک بیٹھا سمجھاتا رہا۔ بیٹھک کے دروازے کی جھریوں سے رَجو آنکھ لگا کر دیکھتی رہی۔ اُس کے جانے پر بیٹھک میں گھس آئی۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "خان! تم ہی ضد چھوڑ دو۔ ہم یہ رقبہ بیچ کر کسی اور اچھے سے علاقے میں زمین خرید لیتے ہیں۔ یہ زمین بھی فصل دیتی ہے۔ وہ زمین بھی فصل دینے لگے گی۔"

"ہونہہ!" محمد خان نے غصہ بھری نگاہ اُس پر ڈالی۔ "جو اپنے رقبے کی حفاظت نہ کر سکے، وہ کہیں بھی واہی کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ میں اِس کن ٹٹے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ زبانی کلامی دھمکیاں دیتا رہتا ہے، ہاتھ اُٹھانے کی جرأت نہیں رکھتا۔"

وہ رونے لگ گئی۔ "خان! ایک ہی پتر ہے ہمارا۔ اگر تمہیں کچھ ہوگیا یا اُسے کچھ ہوگیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ مجھے تو بھری دنیا میں کہیں سے بھی دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوگی۔"

وہ اُسے بانہہ سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ سمجھانے لگا کہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سُن کر راستہ بدل لینے والا احمق اور ڈرپوک گنا جاتا ہے۔ رَجو کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ وہ اِس بات کو نہیں سمجھ رہی تھی کہ پانچ سات سالوں میں سردار کی دھمکیوں سے کچھ نہیں بگڑا تو آگے بھی کچھ نہیں ہوگا۔ عورت ذات تھی۔ پیاروں کے تحفظ کیلئے رَب کے آگے جھولی پھیلائے بیٹھی رہتی تھی۔ مزاروں پر چادریں چڑھاتی رہتی تھی۔ ہر چادر پر دل کو اطمینان ہوجاتا تھا کہ جیسے سائیں کے مزار پر چادر تن گئی، ایسے ہی بیٹے اور شوہر کے بدن کو زمانے کی سرد وگرم سے محفوظ رکھنے کیلئے مضبوط چادر تن چکی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محمد خان اُس کی دھمکیوں سے قطعاً نہیں گھبرایا تھا۔ بچپن سے اُس کی گرم طبیعت سے بخوبی واقف چلا آرہا تھا۔ خون کا رشتہ سمجھتا رہتا تھا۔ "جو بھی ہو، جتنا برا اور ظالم فطرت بھی ہو، تم پر ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا۔"

یہ خوش فہمی چند دن قائم رہی۔ ٹوٹی تو سب کچھ بکھر گیا۔ ایک رات گیارہ کے اَریب قریب سردار پانچ چھ غنڈوں کے ہمراہ اُس پر حملہ آور ہوگیا۔ دونوں میاں بیوی صحن میں چارپائیاں بچھائے سو رہے تھے۔ علم دین اپنے باپ کی بغل میں گھسا ننھے ننھے خراٹے لے رہا تھا۔ محمد خان اور رَجو ہڑبڑا کر اُٹھے۔ آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگے۔ چند ساعتوں تک تو دونوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ کیا ہوا ہے؟ جب پتہ چلا تو خون خشک ہوگیا۔ سردار فضل اپنے گرگوں کے ہمراہ اُن کے سر پر سوار ہوچکا تھا۔

محمد خان نے خود پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے فضل خان؟"

فضل خان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پانچ چھ سالوں سے سمجھانے کی کوشش کرتا چلا آرہا ہوں مگر تم جیسے بے وقوف سمجھتے نہیں، بھگتتے ہیں۔ آج بھگتو۔"

حملہ آوروں نے دونوں کو لاتوں ٹھڈوں پر رکھ لیا۔ محمد خان نے چیخ وپکار مچائی مگر کوئی مدد نہ پہنچی۔ چونکہ گھر بستی سے دو تین میل کے فاصلے پر واقع تھا اور قریب ترین ڈیرہ بھی دو تین فرلانگ دور تھا، اِس لئے کوئی بھی اُن کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ علم دین شور سُن کر جاگا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اندھیرے میں متحرک ہیولوں کو دیکھنے لگا۔ ننھے سے دماغ میں سوائے چیخنے چلانے کے کوئی خیال نہیں آیا۔

محمد خان اور رَجو اَدھ موئے ہوکر صحن کے وسط میں گر پڑے۔ رَجو دہائیاں دیتے ہوئے چلا رہی تھی۔ "کمینو! میرے خان کو کچھ نہ کہو۔ ہم یہ زمین تمہیں بیچ دیں گے۔ خدا کے واسطے ہم پر ظلم مت کرو۔"

ظلم منت سماجت سے ختم نہیں ہوتا۔ ظالم کا ہاتھ کاٹنا پڑتا ہے۔ وہاں اتنی سکت کوئی نہیں رکھتا تھا۔ سردار فضل خان کی فرعونیت انگڑائیاں لے کر جاگ اُٹھی۔ وہ اپنے گرگوں سے مخاطب ہوکر بولا۔ "دونوں کو باندھ دو۔"

اُس کا اشارہ رَجو اور علم دین کی طرف تھا۔ چند ہی منٹوں میں شیطانی بساط بچھ گئی۔ سردار کے غنڈوں نے ایک سلاخوں والی کھڑکی سے علم دین کو باندھ دیا۔ دوسری کھڑکی میں

رَجو کو باندھ دیا۔ دونوں کسی طرح بھی اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکتے تھے۔ پھر مچلتے ہوئے رُ خان کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ بھاگ کر بیٹے اور بیوی کی طرف جانے لگا، جا نہ سکا۔ سبھی جانوروں کی طرح اُس پر پل پڑے۔ مار مار کر بھُرکس نکال دیا۔

سردار کے اِشارے پر ایک آدمی گاڑی سے تیل کا کین اُٹھا لایا۔ پورے گھر میں چھڑکنے لگا۔ محمد خان پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی سردار کو، کبھی تیل چھڑکنے والے سلطے ماچھی کو دیکھنے لگا۔ عمر میں بڑا ہونے کے باوجود سردار کے پیروں میں گر گیا۔ عمر بھر کی محنت سے بنی ہوئی جنت میں جہنم کے شعلے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ آئی کو ٹالنے کیلئے جھک گیا۔

تیل چھڑکا جا چکا تھا۔ سردار نے محمد خان کو نفرت سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا دنیا میں کوئی نہیں۔ جو ہیں، وہ آج ہیں، کل نہیں ہوں گے۔ تم پر یہی احسان کرسکتا ہوں کہ تمہیں جان بچانے کا ایک موقع دے دوں۔“

یوں لگتا تھا جیسے محمد خان کا گٹھا ہوا بدن بے جان ہو چکا تھا۔ وہ زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔ سردار نے اپنے کارندے کے ہاتھ میں تھاما ہوا ریوالور لیا۔ چیمبر کھول کر گولیاں نکالتے ہوئے بولا۔ ”اب اِس میں صرف دو گولیاں ہیں۔ اگر تم اپنے ہاتھ سے بیوی اور بچے کو گولی مار دو تو تمہاری جان بخشی کی جا سکتی ہے، ورنہ نہیں۔ یہ لو! پکڑو ریوالور اور شروع ہو جاؤ۔ چاہو تو اپنے بیٹے اور بیوی کے سینے میں اُتار دو۔ چاہو تو اپنی کھوپڑی میں اُتار لو۔“

یہ کہہ کر سردار برآمدے کے ستون کے پیچھے ہو گیا۔ کارندوں نے بندوقوں کا رُخ بندھے ہوؤں کی طرف کر دیا۔ سردار کڑک کر بولا۔ ”محمد خاناں! اُٹھا لے ریوالور...... ورنہ میں پانچ تک گن کر دونوں کو گولی مار دوں گا۔ پھر تمہاری باری آ جائے گی۔“

چند لمحے توقف کے بعد اونچی آواز میں بولا ”ایک......“

محمد خان نے سر اُٹھایا۔ ریوالور ہاتھ کے قریب زمین پر پڑا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ اکیلا ہوتا تو ان سے ٹکرا جاتا مگر بیٹا اور بیوی اُس کی کمزوری بن گئے تھے۔ اُس نے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”دو......“ سردار نے خون آشام لہجے میں دوسری تنبیہہ کی۔

محمد خان نے ریوالور اُٹھا لیا۔ کھڑا ہو کر بولا۔ ”اگر میں دونوں کو گولی مارنے کی بجائے خود کو مار لوں تو......“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”تو اُن کی جان بچ جائے گی۔“ سردار نے کہا۔ ”اب باتیں نہ بنا۔ جلدی کر۔ تین......“

محمد خان نے اردگرد دیکھا۔ بیوی اور بچے کو دیکھا۔ دِل بیٹھ گیا۔ جانتا تھا کہ سردار کمینگی کی اُس سطح پر اُتر چکا ہے جہاں سے واپسی کی کوئی راہ نہیں نکلتی۔ وہ تینوں کو مارنے کیلئے آیا تھا۔ تینوں کو مار کر ہی جائے گا۔ اُسے بخوبی علم تھا کہ تین بندوں پر مشتمل پورے خاندان کے موت کے منہ میں چلے جانے کے بعد وہ اِس رقبے کا بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ بولا۔ ”ظالما! میں جانتا ہوں کہ جو بھی ہو، تم ہم تینوں کو مارنے کیلئے ہاتھ اُٹھا چکے ہو۔ میرے مرنے کے بعد تم اِن دونوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑو گے۔ میں پھر بھی مرنا پسند کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ بیوی اور بیٹے کو مرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ تم بھی یہ سُن لو۔ یہ قتل تم پر قیامت ڈھا دیں گے۔“

سردار ہیجانی انداز میں ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے بے قابو ہو گیا۔ پھر بولا ”چار......“

محمد خان نے اپنی کنپٹی پر ریوالور کی نال جمائی۔ بیوی کو دیکھا۔ وہ فرطِ غم سے بے ہوش ہو کر کڑکی میں جھول رہی تھی۔ بیٹے کو دیکھا جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ بلند آواز میں کلمہ پڑھا اور لبلبی پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی وہ لہرا گیا۔ چند پل کھڑا ڈگمگاتا رہا، پھر ایک طرف کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر کر تڑپنے لگا۔

سردار نے اُسے گھسیٹ کر کمرے کے اندر پھینک دیا۔ وہ ابھی تک تڑپ رہا تھا۔ زندگی کی کوئی رمق باقی تھی جو چند منٹوں بعد ختم ہو گئی۔ سردار نے اپنے ہاتھوں سے اُس کی نعش پر تیل چھڑکا۔ کڑکی میں بندھے ہوؤں پر تیل چھڑکا۔ حویلی کے بڑے دروازے تک تیل کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے ساتھیوں سمیت باہر نکل گیا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر سردار نے چند لمحے سوچا پھر جیب سے ماچس نکال کر دیا سلائی جلاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”چلو گاڑی میں بیٹھو۔ میں اِس گھر کو جہنم بنا کر آتا ہوں۔“

دیا سلائی سے دروازے نے آگ پکڑ لی تھی۔

علم دین چلائے جا رہا تھا۔ چیخ چیخ کر ماں کو بلا رہا تھا۔ ہاتھ مضبوطی سے بندھے ہونے کی وجہ سے مجبور تھا۔ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے آگ کی لپٹیں کمروں کی طرف جھپٹ رہی تھیں۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ ایسے میں خدا کی مدد آن پہنچی۔ تڑپتے مچلتے ہوئے اُس کا ایک ہاتھ رسی سے نکل آیا۔ اُس نے پھرتی سے دوسرا ہاتھ چھڑایا۔ کمر کے گرد

لپٹی ہوئی رسی سے چھٹکارا پایا۔ آگ کے شعلوں پر نظریں جمائے ہوئے پیروں کو رسی کے الجھاوؤں سے آزاد کرا کر ماں کی طرف بھاگا۔ قریب پہنچ کر توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ پیروں پر گر گیا۔ بیٹا دیوانہ وار آ کر پیروں میں گرا تھا۔ ماتا چونک کر جاگ گئی۔ آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھنے لگی۔ آگ پر نظر پڑی تو چیخ پڑی۔ ''علم دینے! اُٹھ جلدی سے۔ مجھے کھول دے۔''

بیٹا جلدی سے اُٹھا۔ رسی کھولنے لگا۔ گرہ ہاتھ نہ آئی۔ بے بسی سے بولا۔ ''اماں! گرہ نہیں کھل رہی۔''

ماں چیخی۔ ''وہ جائے نماز پر چھری پڑی ہوئی ہے۔ بھاگ کر جا اور اُسے اُٹھا لا۔''

بیٹا چھری اُٹھا لایا۔ ماں بتلاتی گئی۔ بیٹا رسیاں کاٹتا گیا۔ جب برآمدے میں لٹکی ہوئی چک نے آگ پکڑ لی، وہ اپنے بیٹے کو بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے برآمدے سے باہر نکل گئی۔ دونوں بُری طرح کھانس رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پھیپھڑوں میں ہوا کی جگہ دھواں بھر گیا ہو۔ رَجو کھلے صحن میں پہنچ کر سانس لینے کیلئے رُکی۔ بیٹے سے پوچھا۔ ''تمہارا ابا کہاں ہے؟''

آگ نے باپ بھلا دیا تھا۔ یاد آنے پر رونے لگا۔ روتے روتے بتلانے لگا۔ ''چاچے نے ابا کو پستول دیا اور کہا کہ ہم دونوں کو گولی مار دے۔ ابا نے ہمیں گولی نہیں ماری، اپنے یہاں رکھ کر ٹھاں کر دی۔'' وہ روتے ہوئے انگلی سے کنپٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ابا لم لیٹ ہو گیا۔ چاچے نے ابا کو ٹانگوں سے پکڑا اور گھسیٹ کر کمرے میں پھینک دیا۔''

رَجو نے دیوانہ وار کمرے کی طرف دیکھا۔ شعلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تو ڈھے سی گئی۔ دل کو گھونسا لگا، سر کا تاج گر گیا تھا۔ قدم گھسیٹتے ہوئے برآمدے تک آئی۔ آگ کی تپش آگے نہیں بڑھنے دے رہی تھی۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا تھا۔ کھانستی ہوئی پلٹ آئی۔ بیٹے کو سینے سے لگا کر بھینچ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ ایسے میں مٹی کے تیل کی بُو نتھنوں میں گھس گئی۔ پتہ چلا کہ دونوں کے کپڑے تیل سے تر ہو چکے ہیں۔

بیٹے کو دیوار پر چڑھا کر بولی۔ ''دوسری طرف کود جاؤ۔''

وہ کود گیا۔ وہ بھی دیوار کود کر باہر آ گئی۔ عقبی دیوار سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھال واقع تھا جس پر بے تحاشا گھاس اُگی ہوئی تھی۔ بیٹے کو لے کر کھال میں چھپ گئی۔ سرگوشیوں میں بیٹے سے اُس کے باپ کے بارے میں تفصیل پوچھنے لگی۔ وہ بتلانے لگا۔ دل سے ہوک اُٹھی۔ ''ہائے میرا خان! تُو اپنے بھائی کے ہاتھوں کس بے بسی سے مرا ہوگا۔ تم نے اُس ظالم کی بات مان لی ہوتی، اپنے ہاتھوں سے ہمیں گولی مار دیتے تو کتنا اچھا تھا۔''

اُس کا محبوب اُس کے بیٹے اور اُس کے تڑپتے ہوئے وجود کو دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا، مر گیا۔ وہ رونے لگی۔ روتے روتے بڑبڑانے لگی۔ ''مجھے اور میرے علم دین کو روتے ہوئے دیکھ نہیں سکتا تھا، مرتے ہوئے کیسے دیکھ لیتا۔ ظالمو! تم سے اللہ میرے خان کا بدلہ لے اور تمہیں بوند بوند سے ترسا کر مارے اور تمہیں میرے خان کی طرح قبر بھی نصیب نہ ہو۔''

روتے روتے آنکھیں خشک ہو گئیں۔ محمد خان کی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ عموماً کہا کرتا تھا۔ ''لگتا ہے خدا نے میری زندگی مختصر رکھی ہے۔ اگر میں مر جاؤں تو رَجو! علم دینے کو رَج کے علم کا شربت پلانا۔ اِتنا کہ اِس کے وجود سے زیادہ ہو کر باہر چھلکنے لگے اور جگ دیکھ کر منہ میں انگلیاں ڈال لے۔''

آدھے گھنٹے تک کوئی نہیں پہنچا۔ آگ نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اُس نے ہمت کی اور بھانے سے گدھا ریہڑی جوت لائی۔ بیٹے کو اُس پر بیٹھا کر کچے راستے پر چل پڑی۔ یہاں سے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر کمہاروں والی بستی میں اُس کی بہن کا گھر واقع تھا۔ اُس کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا جس کے پاس جاتی۔ فجر کی اذان آ رہی تھی جب وہ کمہاروں والی بستی میں داخل ہوئی۔ دروازے پر پہنچی۔ دستک دی۔ بہنوئی نے باہر نکل کر لُٹی پٹی حالت میں اپنی سالی کو دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''خیر تو ہے رَجو! محمد خان کہاں ہے؟ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟''

دل ہی دل میں ڈر گیا اور سوچنے لگا۔ ''اِس وقت کوئی ملنے کیلئے نہیں آیا کرتا۔ جو آتا ہے وہ خیریت سے نہیں ہوتا۔''

پناہ لینے کیلئے آنے والے کو وقت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ وہ روتے ہوئے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر بھینچنے لگی۔ لکڑی کا پھاٹک نما دروازہ دھکیل کر کھولتے ہوئے بولا۔ ''رَجو!

اندر آ جا۔ آرام سے بیٹھ کر بتا۔"

گدھاریہڑی صحن میں پہنچی تو تمام گھر والے جاگ گئے۔ اُس کے اردگرد اکٹھے ہوگئے۔ بہن نے پوچھا۔ "باجی رَجو! یہ تو اِس طرح یہاں کیوں آئی ہے؟ بھائی محمد خان کدھر ہے؟"

وہ بین کرنے لگی۔ سینے پر دوہتھڑ مارتے ہوئے چیخنے لگی۔ "ہائے! میرا خان مرگیا۔ ہائے میرے علم دینے کا شیر جیسا باپ مرگیا!"

آن کی آن میں گھر میں کہرام مچ گیا۔

صبح ہونے تک پوری بستی کو علم ہوگیا۔ وہ تھانے جا کر سردار فضل خان کی رپورٹ درج کرانا چاہتی تھی مگر بہن نے سمجھایا۔ "تم جانتی ہو کہ وہ کتنا ظالم اور کمینہ بندہ ہے۔ جو محمد خان کو مار سکتا ہے، اُس کے سامنے تم کیا ہو؟ تمہارا علم دین کیا ہے؟ ہم کیا ہیں؟...... وہ تم دونوں کو تھانے میں پہنچنے سے پہلے قتل کردے گا۔ تم اپنے پتر کی جان بچاؤ اور تھانے کچہری کے چکر میں مت پڑو۔ خدا ایسے ظالموں کا احتساب خود کرتا ہے۔ تم بھی اپنا مقدمہ خدا کی عدالت میں دائر کردو۔"

وہ ٹھیک کہتی تھی۔ رَجو نے چند دن تک سوچا۔ کبھی سوچتی کہ واپس لوٹ جائے۔ کبھی سوچتی کہ اتنی دور چلی جائے جہاں سے اُس کی خبر بھی سردار فضل تک نہ پہنچے۔ بہنوئی نے اُسے بتلایا کہ سردار فضل خان نے زمین پر قبضہ کرلیا ہے۔ محمد خان کی جلی ہوئی لاش کو نکال کر دفن کردیا گیا ہے۔"

وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں اُس کے اور اُس کے بیٹے کے بچ جانے کی خبر اُس فرعون تک نہ پہنچ جائے۔ اُس نے اپنی بہن سے بات کی تو وہ بولی۔ "بہن ہو، بہن کو گھر سے نکالتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے مگر کیا کروں؟ تم بڑے گھر میں بیاہی گئی تھیں، اُجڑ کر نکلیں۔ میری اوقات کیا ہے؟...... میں تو کمہاروں کے چھوٹے سے گھر کی بہو ہوں۔ تمہاری طرف بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو روکنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ سچ کہتی ہوں، کہیں دور نکل جاؤ۔ اتنی دور، جہاں سے مجھ تک بھی تمہاری کوئی خبر نہ پہنچے۔"

موت چھپائے نہیں چھپتی۔ زندگی بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جتنا چھپایا جائے، اتنی ہی ظاہر ہوتی ہے۔ سردار کو اُس کے زندہ بچ جانے کی خبر ملی تو وہ لوٹ پوٹ ہوکر رہ گیا۔ ہاتھی نکل گیا تھا، دُم رہ گئی تھی۔ جانتا تھا کہ یہ دُم اُس کی گردن کو کسی نہ کسی دن ناپنے کیلئے آن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچ گی۔ وہ کمہاروں کی بستی کی خبر لینے لگا۔

اُس کے ہرکارے اطراف میں دکھائی دیئے تو رَجو کے بہنوئی کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے اپنی سالی سے کہا۔ "رَجو! میں نے تمہاری گدھاریہڑی فروخت کردی ہے۔ رقم تمہاری بہن کے پاس ہے، لے لو۔ زمین کے ساتھ ساتھ مال ڈنگر پر بھی سردار فضل نے قبضہ جما لیا ہے۔ تم خالی ہاتھ ہو۔ اپنا آپ سنبھال لو۔ رات کو میں تمہیں چھپا کر شہر لے جاؤں گا۔ وہاں سے کہیں دور نکل جانا ورنہ تمہاری اور تمارے علم دینے کی خیر نہیں۔ سردار کے کتے تمہاری بُو سونگھتے پھرتے ہیں۔"

وہ دہل گئی۔ علم دین پر کوئی آنچ نہیں آنے دینا چاہتی تھی۔ راج کرنے والی کو رات کی ظلمت نما سیاہی میں چوروں کی طرح گاؤں سے نکل کر شہر جانا پڑا جہاں لاہور جانے والی بس پر سوار کرکے اُس کا بہنوئی واپس پلٹ گیا۔ جاتے ہوئے ہاتھ لہراتا ہوا بڑبڑایا۔ "جا رجو! تیرا رَب راکھا۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا، مجھے معاف کردینا۔"

بس چل پڑی تو وہ علم دین کے سوا پوری دنیا کو بھول گئی۔ وہ کون تھی؟ اُس کا کون کون تھا؟ کس نے کیا کیا؟ وہ سب کچھ فراموش کرتے ہوئے علم دین پر آس کا چراغ روشن کئے لاہور پہنچ گئی۔ اجنبی شہر میں کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ کوئی واقف کار نہیں تھا۔ ایسے میں ایک بوڑھا شخص مل گیا۔ اُس نے پوچھا۔ "بیٹی! تمہارے ساتھ سفر کرتا آیا ہوں۔ گاڑی میں بیٹھنے سے لے کر اُترنے تک تمہارے آنسو خشک نہیں ہوئے۔ کیا بات ہے؟"

لاہور کے ہجوم میں اپنی تنہائی کو دیکھ کر وہ لرزیدہ تھی۔ غمگسار ملا تو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اُسے اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔ وہ بھلا مانس شخص اُسے اپنے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھر میں لے گیا۔ اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ "دیکھ فاطمہ! آج قدرت نے ہم غریبوں کے گھر میں بھی پناہ مانگنے والا اُتار دیا ہے۔ لے ماں بیٹے کو سنبھال لے۔"

وہ بوڑھا کوچوان تھا۔ روز صبح تانگہ جوڑ کر نکل جاتا۔ شام کو چند روپے ڈَب میں ڈال کر لے آتا جسے دو خاندان بانٹ کر دو وقت کی روٹی حلق میں اُتار لیتے۔ ایک دو ماہ ایسے ہی گزر گئے۔ ایک دن رَجو نے بوڑھے سے کہا۔ "چاچا! اِس طرح کب تک گزارا چلے گا۔ میں اپنے پتر کو پڑھانا چاہتی ہوں۔ میں کوئی ایسا کام کرنا چاہتی ہوں جس سے کچھ رقم مل جائے۔ میرا بیٹا پڑھ سکے۔"

بوڑھا اُچنبھے سے بولا۔ ''تمہیں بیٹی سمجھتا ہوں۔ بیٹی سے کچھ چھپانا کفر ہوتا ہے۔ اِسی طرح بیٹی باپ سے کچھ چھپائے تو اللہ ناراض ہو جاتا ہے۔ سچے دِل سے بول! تمہیں یہاں کوئی تکلیف پہنچی ہے؟ کسی نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟''

وہ بولی۔ ''نہیں چاچا! ایسی کوئی بات نہیں مگر......''

بوڑھا سرِ دست نہیں مانا۔ آنے والے چند دنوں میں اُس کی ضد پر ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ ''اچھا پتر! میں کچھ کرتا ہوں۔ ایک گارمنٹس فیکٹری میں میرا یار کام کرتا ہے۔ اُس فیکٹری میں بہت سی عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ میں اپنے یار سے کہہ دیتا ہوں، وہ تمہیں وہاں کام دلوا دے گا۔ سلائی کڑھائی کا کام جانتی ہو ناں؟''

وہ بولی۔ ''تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ چند دن کام کروں گی تو سب پتہ چل جائے گا۔''

جب کام کرنے لگی تو بہت کچھ کا پتہ چل گیا۔ بیٹے کو سکول میں داخلہ دلوا کر اپنے کام میں جُت گئی۔ جانتی تھی کہ ابھی وہ چھوٹی کلاسوں میں پڑھتا ہے، خرچ کم ہوتا ہے۔ جوں جوں کلاسیں آگے بڑھتی جائیں گی، اخراجات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ کمائی میں سے کچھ خرچ کر لیتی، کچھ بچا لیتی۔ چاچا کے انتقال پر وہ اُس کے بڑے بیٹے کے گھر میں منتقل ہو گئی۔ وہ بھی کوچوان تھا۔ باپ کی طرح غریب پرور تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ غریبوں کے در کو غریب ہی سمجھنا بند کر دے تو پھر دنیا، دنیا نہ رہے، جہنم کدہ بن کر سب کچھ جلا دے۔

بیٹے نے میٹرک اچھے نمبروں میں پاس کر لیا تو اُس نے پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ دلوا دیا۔ اُسے اور گھر میں کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ پولی ٹیکنیکل کالج کا ماحول کتنا خراب ہے۔ دو سال پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ کچھ سمسٹر پاس کیے، کچھ میں فیل ہوا۔ قد کاٹھ اچھا نکالا تھا، ہر آنکھ میں کھٹکنے لگا۔ بچپن سے شخصیت کا حصہ بننے والی محرومیوں نے اُسے جوالہ مکھی بنا دیا تھا۔ کالج کے طلباء سیاسی نظریات پر لابیز کا شکار تھے۔ کوئی کسی کا آلہ کار تھا، کوئی کسی کا۔ ایسے میں اُس پر بھی کالج کے باہر بیٹھے ہوئے مفاد پرست بڑوں کی نگاہ پڑ گئی۔ اِس نگاہِ التفات سے دل و دماغ کی دنیا الٹ پلٹ ہو گئی۔ وہ جو بننے کیلئے کالج میں آیا تھا، وہ نہ بن سکا، ایک سال میں کالج کی سیاست کا اہم مہرہ بن گیا۔

تھرڈ ائر میں پہنچا تو تین سمسٹرز شارٹ ہو چکے تھے۔ اُسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ہوسٹل میں طلباء کے دونوں بڑے گروہوں میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ وہ بھی اِس آگ کے کھیل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں شامل تھا۔ اِس شمولیت نے دو طلباء کی جان نگل لی اور وہ دوہرے قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر جیل پہنچ گیا۔

رَجو کا علم دین گھر سے پڑھنے کیلئے کالج گیا تھا، قاتل بن کر جیل پہنچ گیا تو وہ ڈھے سی گئی۔ دونوں ہاتھ اوپر کی جانب دراز کرتے ہوئے نالہ کناں ہوئی۔ ''اے پروردگار! مجھ بے سری چادر چھین کر بیٹے سے گود آباد کرنے والے! ایسے ہی اگر دے کر لینا تھا تو دیا ہی کیوں تھا؟ تو جانتا ہے کہ میں اُسے علم دین بنانے کیلئے اپنی جوانی کو تج چکی ہوں۔ اُس کیلئے دنیا جہان سے بے خبر ہو چکی ہوں۔ تمہیں مجھ پر پھر بھی ذرہ بھر ترس نہیں آیا؟''

اُس نے پسِ انداز کی ہوئی رقم بیٹے کی رہائی کیلئے خرچ کر دی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اتنی رقم سے چوری چکاری کا کیس نہیں نبٹتا، قتل کا کیس کیسے جان چھوڑتا۔ کوئی پرسانِ حال نہیں رہا۔ دامن خالی ہو گیا تو عدالت نے علم دین کو ثابت شدہ دوہرے قتل کی پاداش میں سزائے موت سنا دی۔

اُس کی سزا کا سُن کر ماں کی ممتا بیٹے کے لٹکنے سے قبل ہی سُولی پر لٹک گئی۔ رات کو روتے روتے سو گئی تھی۔ آدھ رات کو خواب میں بیٹے کو سولی پر لٹکتے ہوئے دیکھ کر جان ہار گئی۔ عمر بھر ممتا کا تھکا ہارا غمزدہ دِل بیٹے کی سلامتی کیلئے لرزتے ڈرتے تھک گیا تھا۔ سلامتی خطرے میں پڑی تو دل کا جان لیوا دورہ پڑ گیا۔

اُسے ماں کی موت کی خبر ملی تو سلاخوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر رویا۔ اپنی بدبختی اور بے راہ روی کو جی بھر کر کوسا مگر باپ کی طرح ماں کو واپس لانے پر قدرت حاصل نہ کر سکا۔ جانے والے کبھی لوٹتے نہیں مگر ماں چند دنوں کے بعد ایک رات کو لوٹ آئی۔ اُس کی کال کوٹھڑی کے ساٹھ واٹ کے یرقان زدہ بلب میں سمٹ آئی۔ کوستے ہوئے بولی۔ ''اے نامراد! تو نے اتنا مُل ہی نہ پایا اپنی ماں کی قربانیوں کا۔ تجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں نے تمہیں بچانے کیلئے کیا کچھ داؤ پر لگایا؟ اگر پتہ ہوتا کہ تم نے ایسے حرام موت مرنا تھا تو تیرے خودکشی کرنے والے باپ سے کہہ دیتی، وہ تجھے اپنے ہاتھ سے مار دیتا۔''

وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ اُس کے پاس بولنے کیلئے کچھ رہا ہی نہیں تھا۔

تین سال جیل میں قید رہا۔ اِس دوران میں اُس کا واسطہ بہت سے ہنرمند لوگوں سے رہا جنہوں نے اُس کے ہنر کو جلا بخشی۔ جب اُس کے بلیک وارنٹ جاری ہوئے، تب تک

وہ عام اور جذباتی انسان نہیں رہا تھا بلکہ جیل کی بھٹی میں جل کر کندن ہو گیا تھا۔ پہلے اس کی زنجیر پاؤں میں بندھی رہتی تھی، اَب پاؤں ننگے ہو چکے تھے۔ برہنہ پائی میں دوڑنے کی رفتار دُگنی ہو جاتی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے تو اپنے باپ کے قاتل کو تلاش کرے اور اُسے بھی ابدی نیند سلا دے۔ اُس کے بعد خواہ اُسے پھانسی گھاٹ تک پہنچا کیوں نہ دیا جائے۔

پھر قسمت کی دیوی اُس پر مہربان ہو گئی۔ وہ جو سوچتا تھا، وہ ہونے چلا تھا۔ ایک دن انڈر ورلڈ کے مقید کل پرزوں نے جیل توڑنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ علیحدہ بیرک میں تھے۔ علم دین کو پتہ نہ چلا ورنہ اُن کے پروگرام میں شامل ہو جاتا۔ ایک رات جیل توڑ دی گئی۔ پانچ چھ قیدی بھاگ گئے۔ شہر بھر میں ہاہا کار مچ گئی۔ نیلی بتیاں چاروں اطراف میں کیڑے مکوڑوں کی طرح پھیل گئیں۔ وہ جیل میں مچ جانے والی غیر معمولی بھگدڑ کو سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ ایک سنتری نے پوچھنے پر اُسے بتلا دیا کہ چند قیدی جیل توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اوپر منہ کر کے فریاد کرنے لگا۔ "اے پیدا کرنے والے! اُن پانچوں کے ساتھ میرا نام بھی لکھ دیتا تو تمہاری خدائی میں کیا ہلچل مچ جاتی!"

قسمت اُس پر ہنسنے لگی۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "فکر نہ کر۔ بھاگنے والوں کی کچھ ہی دنوں کے بعد یہاں نعشیں پہنچ جائیں گی۔ تو زندہ سلامت جیل سے باہر پہنچ جائے گا۔"

جیلر اُس کے قریب آیا۔ آہنی گیٹ کا بڑا سا تالہ کھولتے ہوئے اُسے باہر آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے باہر نکل آیا۔ جیلر نے دروازہ بند کیا اور اُس کا بازو پکڑ لیا۔ برابر چلتے ہوئے دونوں دفتر میں آئے۔ اُس نے پوچھا۔ "صاحب جی! میں کچھ سمجھا نہیں۔" وہ ایک الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے بولا۔ "سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ جلدی کرو اور یہ کپڑے پہن لو۔"

اُس نے کپڑے پہنے۔ سپرنٹنڈنٹ نے اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے پورچ میں آیا۔ اُسے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "گاڑی چلاؤ۔ ہوٹر آن کر دو۔"

اُس نے بلا سوچے سمجھے تعمیل کی۔ گاڑی جیل کے گیٹ پر پہنچی۔ سپرنٹنڈنٹ کو دیکھ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اہلکاروں نے گیٹ بلا چون و چرا کھول دیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ جیلر کے ڈرائنگ روم میں حیران و پریشان بیٹھا اِس کھیل کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا وہ حصہ بن کر یہاں پہنچا تھا۔ سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

جب سردار فضل خان ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ اُسے دیکھ کر چونک گیا۔ ہاتھ ملا کر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ جیلر کے آنے پر سردار نے اُسے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہوا؟"

وہ بولا۔ "قسمت ساتھ دے گئی۔ آج ہی چند قیدیوں نے جیل توڑی اور فرار ہو گئے۔ سرکاری کھاتے میں جہاں وہ گئے، وہیں علم دین بھی چلا گیا۔ مجھے اِسے نکال کر لانے کا موقع مل گیا، لے آیا۔ اَب تم اِسے وصول کر سکتے ہو۔"

اُسے تب پتہ چلا کہ وہ ایک بریف کیس کے عوض فروخت ہو چکا تھا۔ خریدنے والے سے آشنا نہیں تھا۔ دونوں کار پورچ میں آئے۔ سردار کی نئی فور ویل جیپ میں بیٹھ کر اُسے آزادی کا یقین ہوا۔ وہ آزاد تھا۔ اپنے محسن کی طرف دیکھ رہا تھا اور جی ہی جی میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا جس نے اُس کی سن لی تھی۔

رخصت ہوتے ہوئے جیلر نے کہا۔ "سردار صاحب! بڑی سرکار تک میرا سلام پہنچا دیجئے گا اور اُنہیں بتلا دیجئے گا کہ میں نے اُن کے کہنے پر کس طرح جان پر کھیل کر بچے کو جیل سے باہر نکالا ہے۔"

سردار نے سر ہلا کر اُس کا شکریہ ادا کیا۔ گاڑی لاہور سے نکلی تو اُس نے پوچھا۔ "آپ نے مجھے کیوں جیل سے نکلوایا ہے حالانکہ میں آپ کیلئے اجنبی ہوں؟"

سردار نے لاپرواہی سے کہا۔ "مجھے تم جیسے جی دار آدمی کی ضرورت ہے۔ میرا ایک شیر مارا گیا ہے۔ اُس کی جگہ پُر کرنے کیلئے دوسرے شیر کی تلاش میں تم تک پہنچا ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بتلایا تھا کہ تم بڑے جی دار اور وفادار بندے ہو۔"

وہ سوچنے لگا۔ سردار کا کہنا کس حد تک سچ تھا؟ اِس بارے میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ سردار اُسے لے کر اپنی کوٹھی میں آیا۔ وہاں چند دن مقیم رہا۔ یہاں اُسے علم دین سے عالمگیر بنا دیا گیا۔ اُس کے کاغذات تیار کرائے گئے۔ اَب وہ آزادانہ طور پر پورے ملک میں گھوم پھر سکتا تھا۔ سردار نے ہر کام فول پروف انداز میں سرانجام دیا تھا۔ یہیں اُسے پتہ چلا کہ یہ وہی سردار فضل خان تھا جس نے اُس کے باپ کو اُس کی نگاہوں کے سامنے خودکشی پر

مجبور کیا تھا۔ یہی وہ انسان تھا جس نے اُسے اور اُس کی ماں کو کھڑکیوں کی سلاخوں سے باندھ کر تیل چھڑکا تھا۔

ماں بتلاتی تھی کہ وہ نمبردار تھا۔ تیس چوبیس سالوں میں وہ نمبردار سے ترقی پا کر اسمبلی کا ممبر بن کر فرعون بن چکا تھا۔ گاؤں سے شہر چلا آیا تھا۔ ماں اُس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں اتنا محتاط رہتی تھی کہ اُسے بھول کر بھی گاؤں، سردار فضل اور رشتے داروں کی تفصیلات سے آگاہ نہیں کرتی تھی۔ اُس نے تو علم دین کو یہ تک نہیں بتلایا تھا کہ سردار فضل خان اُس کا حقیقی چچا ہے۔ اُسے بڑا تعجب ہوتا تھا جب وہ سردار کو دیکھتا۔ چھوٹا بھائی پچیس ایکڑ کیلئے کس دل سے بڑے بھائی اور اُس کے خاندان پر موت مسلط کر سکتا ہے۔ اگر وہ عینی شاہد نہ ہوتا تو شاید کبھی بھی سردار کے ہاتھوں باپ کے قتل کے واقعے کو دل سے تسلیم نہ کرتا۔

سردار نے چند ہی دنوں میں اُسے اپنا معتمد خاص بنا لیا۔ اُس کے پاس سردار کے بعد سب سے زیادہ اختیارات تھے۔ وہ جو بھی کر دیتا، سردار رَد نہیں کرتا تھا۔ دل ہی دل میں شکر ادا کرتا تھا کہ اُس نے بغیر سوچے سمجھے سردار پر ہاتھ نہیں اُٹھایا ورنہ بے طرح مسل دیا جاتا۔ سردار بہت طاقتور تھا۔ عالمگیر نے اُسے زمین دکھانے کے لئے اُس نے تین سال شبانہ روز محنت کی تھی۔ ایک طرف اُس کا اعتماد حاصل کرنے کیلئے آگ کا دریا عبور کرتا گیا، دوسری طرف اُس کی ٹانگ کھینچنے کیلئے بازوؤں میں طاقت بھرتا رہا۔ آج وہ اِس قابل ہو گیا تھا کہ سردار کی نیند حرام کرنے لگا تھا۔

سردار کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اُس کی حقیقت سے آگاہ نہیں تھا ورنہ سانپ کا سَر کچلنے میں کوئی دیر نہ لگاتا۔ آستین میں پلنے والے سانپ نے بازو اور گردن کا ناپ لے لیا تھا۔

❀❀❀

شانی کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ چہرہ بھی متورم دکھائی دیتا تھا۔ عالمگیر نے دریافت کیا۔ ''کیا پھر رات بھر جاگتی رہی ہو؟''

اُس نے کمال معصومیت سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ مسکرایا۔ ''کیوں؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ایک بات یاد آ گئی تھی۔'' وہ نظریں نیچے کئے ہوئے بولی۔

وہ خاموشی سے اُس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ چند لمحے ناخنوں سے کھیلتی رہی۔ پھر سر اُٹھا کر اُس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اپنا دایاں ہاتھ پیٹ پر پھیرتے ہوئے آنکھوں سے بولی۔ ''اِس کم بخت کا کیا کرنا ہے جس نے گناہ کو اپنے دامن میں جگہ دے رکھی ہے؟''

وہ بولا۔ ''اِس کا بھی کچھ کر لیتے ہیں۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم نے پریشان نہیں ہونا۔ میں سنبھال لوں گا۔ پھر؟''

اُس کا چہرہ فکر و تردد اور ندامت کا مظہر بنا ہوا تھا۔ آہستگی سے بولی۔ ''مجھے بڑی شرم آتی ہے۔''

عالمگیر نے ایک عجیب سی تجویز پیش کی۔ ''اگر ہم دونوں شادی کر لیں تو تم شرم سے چھٹکارا پا لو گی۔ ہم کسی بھی ہسپتال میں جا کر ابارشن کروا سکتے ہیں۔''

وہ چونک پڑی۔ سوچنے لگی۔ عالمگیر کی بات دل کو لگتی تھی۔ باپ سے بھی ڈر لگتا تھا۔ خیال آیا۔ پاپا کو جب میری پامالی اور اُس کے نتیجے کا علم ہوا تو وہ مجھے زندہ زمین میں گاڑ دے گا۔ اُس کی اجازت کے بغیر شادی کروں گی تو وہ زیادہ سے زیادہ برا بھلا کہہ کر کچھ عرصہ کیلئے بلانا ترک کر دے گا۔ پھر مان بھی جائے گا۔

بولی۔ ''تمہاری بات ٹھیک ہے مگر پاپا سے ڈر لگتا ہے۔ کوئی اور طریقہ سوچو۔''

وہ لاپرواہی سے بولا۔ ''ڈاکٹر کا منہ نوٹوں سے بند کر دیا جائے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ کتنے پیسے مانگے گی؟''

''یہی کوئی بیس تیس ہزار روپے اور کیا!''

''یہ تو کوئی بڑی رقم نہیں ہے مگر......''

''مگر کیا؟''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''اگر وقت پر یہ سب کچھ نہیں کیا گیا تو پھر زیادہ ڈراؤنی صورت حال درپیش ہو گی۔'' عالمگیر نے کہا۔

''میں پاپا سے شادی کی اجازت مانگوں؟''

"پاگل ہوگئی ہو کیا؟" عالمگیر نے ہنس کر کہا۔ "وہ تمہیں کچا چبا ڈالے گا۔"

"مگر مجھے یقین ہے کہ جب میں اُنہیں بتلاؤں گی کہ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں تو وہ بغیر کسی خفگی کے مان جائیں گے۔"

"اِس یقین کی وجہ؟"

"تم!" وہ اُس کے سینے پر شہادت کی اُنگلی رکھتے ہوئے بولی۔

"میں کیوں؟"

"وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں۔"

"ہونہہ!" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "پیار کرنا اور ہے، پیاری چیز سونپنا اور ہے۔ تم اِس غلط فہمی کو دِل سے نکال دو۔"

"تو ٹھیک ہے۔ جیسا کہو گے، میں ویسا ہی کروں گی۔" شانی نے کندھے اُچکا کر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"گاڑی آجائے، پھر بازار کی طرف نکلیں گے۔ آج شام کا کھانا باہر کھائیں گے۔ پیٹ بھرے گا تو عقل کی رَگیں کھل کر راستہ دکھا دیں گی۔" عالمگیر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر سردار سے رابطہ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ "سردار! کیا انڈرورلڈ کے ایجنٹ نے تمہارے ساتھ رابطہ کیا ہے؟"

سردار کی آواز سنائی دی۔ "ہاں! تھرڈ مین کہہ رہا تھا کہ داؤد سبحانی مجھے ہٹا کر کسی اور کو سامنے لانا چاہتا ہے۔ اُس نے مطالبہ میرے سامنے رکھا ہے کہ میں سیاست سے ریٹائرمنٹ لے لوں۔"

"اوہ نو!" عالمگیر نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ تو بہت بُرا ہوا۔ تم نے اُسے روپوں پیسوں کی پیشکش کرنا تھی۔ نہیں کی؟"

سردار نے کہا۔ "مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ تم کہتے ہو تو یہ بھی کوشش کر دیکھتا ہوں۔ کیا تم اُن لوگوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے؟ اُنہیں اُن کے ارادوں سے کسی طرح باز نہیں رکھ سکتے؟"

وہ بے بسی سے بولا۔ "سردار! ہمارے علاقے میں اور یہاں کے ماحول میں بہت فرق ہے۔ ویسے بھی داؤد سبحانی تین چار سالوں سے چھپا ہوا ہے۔ خدا جانے ملک میں ہے بھی یا نہیں۔ اُس کا نام اور حکم چلتا ہے۔ جو دکھائی ہی نہیں دیتا ہو، اُس سے مقابلہ کس طرح کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا سکتا ہے۔ ویسے بھی فردِ واحد کی بات اور ہے، کسی منظم تنظیم کا چلن اور ہے۔ ایک کے مرنے کے بعد دوسرا تمام امور کو سنبھال لیتا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"تم اُن کی بات مان لو۔"

"مان لینے سے میری بنی بنائی خاک میں مل جائے گی۔"

"نہیں مانو گے تو سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔" عالمگیر نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ "تم اُنہیں چکر دو۔ سیاست کو خیر باد کہہ دو۔ اعلان کر دو۔ سیٹ پر ضمنی انتخابات ہوں گے۔ اُس وقت تم اپنا کوئی بندہ کھڑا کر دینا۔ یوں اُن کی فرمائش بھی پوری ہو جائے گی، تمہارے اختیارات بھی بالواسطہ طور پر تمہارے پاس رہیں گے۔"

سردار نے کہا۔ "میرا بیٹا تو کوئی ہے نہیں جسے میں کھڑا کروں تاکہ میری طاقت میرے گھر میں ہی رہے۔"

وہ بولا۔ "شانی بی بی الیکشن لڑ سکتی ہے۔ اگر تم اُسے سیاست میں نہیں لانا چاہتے تو اُس کی شادی کر کے اپنے داماد کو اُس نشست کا امیدوار بنا دینا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"کیوں؟"

"اُس کی شادی میں ابھی بہت دیر ہے۔" سردار نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے ایسا بھی کوئی دکھائی نہیں دیتا جس کے ساتھ اُس کی شادی کروں۔ اِسی لئے تو میں نے اُسے شریکِ سفر کے انتخاب کی مکمل آزادی دے رکھی ہے۔"

"سردار! تم ریزائن دو گے تو فوری طور پر الیکشن کا انعقاد عمل پذیر نہیں ہوگا۔ تین چار ماہ تو کم از کم لگ ہی جائیں گے۔ اتنی دیر میں کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا ہے۔" عالمگیر نے تسلی دی۔

سردار ربع صدی پر محیط پُر تشدد محنت کے ثمر سے الگ ہونے پر راضی ہوگیا۔ بولا۔ "یہاں رفیع اللہ نے بھی خاصا پریشان کر رکھا ہے۔ بشیر خان اور فقیر محمد کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ دونوں دریا پار کر کے اُس کی دسترس سے نکل گئے ہیں مگر کب تک؟ ایک نہ ایک دن تو اُس کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ اُن کی عدم موجودگی میں خود کو بے دست و پا خیال کرنے لگا ہوں۔"

ایسے میں عالمگیر نے دوسرے فون پر سردار سے کال ملانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سردار نے کہا۔ ''عالمگیر! تھرڈ مین مجھے کال کر رہا ہے۔ تم فون بند کرو۔ اُس سے بات چیت کے بعد میں تم سے رابطہ کرتا ہوں۔''

عالمگیر نے ایک فون رکھ دیا۔ دوسرا اُٹھالیا۔ بولا۔ ''ہیلو سردار فضل! میں تھرڈ مین بول رہا ہوں۔ تم نے کیا فیصلہ کیا؟''

''میں نے تمہاری بات ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آنے والے چند دنوں میں ہی قیادت تک میرا استعفیٰ پہنچ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں سیٹھ سجانی کو مطلع کر دیتا ہوں۔ تم زندگی میں کبھی بھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لو گے۔ بلدیاتی انتخابات میں بھی۔''

وہ بولا۔ ''شیر کا شکار کرنے والا کتوں کے پیچھے نہیں دوڑتا۔ فکر نہ کرو۔'' سردار نے کہا۔

عالمگیر نے۔ ''او۔ کے'' کہہ کر کال منقطع کر دی۔ چند لمحوں کے بعد اُس کے دوسرے فون پر سردار کی کال آ گئی۔ فون کان سے لگا کر بولا۔ ''ہاں سردار! کیا رہا؟ وہ اُلو کا پٹھا کیا کہتا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں سیاست سے قدم کھینچنے کا فیصلہ کر چکا ہوں تو وہ خوش ہو کر بولا کہ میں بلدیاتی اکھاڑے میں بھی نہ اُتروں۔ احمق آدمی کو اتنا بھی علم نہیں کہ سردار فضل خان صوبائی اسمبلی کو چھوڑ کر ضلعی اسمبلی میں کیسے بیٹھ سکتا ہے۔'' سردار خاصا تلملایا ہوا تھا۔ ظاہر ہے، تازہ تازہ زخم تھا، چبھن نا گزیر تھی۔

عالمگیر نے بشیر خان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ناکام ہونے پر شبر علی کے نمبر کو ٹرائی کرنے لگا۔ وہ بھی بند تھا۔ سوچنے لگا۔ ''شیر کے آنے پر رَن کانپ اُٹھا ہے، یوں لگتا ہے کہ رفیع اللہ کی آمد پر سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔''

دوپہر تک ڈرائیور گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ شانی نے بازار جانے کی ضد پکڑ لی۔ دونوں تیار ہو کر شاپنگ کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔ بار ہا کے دیکھے ہوئے شاپنگ پلازے کو گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گاڑی روک کر بولا۔ ''بم دھماکے والی جگہ دیکھ کر ڈرنے لگی ہو؟''

''ہاں!'' وہ بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ گاڑی سے اُترتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ تمہارا ڈر اُتارنے کیلئے ضروری ہے کہ یہاں شاپنگ کی جائے۔ کم آن!''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں پلیز! کہیں اور چلتے ہیں۔''

اُس نے دروازہ کھول کر اُسے ہاتھ سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے بولا۔ ''کہا ناں پیاری! یہیں شاپنگ کی جائے گی۔''

وہ ڈرتے ڈرتے اُتری۔ اُس سے چمٹ کر چلنے لگی۔ وہ مسکرایا۔ ''دل چاہتا ہے کہ تم ایسے ہی عمر بھر پہلو سے لگ کر چلتی رہو۔''

وہ جھینپ کر پرے ہو گئی۔ پھر قریب ہو آئی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اردگرد بغور دیکھ رہی تھی۔ اُسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ بم کس جگہ پر پھٹا تھا۔ بھگدڑ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک دکان سے نکل کر دوسری میں گھستے ہوئے رُک گئی۔ مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ''کیا ہوا؟''

''تم بہت اچھے ہو۔''

''اور تم؟''

''میں تو بس یونہی سی ہوں۔ تمہارے ساتھ چلتی رہوں تو خوفزدہ نہیں ہوتی۔ تم اوجھل ہو جاؤ تو ہر چیز سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ کیا محبت ایسی ہی ہوتی ہے؟'' اُسے شاید لوگوں کی کوئی پرواہ نہیں رہی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر بولی۔ ''میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ خدا سے دعا کرتی ہوں کہ مجھے بس اتنی ہی زندگی دینا، جو تمہارے ساتھ گزر جائے۔''

وہ بولا۔ ''یہ باتیں گھر میں بھی ہو سکتی ہیں۔ چلو شاپنگ کرو۔''

وہ بولی۔ ''کیا ٹال رہے ہو؟''

''نہیں...... میں ٹلنے یا ٹالنے والا نہیں ہوں۔''

والہانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دکان میں گھس گئی۔ باہر نکلے۔ سیڑھیاں اُتر رہے تھے جب شانی کے فون کا بزر بجنے لگا۔ سکرین کو دیکھ کر بولی۔ ''پاپا فون کر رہے ہیں۔''

فون آن کر کے کان سے لگایا۔ بولی۔ ''ہائے پاپا! کیسے ہیں آپ؟ ماما کیسی ہیں؟''

دوسری طرف سے باپ کی آواز سنتی رہی۔ ہنستے ہوئے بولی۔ ''ایک بات بتاؤں پاپا!''

میں اُس جگہ پر کھڑی ہوں جہاں بم پھٹا تھا۔"

عالمگیر اُس کے چہرے کے پل پل بدلتے تاثرات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ "نہیں پاپا! مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔ عالمگیر میرے ساتھ ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ بہت اچھا ہے۔ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔"

پاپا نے کچھ ایسا کہہ دیا تھا کہ وہ شرما کر مسکرانے لگی۔ کن اکھیوں سے عالمگیر کو دیکھا، پھر آنکھیں چُرانے لگی۔ فون بند کر کے بولی۔ "پاپا بعض اوقات بات کرتے ہوئے سوچتے نہیں ہیں۔"

"کیا کہہ رہا تھا تمہارا باپ؟" وہ مسکرایا۔ "کیسی بات کہہ دی اُس نے جس پر اتنے پیارے چہرے پر قوسِ قزح پھوٹ پڑی۔"

مصنوعی خفگی سے اُسے دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

واپسی پر ریڈ سگنل پر رُکتے ہوئے عالمگیر نے اُسے بتایا۔ "تمہارے باپ کے پیچھے انڈر ورلڈ کا بڑا سیٹھ داؤد سبحانی پڑ گیا ہے۔ اُس کے کہنے پر تمہارے باپ نے سیاست سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔"

وہ چونکی پھر خوشی سے بولی۔ "ہائے عالمگیر! تم سچ کہہ رہے ہو؟"

وہ استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔ "تمہیں یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے، حیرت ہے!"

"ہاں!" وہ قطعیت سے بولی۔ "میں اُن کا سیاست میں رہنا پسند نہیں کرتی۔"

"کیوں؟"

"سیاست مردہ ضمیری کا پیشہ ہے۔"

وہ سوچنے لگا۔ شانی نے بہت بڑا سچ اگلا تھا۔ سگنل کے گرین ہونے پر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "واقعی! تم نے ٹھیک کہا۔"

وہ مستفسر ہوئی۔ "یہ انڈر ورلڈ کیا شئے ہے؟"

اُس نے اُس کی ذہنی سطح کے مطابق سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"اتنے ظالم اور بااختیار ہیں یہ لوگ؟"

"ہاں!" وہ بولا۔ "وہ تمہارے باپ کو بلیک میل کر رہے ہیں۔ ایک حکم مان لینے کے بعد دوسرا ماننا پڑتا ہے۔ یہ سلسلہ بندے کے مرنے پر ہی ختم ہوتا ہے۔ خدا جانے وہ اگلا حکم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا دیتے ہیں؟"

وہ متفکر ہوگئی۔ سوچنے لگی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک طرف مجھے رئیس کا خاندان نیچا دکھانے کی کوشش میں جُتا ہوا ہے، دوسری طرف پاپا کے پیچھے چیتے لپک رہے ہیں، یہ سب کچھ کیا ہے؟ کس جرم کی سزا ہے؟"

اُس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ باپ کے جرائم کی فہرست طویل تھی۔ کتابوں میں پڑھتی آئی تھی کہ کسی کے گناہوں کا بوجھ اُسی کے کندھوں پر ہی لادا جاتا ہے، کسی بے قصور پر حرف نہیں آتا۔ یہاں خود کو بے قصور سمجھتے ہوئے سولی پر لٹکتا دیکھ رہی تھی۔ کار پورچ میں رُکی۔

وہ گارڈ کو بلا کر کہنے لگی۔ "سامان میرے کمرے میں رکھ دو۔"

گارڈ شاپنگ بیگ اُٹھانے لگا۔ وہ عالمگیر کے پیچھے پیچھے اُس کے کمرے میں آ گئی۔

عالمگیر کی سوالیہ نظروں پر سر جھکا کر بولی۔ "تم سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ وہ سانس ہموار کر کے بولی۔ "پاپا کی طرف سے دل کو پریشانی ہو رہی ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ تمہارے سوچنے کا کام نہیں ہے اور نہ ہی پہلی مرتبہ ایسا ہو رہا ہے۔ سیاست میں یہ سب کچھ چلتا رہتا ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تمہارے باپ کو سیاست سے ریٹائرمنٹ لے کر آرام کرنا چاہیے۔ وہ مسلسل میرے رابطے میں ہے۔ تم اپنی فکر کرو، مجھے سردار فضل کی پریشانیوں کی فکر کرنے دو۔"

ایسے میں سردار فضل نے عالمگیر سے رابطہ کیا۔ وہ فون کان سے لگا کر بولا۔ "ہاں سردار! کیا بات ہے؟"

"بات لمبی ہے، کیا کر رہے ہو؟"

"میں اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھا ہوں۔ کہو!"

سردار نے متفکر لہجے میں کہا۔ "بڑی سرکار میرے مستعفی ہونے کے فیصلے پر بہت جز بز ہیں۔ قیادت پر بھی یہ فیصلہ بہت گراں گزر رہا ہے۔ اَب بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"تم بڑی سرکار کی فکر نہ کرو۔ وہ تمہیں نہیں بچا سکتا۔ تمہاری گرنے والی ساکھ کو کندھا نہیں دے سکتا۔ اس لئے جو تمہیں داؤد سبحانی نے کہا ہے، اُسی پر عمل کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ضمنی انتخابات میں تمہیں کھڑا کروں۔" سردار

نے کہا۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔ حیرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں...... میں کیوں؟''

''میں تمہارے علاوہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ میرا کوئی سگا تو ہے نہیں، سسرالی رشتہ داروں کی فطرت کو بخوبی جانتا ہوں۔ سانپ کی طرح دودھ ڈکار کر ڈسنے پر آ جاتے ہیں۔'' سردار نے کہا۔

''نہیں سردار!'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''میں الیکشن نہیں لڑ سکتا۔ ویسے بھی میں نے سوچ رکھا ہے کہ جونہی تم پریشانیوں سے نکلو گے، میں اپنا بوریا بستر باندھ لوں گا۔''

سردار چیخا۔ ''کیوں؟ تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاؤ گے؟''

شانی غور سے اُس کی باتیں سُن رہی تھی۔ بوریا بستر باندھنے کی بات پر چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ دل پر گھونسا لگا۔ کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا تو عالمگیر نے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کرا دیا۔ فون پر سردار سے مخاطب ہوا۔ ''تم نے اپنی سیاسی بساط کو دسترس میں رکھنے کیلئے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ بساط پلٹ گئی۔ اَب تم بھی آرام کرو، مجھے بھی کرنے دو۔ رہی بات کہ کہاں جاؤں گا تو اِس بارے میں قبل اَز وقت کچھ نہیں بتا سکتا۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ سر چھپانے کی جگہ مل جائے گی۔''

سردار کا لہجہ بدستور استعجاب آمیز اور خفگی آلود تھا۔ ''تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔''

عالمگیر نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں سردار! تمہاری دنیا سے میرا دل اُوب گیا ہے۔''

شانی سے نہ رہا گیا۔ اُس کے ہاتھ سے فون جھپٹ کر پاپا سے مخاطب ہوئی۔ ''پاپا! یہ میں کیا سُن رہی ہوں؟ عالمگیر کہہ رہا ہے کہ وہ کہیں چلا جائے گا...... یہ سب کیا ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔''

سردار کا لہجہ متغیر ہو گیا۔ ''شانی بیٹا! کیا تم عالمگیر کے کمرے میں ہو؟''

شانی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سمجھ میں آیا کہ عالمگیر نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کیوں خاموش کرایا تھا۔ مگر اَب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بولی۔ ''ہاں پاپا! ہم اَبھی شاپنگ کر کے گھر پہنچے ہی تھے کہ آپ کا فون آ گیا۔''

''عالمگیر کو فون دو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں دوں گی پاپا!'' شانی غصے سے بولی۔ ''جو میں پوچھتی ہوں، اُس کا جواب دیں۔''

باپ نے بیٹی کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ جھنجلا کر سکرین کو گھورنے لگی۔ فون کو بیڈ پر پٹخ دیا۔ عالمگیر کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑنے لگی۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم نے جانے کی بات کیوں کی ہے؟''

وہ بت بنا بیٹھا رہا۔ حسن مشتعل تھا۔ گرم لوہا چوٹ مانگنے لگا تھا۔ اشتعال دلانے کیلئے بولا۔ ''تمہارے باپ نے مجھے اپنے اقتدار کو دائمی طاقت دینے کیلئے لاکھوں میں خریدا تھا۔ اَب اُسے میری ضرورت نہیں رہے گی۔ ویسے بھی میں نے سوچا ہے کہ میں کہاں ہوں؟ میرا دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں کسی کا کچھ نہیں ہوں۔ تمہارے باپ کیلئے کشت و خون کرتا رہا، تمہارے لئے تمہاری باتیں سُنتا رہا، اپنے لئے آج تک کچھ بھی نہیں کر پایا ہوں۔ اَب کہیں دور جا کر اپنی زندگی کے بارے میں سوچوں گا۔''

وہ چند لمحے جلتی نظروں سے اُسے گھورتی رہی پھر بولی۔ ''میں تمہاری کچھ بھی نہیں ہوں؟''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''تم امیر زادی ہو، بڑے باپ کی ناز و نعم میں پلی ہوئی بیٹی ہو۔ میرا اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ مخمل پر ٹاٹ کا پیوند ہر نظر کو چبھنے لگتا ہے۔''

وہ غصے میں لرزنے لگی۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔ جنونی انداز میں عالمگیر کی آستین کھینچ کر اوپر چڑھا دی۔ عالمگیر حیرت سے اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اُس نے دانت کچکچاتے ہوئے اُس کے بازو کے گوشت میں دانت گاڑ دیے۔ اُس نے بازو کھینچنے کی کوشش کی تو درد کی کٹیلی لہر پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ شانی نے اُسے کاٹنے پر اپنی پوری قوت صرف کر ڈالی تھی۔

عالمگیر نے مٹھی بھینچ لی، جبڑا بھینچ لیا۔ درد کو ضبط کرتا رہا۔ پندرہ بیس سیکنڈ گزر گئے۔ شانی کو ہوش آیا تو اُس نے منہ کھولا اور سر اُٹھا لیا۔ عالمگیر کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ گیانیوں کی طرح آنکھیں بند کر کے منہ اُٹھائے بیٹھا تھا۔ دیوانگی کم ہوئی، بازو پر نظر پڑی تو چونک اُٹھی۔ بازو کے اندر والی سائیڈ کے نرم گوشت میں اُس کے دانت دائروی شکل میں ثبت ہو چکے تھے۔ ننھے ننھے گڑھوں سے خون رسنے لگا تھا۔

اپنے کیے پر ندامت ہونے لگی۔ یہ اُس نے کیا کر دیا تھا؟

بغیر سوچے سمجھے قدم اُٹھایا جائے تو ندامت دامن گیر ہو جاتی ہے۔ وہ گھبرا کر دیوانوں

کی طرح خون میں چھپنے والے دانتوں کے نشانات کو چوسنے لگی، ہونٹ رگڑنے لگی۔ ایسے میں آنکھیں جل تھل ہوگئیں۔ خون، لعاب اور آبِ چشم......خون زندگی کی ایک جاندار علامت، لعاب زندگی کے پر پیچ راستوں میں لڑکھڑاتے وجود کو سنبھالا دینے والا ایک سیال مادہ، آبِ چشم زندگی کے بدن پر لگے زخموں پر مرہم نما ایک مداوا۔ جنوں نے خرد کو مٹھی میں لیتے ہوئے سب کو باہم شیر وشکر کر دیا تو وہ سسک پڑی۔

سانپ پہلے اپنے دانتوں سے کاٹتا ہے، پھر اپنے کاٹے پر زہر ٹپکاتا ہے۔ زخم خوردہ کا دم گھٹنے لگتا ہے، سانس رکنے لگتی ہے۔ وہ بھی زخم پر کچھ ٹپکا رہی تھی۔ جانے کیا تھا کہ زہر وصول کرنے والا بدن تپنے لگا۔ دم گھٹنے کی بجائے مشتعل ہوتا جارہا تھا۔ سانس رکنے کی بجائے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ بند آنکھیں نشے سے معمور ہونے لگیں۔ خود کو ہواؤں کے دوش پر اڑتا محسوس کرتے ہوئے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا۔ ”ہائے! یہ لمحہ یہیں ٹھہر جائے۔ کوئی جگائے نہ اگر سو جائیں۔ یونہی بدن پر جنوں کے عالم میں چرکے لگاتی رہے، یونہی اپنے کاٹے پر شراب انڈیلتی رہے، میں مر بھی جاؤں تو غم نہیں، خشک زندگی سے ایسی موت بھلی ہے۔“

ایسے میں شانی کے فون کا بزر بجا۔ اُس نے جھپٹ کر فون اُٹھایا۔ سکرین پر پاپا کا نمبر دیکھا تو جھنجلا کر پوری قوت سے فون سیٹ دیوار پر دے مارا۔ فون ٹوٹ کر بکھر گیا۔ دیوار پر ننھا سا نشان پڑ گیا۔

عالمگیر مَے زدہ نگاہوں سے اُس کی ہیجانی شکل کو دیکھ رہا تھا۔ ہیجانی کیفیت کو ہیجانی ردعمل سے ختم کیا جاسکتا تھا۔ اُس نے شانی کو کھینچ کر سینے سے لگالیا۔ دل سسکیاں سننے لگا، شانی کی سماعت میں عالمگیر کے سینے میں اُس کیلئے دھڑکنے والے دل کی دھڑکن...... دھک......دھک......کر کے اُترنے لگی۔ وہ بولی۔ ”جانا ہے تو میرا گلا گھونٹ کر چلے جاؤ۔ جیتے جی تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“

وہ اُس کی زلفوں میں کھو گیا۔ ایسے کوئی روکے تو کون نہ تھم جائے؟ عالمگیر نے آہستگی سے اُسے پکارا۔ ”شانی! میری جان!“

”ہوں......“

”تم مجھے دل سے روکنا چاہتی ہو؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر تمہیں روکنا نہیں چاہتی تو جانے کا سُن کر اپنی دھڑکنیں کیوں رکنے لگتی ہوں؟ کہہ نہ پائی تو عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ بولی۔ ”ہاں!“

”تو پھر مجھے اپنے پیار کی زنجیر میں باندھ لو۔ مجھ سے شادی کرلو۔“

اُس نے یکبارگی چونک کر سر اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں بے باکی سے جھانکا۔ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی۔ ”بس......“

لوٹنے کیلئے آنے والا خود لُٹ کر سرنگوں بیٹھ گیا۔ شانی بایاں ہاتھ اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔ ”ذہنی طور پر بہت پہلے سے تمہیں اپنا سب کچھ مان چکی ہوں، خود کو تمہارے سپرد کر چکی ہوں۔ جسم پر اختیار چاہتے ہو۔ لو تھام لو۔ جب جی چاہے، کورٹ میں لے جاؤ اور مجھے اپنا بنالو۔ میں نے تمہیں اپنا مان لیا ہے۔“

عالمگیر کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ آنکھوں کے سامنے لہراتے بازو کو دیکھا۔ بازو اوپر کی جانب اٹھنے کی وجہ سے کف نیچے کہنی کی جانب کھسک گیا تھا۔ کلائی سے کچھ اوپر ننھا سا سیاہ تل پنڈولم کی طرح ادھر اُدھر ہورہا تھا۔ اُس نے بازو پکڑ لیا اور تل پر اپنے عمر بھر کے تشنہ ہونٹ ثبت کر دیے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ تجربہ ہوا تھا کہ اُجلے تن پر سیاہ دھبا بن کر کھٹکنے والا تل بے جان نہیں ہوا کرتا۔

طوفان تھمتے تھمتے پھر شدت اختیار کرنے لگا تھا۔

کورٹ سے باہر نکلنے پر شانی نے نظریں نیچے کئے ہولے سے کہا۔ ''میں نے تمہیں ہمیشہ کیلئے روک لینے کی خاطر اپنے بدن کو زنجیر بنا کر تمہارے قدموں سے لپیٹ دیا ہے۔ چاہوں گی کہ تم کبھی بھی اِس زنجیر کو نہ توڑو۔''

وارفتہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''زنجیر پیروں کو نہیں، دل کو پوری طرح جکڑ چکی ہے۔ بھاگ کر کہاں جاؤں گا؟''

وہ گاڑی میں بیٹھ کر بولی۔ ''ایک بات اور......''

''کہو!''

''مانو گے؟''

''نہ ماننے کی ہوئی تب بھی مان لوں گا۔''

''میں نے پاپا اور ماما سے اجازت لئے بغیر شادی کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے یہ قدم نہایت مجبوری کی حالت میں اُٹھایا ہے۔ تمہیں بھی اِس مجبوری کا علم ہے۔ میں چاہوں گی کہ میں خود کو تمہارے سپرد اُس وقت کروں جب کوئی مجبوری حائل نہ رہے ورنہ میں ساری عمر ندامت محسوس کرتی رہوں گی۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ اور کہو!''

وہ تشکرانہ نگاہوں سے اپنے محبوب کو دیکھنے لگی۔ ''رحمت بی سمیت کسی کو ہماری شادی کا پتہ نہ چلے۔''

''یہ حکم بھی مان لیا۔ اور کہو......''

''میں ایسے کہتی جاؤں، تم مانتے جاؤ۔ ہائے اللہ! اِس سے زیادہ خوبصورت زندگی بھی کوئی ہوگی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بدقت تمام ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز کئے بیٹھا رہا۔ دل میں سوچنے لگا۔ ''ہر دم محبت کا دم بھرنے والی کو جب پتہ چلے گا کہ میں کوئی غیر نہیں، اس کا حقیقی چچازاد ہوں تو اِس کے محبت کی پھونکوں سے پھلائے گئے غباروں سے ہوا نکل جائے گی۔''

دل میں خیال آیا۔ ''مجھے اس طرح اپنا مشن مکمل کرنا چاہیے کہ باپ پر ٹوٹ پڑنے والی قیامت سے بیٹی بالکل بےخبر رہتے ہوئے میری محبت میں سرتاپا غرق رہے۔ باپ بیٹی کے دل میں ہونے والی اُتھل پتھل سے بےخبر رہے۔ پھر زندگی کا مزہ آئے گا۔''

وہ اُسے سوچ میں گم دیکھ کر بولی۔ ''اے! کیا اکیلے اکیلے سوچے جا رہے ہو؟ میں کوئی اَور نہیں، تمہاری 'وہ' ہوں۔ مجھ سے کچھ چھپاؤ گے تو میں تمہاری نظروں سے چھپ جاؤں گی۔''

وہ بولا۔ ''تمہارے باپ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ دنیا بھر کی دولت پر ناگ بن کر بیٹھا ہے مگر بھری دنیا میں کوئی بھی اُس کا اپنا نہیں ہے جسے وہ اپنی جگہ پر کھڑا کر سکے۔''

وہ بولی۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''محبوبہ اَن کہی سمجھتی ہے، بیوی سمجھانے پر بھی سمجھ نہیں پاتی۔'' وہ ہنسا۔ ''میں سردار کا کچھ نہیں لگتا۔ اُس سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ اُسے ابھی تک یہ علم نہیں ہے کہ میں چور راستے سے گزر کر اُس کا داماد بن چکا ہوں۔ اپنی نشست پر مجھے کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ بیٹا، بھتیجا یا بھانجا کوئی ہوتا تو وہ پکی ہوئی کھیر میری پلیٹ میں کبھی میں نہ ڈالتا۔ اَب اُسے میرے سوا دنیا میں کوئی اَور دکھائی نہیں دیتا۔ اُس نے رقم سے محل خریدے ہیں، اَپنا کسی کو نہیں بنایا۔''

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ سوچنے لگی۔ ''کتنا اچھا ہے کہ عالمگیر اسمبلی کا ممبر بن جائے۔ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں۔ بڑے آدمی کی بیوی بن جاؤں گی۔ میرے شخصی وقار میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ فائدہ بھی ہو گا کہ کسی کو ہم دونوں کے بیچ میں حائل طبقاتی فرق دکھائی نہیں دے گا۔''

امید بھرے لہجے میں بولی۔ ''پاپا پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ میں خود بھی چاہتی ہوں کہ وہ سیاست ترک کر کے مکمل آرام کریں۔ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ایسے میں تمہیں اُن کی بات مان لینا چاہیے۔ مان لینے والا پیارا لگتا ہے۔ پیارے کو پیاری چیز سونپتے ہوئے دل کو دکھ نہیں ہوتا۔''

وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ ”وہ اپنی جان سے پیاری چیز مجھے دینے پر رضامند نہیں ہوگا۔ میرے بازوؤں میں دم ہے۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آنکھ کا سرمہ چُرا لیا ہے۔“ شانی کے عریاں بازو پر چٹکی کاٹتے ہوئے بولا۔ ”اَب دل دکھے یا نہ دُکھے، پیاری چیز تو زندگی بھر کیلئے میری ہو چکی ہے۔“

وہ شرارت سے بولی۔ ”ابھی پاپا کو پتہ نہیں ہے۔ پتہ چلنے پر وہ تمہیں گولی بھی مار سکتے ہیں۔“

مارکیٹ سے نیا موبائل فون سیٹ خریدا۔ شانی نے سم فٹ کرکے اپنے باپ کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر بولی۔ ”پاپا! کیا ابھی تک مجھ سے ناراض ہیں؟“

پاپا کی بات سنتی رہی۔ چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے۔ عالمگیر کو کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ اَب بھی میرے ساتھ ہے۔ آپ نے ہی تو اُس کا خیال رکھنے کا حکم دیا تھا۔ اَب خیال رکھتی ہوں تو آپ کو......“

عالمگیر کان لگا کر سردار کی بات سننے کی کوشش کررہا تھا مگر ناکام ہو رہا تھا۔ شانی بولی۔

”پاپا! وہ بہت اچھا ہے۔ آپ کے بارے میں بہت پریشان رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ آپ کو اُس کی ضرورت ہے۔“

پاپا کی بات سُن کر بولی۔ ”ہاں ہاں! میں اُسے کہیں نہیں جانے دوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ ماما کو سلام دیجئے گا۔ اوکے!“

عالمگیر سے مخاطب ہوئی۔ ”پاپا کہتے ہیں کہ تم واقعی بہت اچھے ہو۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اگر تم ممبر منتخب ہو جاتے ہو تو پھر......“

”پھر کیا؟“

”کہہ رہے تھے کہ پھر......“

”تجسس پیدا کئے جاتی ہو۔ بتاؤ ناں کہ پھر کیا؟“

”پھر تمہاری اور میری شادی کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔“ وہ شرما کر بولی۔ ”میں تبھی تو کہتی ہوں کہ پاپا کی بات مان کر اُن کے دل میں اپنی جگہ بنا لو۔ اُنہیں واقعی سہارے کی ضرورت ہے۔ سہارا بیٹا ہی دے سکتا ہے۔ بیٹی کا شوہر بیٹے کا نعم البدل ہوتا ہے، سہارا دے سکتا ہے۔ تم یہ کر سکتے ہو، میری مان کر الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ سنا دو۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس نے سوچنے کا وقت لیتے ہوئے کہا۔ ”میں اِس انداز سے اپنے ذہن کو ڈھالنے کی کوشش کروں گا۔“

مارکیٹ سے نکل کر لیڈی ڈاکٹر کے کلینک میں پہنچے۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ شانی اندر چلی گئی۔ دو مریضوں کے بعد اُس کا نمبر لگا۔ ڈاکٹر اُسے دیکھتے ہی مسکرا کر بولی۔ ”آؤ مس شاہانہ! کیا تمہاری میڈیسن ختم ہو گئی ہے؟“

وہ پورے اعتماد سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ”دوائی ابھی چل رہی ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ بغیر کسی نقصان کے میرا وزن ہلکا ہو جائے گا؟“

ڈاکٹر اچنبھے سے بولی۔ ”تو کیا تم نقصان کے ڈر سے وزن اُٹھائے رکھنے کی متحمل ہو؟“

”متحمل تو نہیں ہوں مگر پھر اُنہیں سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ نہ مانے تو اُنہیں آپ کے پاس لے آؤں گی۔ آپ سمجھائیں گے تو وہ سمجھ جائیں گے۔“ شانی نے کہا۔

”وہ کون؟“ ڈاکٹر بھونچکی رہ گئی۔

”میرے شوہر اور کون!“ وہ بے ساختگی سے بولی۔

”تو کیا واقعی تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“ ڈاکٹر کی آنکھیں پھٹ پڑنے کو تھیں۔

”تو کیا میں آپ سے جھوٹ بولتی ہوں۔“

ڈاکٹر کو یقین نہیں آرہا تھا۔ سوچنے لگی کہ کل کی چھوکری اُسے چکر دینے کی کوشش کررہی ہے۔ چکر دینے والی کو چکر میں ڈالنے کیلئے بولی۔ ”وہ اِس وقت کہاں ہیں؟“

”ویٹنگ لابی میں بیٹھے ہیں۔“

”اُنہیں بلا کر لاؤ۔“

وہ اُٹھی۔ باہر آئی اور عالمگیر کو اشارے سے اٹھا کر واپس آفس میں آ گئی۔ عالمگیر سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”ڈاکٹر صاحبہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

ڈاکٹر تعجب آمیز نگاہوں سے عالمگیر کو دیکھ کر بولی۔ ”میں نے سمجھا تھا کہ آپ کی مسز غیر شادی شدہ ہیں۔ دراصل یہاں ایسے کئی لوگ آتے رہتے ہیں۔ غلط فہمی ہو گئی۔ مگر مجھے سمجھ نہیں آیا کہ آپ لوگ ایسا کیوں کررہے ہیں۔ اولاد اللہ کی نعمت ہے۔ نعمت کو یوں ٹھکرایا جائے تو اللہ روٹھ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ رحمت کا چشمہ ہمیشہ کیلئے سوکھ کر خاموش ہو جاتا ہے، اپنا بہاؤ کھو دیتا ہے۔ تب انسان رہ جاتا ہے، تشنگی رہ جاتی ہے اور منتوں مُرادوں

کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ رہ جاتا ہے۔"

عالمگیر نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحبہ! میری مسز بھی یہی چاہتی ہے مگر ہماری کچھ پرابلمز ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہیں۔ جن دنوں میں ڈیلیوری متوقع ہے، انہی دنوں میں اس کے فائنل ایگزامز ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم ابھی چند سال اپنی محبت میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتے۔ آپ کے پاس اپنے مسئلے کے حل کیلئے آئے ہیں۔ آپ کی جو بھی فیس ہوگی، دوگنی کر کے چکائیں گے۔ ورنہ کسی اور دَر پر دستک دینے کیلئے یہاں سے اُٹھ جائیں گے۔"

ڈاکٹر پیڈ پر آڑی ترچھی لکیریں ڈالتی رہی، سوچتی رہی۔ ہزاروں روپوں کے عوض وہ اَن دیکھا قتل کرتی تھی۔ یہاں روپے دکھائی نہیں دیے تو نصیحتوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئی۔ عالمگیر نے کہا۔ "اگر آپ ہماری مدد نہیں کریں گی تو ہم کسی اور ڈاکٹر سے رجوع کر لیں گے۔"

یہ کہہ کر اُس نے جیب سے بڑے نوٹوں کی گڈی نکالی اور میز پر رکھ دی۔ بولا۔ "میرے نزدیک پیسہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میری بیوی کی صحت پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اِس لئے میں احتیاط کی بڑی سے بڑی قیمت چکانے کو تیار ہوں۔"

ڈاکٹر کبھی رقم کو دیکھتی، کبھی دونوں میاں بیوی کو دیکھتی۔ سوچنے لگی۔ "جائز کام کے اتنے پیسے نہیں دیے جاتے۔ اگر یہ غلط نہیں کہہ رہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ شاہانہ کا چاہنے والا بہت امیر آدمی ہے۔"

چند لمحے سوچنے کے بعد اُس نے حامی بھر لی۔ مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تم دونوں کی جوڑی کے سدا سلامت رہنے کی دعا کرتی ہوں۔"

پیڈ پر کچھ لکھ کر کاغذ پھاڑ کر شاہانہ کو تھماتے ہوئے بولی۔ "میں نے ڈیٹ لکھ دی ہے۔ اِس دن یہاں آ جانا۔ تب تک پرچی پر لکھی ہوئی دوائیاں باقاعدگی سے کھاتی رہنا اور ہاں! اِس دوران احتیاط بھی کرنا۔"

دونوں کلینک سے باہر آئے۔ ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

اگلے دن دوپہر کو سردار فضل خان نے فون پر عالمگیر کو بتایا کہ اُس کا استعفیٰ قبول کر لیا گیا ہے۔ عالمگیر نے اُسے بتایا۔ "سردار! انڈر ورلڈ کے [illegible] دے مجھ کچھ خطرناک لگتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے کل شام کو مجھ تک ایک ڈسک پہنچائی ہے۔ پیغام دیا ہے کہ یہ وڈیو ڈسک تم تک پہنچا دی جائے۔ میں نے تمہاری اجازت کے بغیر اُسے دیکھا ہے۔ وہی فلم ہے جو بڑی سرکار کے بندوں نے شہر والی کوٹھی میں چوہدری باسط کی بیٹی پر بنائی تھی۔ اگر کہو تو میں اِس ڈسک کو بھیج دوں۔"

سردار نے استعجاب آمیز لہجے میں پوچھا۔ "اُس فلم کو بھیجنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

عالمگیر نے کہا۔ "یہ بعد کی بات ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ فلم اُن تک پہنچی کیسے؟"

سردار سوچ میں پڑ گیا۔ بولا۔ "تمہارے اور بڑی سرکار کے علاوہ کسی کو فلم کے بارے میں پتہ ہی نہیں تھا۔ اِس کا مطلب ہے کہ بڑی سرکار کو استعمال کیا گیا ہے۔"

وہ فکر انگیز لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ بڑی سرکار کے آس پاس سیٹھ سبحانی کے کارندے موجود ہیں جو نہ صرف بڑی سرکار بلکہ تمہیں بھی نگاہوں میں رکھتے ہیں۔"

سردار نے کچھ غیر متعلقہ باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ عالمگیر کے جال میں مچھلی پھنس چکی تھی۔ اَب اُسے پوری مہارت سے پانی سے باہر لانا تھا۔ ایسے کہ جال بھی سلامت رہے، مچھلی بھی کنارے پر آ جائے۔ شام کو دوسرے نمبر سے سردار کو کال کی۔

"سردار فضل خان! میں تھرڈ مین بول رہا ہوں۔ ایک اور تحفہ تمہارے کارندے تک پہنچا دیا گیا ہے۔ کیا تمہیں مل چکا ہے؟"

سردار نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ "ہاں! مل چکا ہے۔ مگر سمجھ نہیں آئی کہ ایسی فحش فلم ہمارے پاس بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟"

عالمگیر قہقہہ لگا کر ہنسا۔ "کیا ہمیں احمق سمجھ رکھا ہے تم نے؟ وہ فلم تم نے اور تمہاری بڑی سرکار نے چوہدری باسط کو بلیک میل کرنے کیلئے بنوائی تھی۔ اِس بات کو چھوڑو، یہ سوچو کہ اگر یہ فلم چوہدری باسط کے بننے والے داماد ملک امجد تک پہنچا دی جائے اور اُسے بتلا دیا جائے کہ کس کے ہاتھوں کا ہنر ہے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔"

سردار کی حالت غیر ہونے لگی۔ بولا۔ "مگر ایسا کرنے سے تمہیں کیا ملے گا؟"

"مجھے جو مل رہا ہے، وہی کافی ہے۔ ایسا کرنے سے انڈر ورلڈ کے سیٹھ کو کیا ملے گا، یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ ملا تو ضرور پوچھوں گا۔" وہ بولا۔ "ابھی تم ہمارے چھوٹے پتے دیکھ رہے ہو۔ بڑے پتے وقت آنے پر شو کرائے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لئے

یہی کافی ہیں۔"

سردار فضل نے کہا۔ "میں نے تم لوگوں کا مطالبہ مان کر اسمبلی میں اپنا استعفیٰ بھیج دیا ہے۔ اَب اور کیا چاہتے ہو؟"

"علم نہیں۔ سیٹھ بتائے گا تو تمہیں بتا دوں گا۔ جلد ملاقات ہوگی۔ گڈ بائی!" عالمگیر نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ سردار کی راتوں کی نیند حرام کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جانتا تھا کہ آنے والے چند دنوں میں سردار اپنا سر نوچنے پر مجبور ہو جائے گا۔

شانی نے کلاس جائن کر لی۔ پہلے اُس کا ارادہ تھا کہ تعلیم کو خیر باد کہہ دے گی۔ عالمگیر نے اُسے سمجھا بجھا کر یونیورسٹی جانے پر تیار کر لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے اپنی تعلیم کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ اپنے ماحول کو فیس کرنے کی بھرپور کوشش کرے اور خود اعتمادی کو تقویت دے۔

واپسی پر شانی نے اُسے کہا۔ "رئیس کی گاڑی مسلسل ہمارے پیچھے چلی آ رہی ہے۔"

عالمگیر نے بیک مرر میں جھانکا۔ رئیس کی نئی کار کو پہچانتا تھا۔ پارکنگ میں اُس کی گاڑی کے قریب ہی پارک کی گئی تھی۔ بولا۔ "میں دیکھ رہا ہوں۔"

وہ گھبرا سی گئی۔ عالمگیر نے مسکرا کر گاڑی روڈ سائیڈ پر کھڑی کر دی۔ جلدی سے اُتر کر رئیس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ رئیس نے ہنگامی طور پر بریک لگائے اور گردن باہر نکال کر کہا۔ "اے مسٹر! کیا تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں رہا؟ اگر ایسا ہی ہے تو کوئی اور طریقہ ڈھونڈ نکالو خودکشی کا۔"

وہ اُس کے قریب آ کر بولا۔ "مجھے واقعی زندگی سے پیار نہیں ہے۔ تم بتاؤ! ہمارا تعاقب کیوں کر رہے ہو؟"

وہ ہنسا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مس شاہانہ میری کلاس فیلو ہے۔ جب وہ ہر روز آدھا دِن میرے ساتھ گزارتی ہے تو مجھے کیا پڑی تعاقب کرنے کی۔"

عالمگیر نے لہجہ سخت کرتے ہوئے کہا۔ "تم اپنا راستہ بدل کر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے ہو۔ باتیں نہ بناؤ اور جو تمہارے دل میں ہے، وہ بتاؤ۔"

رئیس پر اُس کے دبنگ لہجے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بدستور ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ الزام تو میں بھی دے سکتا ہوں کہ تم لوگ میرے آگے آگے چل رہے ہو۔ رہی بات راستے کی، شہر کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمام راستے میرے ہیں۔ میں کسی بھی سڑک پر کسی بھی وقت گاڑی چلا سکتا ہوں۔ تم بھی ایسا کر سکتے ہو۔ تم اِس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

شاہانہ گاڑی سے اُتر کر قریب آ گئی۔ بولی۔ "رئیس! یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

وہ بولا۔ "مجھے واقعی سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کونسا جرم کر بیٹھا ہوں۔"

شاہانہ نے غصیلی نگاہ اُس پر ڈالی اور عالمگیر کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔ "کم آن عالمگیر! ہمیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ رئیس واقعی ایسا انسان نہیں ہے۔ میں اِسے بخوبی جانتی ہوں۔"

عالمگیر گاڑی میں بیٹھ کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ رہ رہ کر جھلاہٹ ہو رہی تھی۔ کبھی کوئی اُس کے سامنے یوں ٹھہرا نہیں تھا۔ رئیس گاڑی آگے نکال لے گیا۔ شانی نے کہا۔ "پلیز عالمگیر! اپنا موڈ درست کرو۔ غلطی میری تھی۔ میں نے خواہ مخواہ ہی اُس بے چارے پر شک کیا۔"

وہ نفرت آگیں لہجے میں بولا۔ "میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اُس حرامی کا گلا گھونٹ دوں۔"

گاڑی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے سے گزرنے لگی تو شانی نے ہاتھ سے رُکنے کا اشارہ کیا۔ وہ کار روک کر استفہامیہ نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "اپنا موڈ نارمل کرو۔ میں ہوٹل میں ریفریشمنٹ لینے کے خوشگوار موڈ میں ہوں۔"

عالمگیر نے کار پارکنگ کا رُخ کیا۔ گاڑی روک کر دونوں اُتر کر ہوٹل میں داخل ہو گئے۔

❀❀❀

جس دن لیڈی ڈاکٹر نے اُسے مکمل طور پر روبہ صحت ہونے کی نوید سنائی، اُس نے فوری طور پر پاپا کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ عالمگیر نے بہتیری کوشش کی کہ وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے مگر وہ ڈٹ گئی۔ عالمگیر کو ہار ماننا پڑی۔ سردار کو اپنے آنے کی اطلاع دے کر تیاری کرنے لگا۔ اگلے دن علی الصبح دونوں لاہور سے نکل کھڑے ہوئے۔

سہ پہر میں وہ حویلی پہنچے۔ پاپا کے گلے لگ کر رونے لگ گئی۔ سردار فضل خان نے چونک کر عالمگیر کی طرف دیکھا۔ پھر شانی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "کیا بات

ہے بیٹا؟ خیریت تو ہے ناں؟“

وہ بولی۔”پاپا! میں آپ کو بہت مس کرتی تھی۔ عالمگیر کے وہاں پہنچنے سے پہلے مجھے بہت ڈر لگتا تھا۔“

سردار کو تسلی ہوئی۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ عالمگیر کو مہمان خانے میں بھیج کر دونوں باپ بیٹی اندرونِ خانہ چلے گئے۔ شانی ماما سے ملنے کیلئے بے تاب تھی۔ کافی عرصہ بعد ماں سے مل رہی تھی۔

ماں نے اُس کی شکل پر چھائی نقاہت کو بھانپتے ہوئے کہا۔”کیا بات ہے شانی؟ بیمار رہی ہو کیا؟“

”ہاں ماما! مجھے کئی دن تک مسلسل بخار چڑھتا رہا ہے۔ ڈاکٹر سے دوائیں لیں، تب جا کے کہیں آرام آیا ہے۔“ اُس نے بات بنائی۔

رات گزار کر عالمگیر نے اپنے ساتھیوں کے پاس جانے کے ارادے سے کار باہر نکالی۔ متروک حویلی پر پہنچا۔ وہاں بشیر خان اور شبر علی موجود نہیں تھے۔ اُس نے فقیر محمد سے پوچھا۔”دونوں کہاں ہیں؟“

”وہ بیلے میں روپوش ہیں۔“

”کیوں؟“ وہ حیران ہوا۔

”نیا تھانیدار آیا ہے نا! وہ رفیع اللہ!“ فقیر محمد نے بتایا۔”وہ دونوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مخبر نے بتایا تھا ہمیں۔ ہم نے دونوں کو یہاں سے نکال دیا ہے۔“

”اُن کے فون بھی آف ہیں۔ کیوں؟“

”فون اِس لئے بند رکھے ہیں کہ بیلے میں سیلولر فون کے سگنل موصول ہی نہیں ہوتے۔“ فقیر محمد نے بتایا۔ عالمگیر نے اُس سے بیلے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پھر اُسے ساتھ لے کر دریا کی طرف نکل گیا۔ وہ راستوں سے واقف نہیں تھا جبکہ فقیر محمد کئی مرتبہ بیلے تک آ چکا تھا۔

دریا عبور کر کے وہ پیدل ہی بیلے کی طرف چل دیے۔ راستہ خاصا دشوار گزار تھا۔ دوپہر کے قریب وہ بیلے میں بنے ہوئے ایک کچے مکان میں بشیر خان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ شبر علی کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ بشیر خان نے لاہور میں گزرے ہوئے شب و روز کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

احوال کرید کرید کر دریافت کیا۔ بولا۔”یار! تمہارے مزے ہیں۔ دوہرے قتل پر سزائے موت ہونے کے باوجود آزادی سے گھومتے پھرتے ہو۔ ایک ہم ہیں کہ معمولی سی ڈکیتیوں پر اشتہاری قرار دیے گئے اور اَب تک قانون کے آگے دوڑے پھرتے ہیں۔ اَب رفیع اللہ کو ہی دیکھ لو۔ آتے ہی اُس نے میرے بارے میں دریافت کیا۔ یوں جیسے میں کوئی بہت بڑے گینگ کا سربراہ ہوں۔ یوں جیسے مجھے پکڑے بغیر علاقے میں امن و امان کی فضا قائم نہیں کی جا سکتی۔“

فقیر محمد ہنسنے لگا۔”دھت تیرے کی بشیریا! تو خود کو کیا سمجھتا ہے؟ تیرے چہرے پر اگر کپڑا ڈال دیا جائے تو شاید کوئی کتا یا چوہا بھی تجھ سے نہ ڈرے۔ تیری آنکھوں اور مونچھوں کی تو علاقے میں دہشت ہے۔“

بشیر خان کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا روٹی پانی کا بندوبست کرنے لگا۔

فقیر محمد کو شبر علی کی طرف روانہ کر کے دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ کافی دیر گزر گئی۔ نہ ہی فقیر محمد شبر کو لے کر واپس پہنچا اور نہ ہی دونوں کی باتوں نے ختم ہونے کا نام لیا۔

پھر صلاح و مشورہ ختم ہو گیا۔ بات کو ختم کرتے ہوئے بشیر خان نے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”یار عالمگیر! میں خود بھی اِس زندگی سے عاجز آ چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا بھی ایک چھوٹا سا گھر ہو، بہت پیار کرنے والی بیوی ہو، بچے ہوں، سکون ہی سکون ہو۔ یہ تو کوئی زندگی نہیں کہ سردار جیسے فرعون کے ٹکڑوں پر پلتے رہو، جو وہ چاہے، کرتے رہو اور کسی دِن پولیس کی گولی کی بھینٹ چڑھ جاؤ۔ اپنی نہ کوئی مرضی اور نہ کوئی مستقبل!“

عالمگیر کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ مصمم ارادے کو ظاہر کرنے والی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر تیر گئی۔”بشیر خان! بس تھوڑا سا وقت اور۔ ہماری مشکلیں حل ہونے والی ہیں۔ ہمارے راستوں کے آخر میں منزلیں منتظر کھڑی ہیں۔ بس چند دن اَور!“

بشیر خان نے سر ہلایا۔ اُسے عالمگیر کے کہے ہوئے لفظوں پر اعتبار تھا، اپنی نگوڑی قسمت پر بھروسہ نہیں تھا۔ قدرے مایوسی سے بولا۔”تم حوصلہ دیتے ہو، تمہارا بھلا ہو مگر مقدر کیا کھیل کھیلتا ہے، علم نہیں۔“

ایسے وقت میں فقیر محمد اور شبر علی کچے گھر کے دروازے کو عبور کر کے صحن میں داخل ہو گئے۔

عالمگیر سہ پہر ڈھلنے پر لوٹ آیا۔ اُسے علم تھا کہ اندھیرے میں بیلے سے نکلنا اور دریا عبور کر کے متروک حویلی تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ بزدل آدمی نہیں تھا مگر خواہ مخواہ کے خطرات مول لینے کا روادار نہیں تھا۔ رات حویلی میں قیام کیا۔ لالٹین کی روشن لو پر نظریں جمائے لیٹا رہا۔ دل ہی دل میں ماں کو پکارتا رہا۔ ہر روز آ کر نصیحتوں کی پٹاریاں کھولنے والی کہیں دور جا کر چھپ گئی تھی۔ بارہا بلانے پر بھی دکھائی نہیں دی تو اُس نے تھک کر کروٹ بدل لی۔ ماں پرانے دور کی عورت تھی، بلانے پر بھی نہیں آئی۔ نئے زمانے کی عورت بن بلائے آن وارد ہوئی۔ ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی شانی کی آواز نے اُسے اپنے طلسم میں جکڑ لیا۔ وہ اپنے بیڈروم میں لیٹی ہر کروٹ پر اُسے یاد کر رہی تھی۔ اپنے چاہنے والے کو جتلا رہی تھی۔ ''عالمگیر! یہ کون سا احساس ہے؟ دن کے اُجالے میں ڈرنے والی لڑکی اَب رات کے گھور گھپ اندھیرے کو بھی خاطر میں نہیں لا رہی۔ کیا دو چار آدمیوں کی موجودگی میں خود کو کسی کے سپرد کر دینے سے کوئی اَلوہی طاقت مل جاتی ہے؟''

وہ بولا۔ ''یہ عجیب سا احساس ہے جو انسان کے رگ و پے میں ایک پل کے دورانیے میں سرایت کر جاتا ہے۔ تم ڈر نہیں رہی ہو۔ میں سو نہیں رہا ہوں۔ پہلے میرا سرہانہ میرے سر تلے دَبا رہتا تھا۔ آج باغی ہو کر سینے سے چمٹا ہوا ہے۔ پہلے تمہیں آزادی سے چھو سکتا تھا، تمہارے ہاتھ سہلا سکتا تھا، تمہاری زلفوں کے بَل انگلیوں پر لپیٹ سکتا تھا، تمہیں ہمیشہ کیلئے حاصل کرنے کے بعد چھونے کی اجازت بھی گنوا بیٹھا ہوں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا اِسے محبت کہتے ہیں کہ جو نزدیک ہیں، اُن کی خبر نہیں۔ تم میلوں دور لیٹی ہوئی ہو، دماغ تم پر سے ہٹنے کو تیار نہیں۔''

فون میں جلترنگ بج اُٹھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ لوٹ پوٹ ہونے لگی تو اُس نے ٹوکا۔ ''میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا جو تم یوں احمقوں کی طرح ہنسنے لگ جاؤ۔''

وہ بہ دقت تمام خود پر قابو پاتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بولی۔ ''میں ہنس رہی ہو مگر تم پر نہیں، خود پر۔ تم دنیا پر چھانے والے مرد ہو۔ عالمگیر ہو۔ میں شاہانہ ہوں۔ شاہانہ دنیا پر حکومت کرنے والے کے دل پر حکومت کر رہی ہے۔ کیا یہ خوش ہونے والی بات نہیں ہے؟''

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔''

''میری خوش فہمی نہیں، تمہاری غلط فہمی ہے۔'' اُس نے چیلنج کیا۔ ''اگر چاہو تو آزما سکتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو۔ میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ تم بھی چُپ ہو جاؤ۔ دیکھتے ہیں کون پہلے بولتا ہے؟''

دونوں اپنے اپنے فون کانوں سے لگائے خاموش ہو گئے۔ ایک دوسرے کے سانسوں کی مدھم سی آواز ٹکراتی رہی۔ ایک منٹ...... دو...... پھر کئی گزر گئے۔ دونوں خاموش رہے۔ دونوں ہارنا نہیں چاہتے تھے مگر مقابل آئے ہوئے کھلاڑیوں میں سے ایک کو ہارنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی قسمت ساتھ دینے لگتی ہے۔ شانی کی قسمت عروج پر تھی۔ اُس کے پری پیڈ فون میں بیلنس ختم ہو گیا۔ دونوں طرف ٹوں ٹوں کی آواز گونج اُٹھی۔ عالمگیر نے مسکرا کر فون کان سے ہٹایا۔ کال رِی بیک کی۔ ریسیو ہونے پر مذاق اُڑاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھا شانی! میں نہیں ہارا، تمہارے دانے ختم ہو گئے۔''

وہ بولی۔ ''تم ہار گئے ہو۔ لیکھوں کے اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ قسمت نے تمہیں بتلایا ہے کہ میرے فون کی طرح میری زندگی کا بیلنس ختم ہو سکتا ہے مگر ضد ٹوٹ نہیں سکتی۔''

وہ بولا۔ ''اور تم بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں ٹوٹنے کے بعد بھی اَڑا رہنے والا مرد ہوں۔''

شانی خاموش ہو گئی۔ وہ بولا۔ ''اَب چُپ کیوں لگ گئی؟''

''سوچ رہی ہوں۔''

''کیا؟''

''تمہیں یہاں کئی مرتبہ دیکھا تھا مگر دِل کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ پھر یہ کیا ہوا کہ تم لاہور میں آئے اور دل و دماغ پر چھا گئے۔ کیا تم اِس کی وضاحت کر سکتے ہو؟''

''ہاں!'' وہ ہنسا۔ ''وہاں تمہاری عقل پر پردے پڑ گئے تھے۔''

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ بولی۔ ''پاپا اور ماما نے تمہیں کل ڈنر پر بلانے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ ماما تمہیں اچھی طرح دیکھنا بھالنا چاہتی ہیں۔ قربانی کیلئے بکرا ٹٹول ٹٹول کر پسند کرنے کی عادی ہیں ناں!''

وہ خاموش رہا تو بولی۔ ''اہتمام کر کے آنا پلیز!''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پھر ٹوں ٹوں کی آواز نے بتلا دیا کہ اُس کا بیلنس بھی اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ مسکرا کر ننھی سی سکرین کو دیکھنے لگا۔ بڑبڑایا۔ ''زندگی کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ کیا سمجھوں؟ اُس کے تھکنے کے چند ہی لمحوں کے بعد میں بھی بُجھ جاؤں گا؟ ہائے! کتنا اچھا ہو گا۔ محبت کے بغیر جینا فضول ہوتا ہے۔ ایسے جینے سے مرجانا بہتر کہلاتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑکی کی درزوں سے ٹھنڈی ہوا گزر کر چہرے پر ٹھنڈک ثبت کرنے لگی، اُسے تھپک تھپک کر سلانے لگی۔ بڑے دنوں کے بعد اِس چارپائی پر، اس کھڑکی کے سامنے، یاروں دوستوں کے درمیان رات گزارنے کیلئے آیا تھا۔

مقدر اپنے کھیل کے بارے میں پیشگی اطلاع نہیں دیتا۔ انسان کو مہرہ بنائے مرضی پر مرضی کرتا چلا جاتا ہے۔ شانی کے کہنے پر اچھی طرح بن سنور کر سردار فضل خان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوا۔ شہر میں داخل ہونے پر اچانک اُس کے اندر رفیع اللہ سے ملنے کی خواہش سر اُٹھانے لگی۔ اُسے یہ خواہش کبھی بھی نہیں رہی تھی مگر اَب ہونے لگی تھی۔ شہر کے وسطی چوک میں رُک گیا۔ شانی کے گھر کو لے جانے والا راستہ دائیں طرف لیٹا تھا۔ پولیس اسٹیشن پہنچانے والی راہ بائیں طرف کھڑی اُسے بلا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ ''ایسا کیوں ہے؟ میں نے کبھی بھی رفیع اللہ سے ملنے کا نہیں سوچا، آج کیوں جی چاہ رہا ہے؟''

مقدر کے سُروں پر دِل اپنا راگ الاپنے لگتا ہے تو انسان خرد و سُدھ سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ عالمگیر نے بلامقصد گاڑی تھانے کی طرف بڑھا دیا۔ برآمدے کے قریب کار روک کر اُترا۔ سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا کہ اے ایس آئی محمد بخش محرر کے دفتر سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ اُسے تھانے میں دیکھ کر حیرت بھرے انداز میں بولا۔ ''اوئے عالمگیر! تم اور یہاں؟''

وہ بولا۔ ''میں رَفیع اللہ سے ملنے کیلئے آیا ہوں۔ کیا وہ ڈیوٹی پر موجود ہے؟''

محمد بخش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو یہ کہوں گا کہ تم اُس کے سامنے مت آؤ۔ اُس نے تمہارے بارے میں کافی معلومات حاصل کر رکھی ہیں۔''

عالمگیر مسکراتے ہوئے رفیع اللہ کے آفس میں داخل ہوگیا۔ وہ ایک فائل کھولے مطالعے میں مصروف تھا۔ چند لمحے دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا پھر رفیع اللہ نے کہا۔ ''تشریف رکھیں۔''

وہ ہاتھ ملا کر کرسی میں بیٹھ گیا۔ بولا۔ ''میرا نام عالمگیر ہے۔ دِل میں تم سے ملنے کا اشتیاق تھا، چلا آیا۔ برا لگا ہے تو لوٹ جاتا ہوں۔''

رفیع اللہ نے تصدیق چاہی۔ ''تم سردار فضل خان کے ہاں کام کرتے ہو ناں؟''

''ہاں!'' اُس نے ایک پل کیلئے بھی رفیع اللہ کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔

رفیع اللہ کے چہرے کے تاثرات تھوڑا تغیر پذیر ہوئے، پھر اُس نے خود پر قابو پا لیا۔

''کہو! کیسے آنا ہوا؟''

''میں نے کہا ناں کہ ملنے کے اشتیاق میں چلا آیا ہوں۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ''مجھے تم سے کوئی کام نہیں ہے۔''

رفیع اللہ فائل کے اوراق الٹنے پلٹنے لگا۔ عالمگیر نے دیکھا کہ وہ خاصا پریشان تھا۔ پریشانی بادی النظر میں سنجیدگی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بولا۔ ''کیا میرے دوستی کیلئے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نہیں تھامو گے؟''

رفیع اللہ چند لمحے تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ''عالمگیر! میں نہ تو امیر آدمی ہوں، نہ امیروں کا آلہ کار۔ مجھ سے دوستی گانٹھ کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔''

وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''یہاں اَب تک آنے والے تمام تھانیدار بکاؤ مال تھے۔ چارج لینے سے پہلے سردار فضل کی کوٹھی پر حاضری دیتے تھے۔ سردار نے بتایا کہ تم نے ایسا نہیں کیا۔ ہر طرف تمہاری ایمانداری کے قصے سنے سنائے جا رہے ہیں۔ میں بہت کچھ سوچ سمجھ کر تمہارے پاس دوستی کا ہاتھ بڑھانے کیلئے آیا ہوں۔''

رفیع اللہ تنقیدی نظروں سے اُس کا احاطہ کرتا رہا۔ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''دوستی انسانی جذبات کی معراج ہوتی ہے۔ توہین کی جائے تو مَر جاتی ہے۔ خلوص کی آبیاری کا مسلسل اعادہ ہوتا رہے تو اَمر ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجرم ہو۔ بڑے بڑے جرموں کا ارتکاب کر چکے ہو لیکن تمہاری خوش قسمتی یہ ہے کہ تمہارے خلاف کوئی ایف آئی آر تھانے کے ریکارڈ پر نہیں ہے۔ اگر تم یہ وعدہ کرو کہ آئندہ کوئی جرم نہیں کرو گے، لوگوں کے جان و مال پر غاصبانہ نگاہیں نہیں گاڑو گے اور کسی کو تکلیف نہیں دو گے تو ہماری دوستی چلتی رہے گی۔ میں دُشمن کی، دوست کی، اجنبی کی...... کسی کی بھی غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ضمیر کی تنے ہوئے تار پر قدم جما کر چلنے کی ہمت خود میں پاتے ہو تو ویل کم! وگرنہ گڈ بائی!''

''میں اچھا نہیں، برا ہوں۔ مگر وعدے کی پاسداری کرنا جانتا ہوں۔ تمہارے پاس آنے کا مقصد شاید یہ بھی رہا ہو کہ میں خود کو بدلنا چاہتا ہوں۔ میں تمہاری طرح مضبوط اور کھرا انسان بننا چاہتا ہوں۔ اِس کام میں تم میری مدد کر سکتے ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' عالمگیر نے کہا۔

دونوں نے پُرجوش انداز میں ہاتھ ملایا۔ فون نمبروں کا تبادلہ کیا اور چائے پی کر جدا ہو گئے۔ عالمگیر کو وہ بہت اچھا انسان دکھائی دیا۔ اُس کی سختی اور قانون پسندی کے بارے میں جو کچھ سُن رکھا تھا، وہ سچ محسوس ہوا۔ محمد بخش نے اُسے بتایا۔ ”اِس دور میں ایس ایچ او کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود جس آدمی کے گھر میں ٹی وی نہ ہو، فریج، کوٹھی، کار کچھ بھی نہ ہو تو وہ اِس عہد کا ولی اللہ کہلانے کا حقدار ہوتا ہے۔ رفیع اللہ بھی ایسا ہی ہے۔ بھری دنیا میں اُس کی دو بیگھے زمین تک نہیں ہے۔ بیٹے کو سکول چھوڑنے کیلئے پیدل جاتا ہے۔ کبھی سرکاری گاڑی استعمال نہیں کرتا۔“

محمد بخش نے رفیع اللہ کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتایا۔ بے دھیانی میں اپنا اور اُس کا موازنہ کرتے ہوئے سردار کی کوٹھی پر پہنچا۔ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے لیٹ ہو چکا تھا۔ شانی نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ”پہلے دن ہی ماما کو دو گھنٹوں کے انتظار کی کوفت میں مبتلا کر چکے ہو۔“

وہ کندھے اُچکا کر بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری ماما سے معذرت کر لوں گا۔“

وہ بولی۔ ”وہ صرف میری ہی نہیں، اَب تمہاری بھی ماما ہیں۔“

”میں تمہارا حکم مان لوں گا مگر اُس وقت جب تمہاری ماما کو پتہ چل جائے گا کہ میں واقعی اُس کا بیٹا ہوں۔“

وہ پہلی بار ماما سے نہیں مل رہا تھا۔ اِس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ سردار نے اُسے شانی کی ماں سے ملوایا تھا۔ محبت آمیز رویے کے باوجود عالمگیر اُسے پسند نہیں کرتا تھا۔ پسند تو وہ پہلے شانی کو بھی نہیں کرتا تھا۔

سردار فضل اور اُس کی بیوی بڑے تپاک سے ملے۔ اُسے ڈائننگ روم تک لائے۔ کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ کھانے کے دوران شانی کی ماما نے اُس سے بہت سارے سوالات کئے۔ باتوں کا بہاؤ ظاہر کرتا تھا کہ وہ عالمگیر سے محوِ گفتگو نہیں، بلکہ ہونیوالے داماد کو جانچ رہی ہے۔ پوچھنے لگی۔ ”مجھے سردار صاحب نے بتایا ہے کہ تمہارے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔“

وہ بولا۔ ”میں کسی سے نہیں، اپنے آپ سے تعلق رکھتا ہوں، اپنی ماں سے تعلق رکھتا ہوں۔ وہ آپ لوگوں کے نقطہ نظر سے کمین ذات کی عورت تھی۔“

شانی بولی۔ ”ماما! دراصل بات یہ ہے کہ عالمگیر کی ماں نے تمام رشتہ داروں ← تعلق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منقطع کر لیا تھا اِس لئے اِسے اپنے رشتہ داروں کا علم نہیں ہے۔“

ایسی باتوں پر عمومی طور پر یقین نہیں کیا جاتا۔ بیٹی کے یقین دلانے پر نہ چاہتے ہوئے بھی ماں باپ نے اعتماد کر لیا۔ کچھ دیر کی نشست کے بعد سردار فضل اُسے اپنے ساتھ لے کر لان میں آ گیا۔ اندھیرا پوری طرح ماحول پر چھا چکا تھا۔ لان میں لٹکے ہوئے بلبوں کی منتشر روشنی میں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یوں جیسے اکھاڑے میں اُترنے کے بعد پہلوان ایک دوسرے کی برداشت کا امتحان لیتے ہیں۔

سردار نے سکوت توڑتے ہوئے سلسلہ کلام کا آغاز کیا۔ ”عالمگیر! تمہیں اپنے بیٹوں کی طرح پالتا آیا ہوں۔ یہ جتلانا مجھے قطعاً اچھا نہیں لگتا کہ میں نے تمہیں موت کے گھاٹ سے بڑی کوششوں سے اُتارا ہے اور لاکھوں روپے خرچ کر کے تمہیں علم دین سے عالمگیر بنایا ہے۔“

وہ سردار کے بوڑھے چہرے پر نظریں گاڑے خاموش بیٹھا رہا۔ سردار نے بات آگے بڑھائی۔ ”میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ بیٹی، بیوی اور میں۔ بس اتنا سا ہی خاندان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے خاندان میں شامل کر لوں۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تمہاری عادات اور وفاداری بتلاتی ہے کہ تم کسی معمولی خاندان کے چشم و چراغ نہیں ہو بلکہ خاص ہو۔ خاص لوگوں سے خاص سلوک کیا جاتا ہے۔“

عالمگیر نے سگریٹ سلگایا۔ گہرا کش لیا اور دھواں بلب والے پول کی جانب چھوڑتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ”سردار! تکلفات کو چھوڑو اور سیدھی سیدھی بات کرو۔ مجھے کیا کرنا ہے؟“

سردار نے کچھ دیر تک سوچا۔ ہمت اور الفاظ یکجا کئے اور کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ضمنی انتخابات میں حصہ لے کر تم اسمبلی کے ممبر منتخب ہو جاؤ اور میں تمہیں اپنا بیٹا بنا لوں۔ کسی کو اپنانے کیلئے بہت کچھ دینا پڑتا ہے۔ میرا سب کچھ شاہانہ بی بی ہے۔ میری دولت، جائیداد اور کروڑوں کا بینک بیلنس اُسی کا ہے۔ اُسے تمہارے حوالے کر کے میں تہی دست ہو جاؤں گا؟ نہیں...... میں ایک بیٹے کا باپ بن جاؤں گا۔“

عالمگیر نے دل ہی دل میں اُس پر طنز کیا۔ ”بڈھے فرعون! تجھے پتہ ہی نہیں کہ تم لاکھوں روپے خرچ کر کے پھانسی گھاٹ سے چھڑا کر جسے لائے ہو وہ تمہاری زندگی نہیں، تمہاری

موت ہے۔ تم مجھے کیا دے سکتے ہو، تم تو خود کوڑی کوڑی کے محتاج ہونے والے ہو۔ میں شاہانہ کا شوہر بن چکا ہوں مگر تم کبھی بیٹے کا باپ نہیں بن سکو گے۔"

بظاہر سنجیدگی سے بولا۔ "کیا شاہانہ بی بی مجھ سے شادی پر رضا مند ہے؟"

"ہاں! اور مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ مطمئن اور آسودہ حال زندگی بسر کرے گی۔ تم دونوں میری نگاہوں کے سامنے رہو گے۔ اِس لئے میں بھی پرسکون رہوں گا۔ بیٹی کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں رہے گی۔"

وہ شادی پر رضامند ہو گیا مگر سیاست میں حصہ لینے سے کتراتا رہا۔ سردار نے اُسے بہتیرا سمجھایا مگر وہ نہ مانا۔ آخر کار سردار کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ بولا۔ "میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ نہ جانے تم سیاست سے اتنے الرجک کیوں ہو؟ سیاست اقتدار بخش شغل ہے۔ اقتدار نہ ختم ہونے والا نشہ ہے۔ ایک بار منہ سے لگ جائے تو عمر بھر ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔"

وہ ہنسا۔ "اِسی لئے تو میں اِس بوتل کو کھول کر منہ سے لگانے سے گریزاں ہوں۔"

گفتگو تمام ہو چکی تھی۔ سردار نے اُسے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم چاہو تو یہ خوشخبری دونوں ماں بیٹیوں کو سنا سکتے ہو۔"

وہ اُٹھا اور اندرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ سیڑھیوں تک پہنچا ہی تھا کہ سردار کے فون کا بزر بولنے لگا۔ وہ رُک گیا۔ سردار نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد بولا۔ "نمبر وہی ہے مگر تم وہی نہیں ہو۔ تم کون ہو؟"

پلٹ کر عالمگیر کی طرف دیکھا۔ اُسے اپنی جانب متوجہ پا کر ہاتھ کے اشارے سے بلانے لگا۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے قریب پہنچا۔ سردار نے فون کا وائڈ سپیکر آن کر دیا۔ آواز اُبھری۔ "تم خاموش کیوں ہو سردار فضل خان! میں نے تمہیں کہا ہے کہ تمہیں کال کرنے والا اَب دنیا میں نہیں رہا۔ مر گیا ہے۔ اُس کی جگہ پر داؤد سبحانی نے مجھے تعینات کیا ہے۔ سمجھے یا نہیں؟"

سردار نے کہا۔ "اِس کا مطلب ہے کہ تم بھی تھرڈ مین ہو؟"

"ہاں...... تھرڈ مین کسی کا نام نہیں ہوتا۔ یہ عارضی عہدہ ہے۔ سیٹھ سبحانی کا جس پر دل آئے، اُسے یہ عہدہ نواز دیتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جو کہنا چاہتے ہو جلدی سے کہہ دو۔ میں مصروف ہوں۔" سردار نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"تمہاری مصروفیت کی ایسی کی تیسی......" تھرڈ مین کا لہجہ خاصا غضب ناک ہو گیا۔ جھڑکتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ بات کرتے ہوئے احتیاط برتا کرو ورنہ میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

عالمگیر خود پر قابو نہ پا سکا۔ چیخ کر بولا۔ "کتے کے پلے! ہوش میں رہ کر بات کرو۔ میں تمہارے جیسوں سے نبٹنا بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

دوسری طرف سے استہزائیہ انداز میں کہا گیا۔ "ویل ڈن مسٹر عالمگیر! تم بہت اونچا اُڑنے لگے ہو۔ کیا سمجھتے ہو کہ مس شاہانہ کے کندھوں پر بیٹھ کر ہمارے قد کے برابر بلند ہو گئے ہو۔ بھول ہے تمہاری۔"

عالمگیر کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ اُس کے جواب دینے سے قبل ہی سردار فضل خان نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے فون میں کہا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ جو سبحانی کہتا ہے، وہ بتلاؤ۔"

"اپنے کتے کو پٹہ ڈال کر رکھو۔ سیٹھ چند دِن قبل تک تمہارے اور بڑی سرکار کے بنائے گئے شاہکار کو دیکھتا رہا۔ اَب وہ تمہاری بیٹی کے لہراتے جواں اعضاء کے رقص کو دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا ہے۔ تم بڑے عزت دار بنتے ہو۔ وضع دار بنتے ہو۔ تمہاری بیٹی یہاں کیا کچھ کرتی رہی ہے، دیکھو گے تو اپنے دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹ پھینکو گے۔ کہو! کب اور کہاں فلم پہنچاؤں؟"

یوں لگتا تھا جیسے سردار پر فالج گر گیا ہو۔ اُس کے بدن سے تمام لہو نچڑ گیا ہو۔ عالمگیر غور سے سردار کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اُٹھ کر سنبھالتے ہوئے تھرڈ مین سے مخاطب ہوا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم لوگ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے نہائت گھٹیا حرکتیں بھی کر سکتے ہو مگر داؤد سبحانی سے مجھے یہ توقع بہر حال نہیں تھی۔ تم وہ فلم اپنے پاس ہی رکھو۔ صرف اپنا مطالبہ پیش کرو۔ ماننے کا ہوا تو مان لیا جائے گا ورنہ میدان سجا کر ایک دوسرے کے بازوؤں کی قوت کا امتحان لیں گے۔"

تھرڈ مین کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔ عالمگیر نے سردار کو دیکھا اور

دل ہی دل میں بشیر خان کو داد دینے لگا۔ اُس نے اپنا لہجہ اِس خوبصورتی سے بدلا تھا کہ عالمگیر سے بھی پہچانا نہیں گیا۔

سردار لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ وہ شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''سردار! اپنے آپ کو سنبھالو۔ یہ احمقوں کی طرح آنکھیں بند کرنے کا وقت نہیں، کچھ کر گزرنے کا لمحہ ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہمیں تمام عمر پچھتانا پڑ جائے۔''

سردار کے حلق سے شکست خوردہ آواز برآمد ہوئی۔ ''میری بیٹی ایسی نہیں ہو سکتی...... میری بیٹی ایسی نہیں ہو سکتی......''

وہ بولا۔ ''وہ واقعی ایسی نہیں ہے سردار! تم خود پر کنٹرول کرو۔ میں جانتا ہوں کہ وہ معصوم ہے۔ میرے جانے سے پہلے اُس پر قیامت ٹوٹ چکی تھی اور دوسری قیامت یہ ڈھائی گئی کہ مرتے ہوئے ہر ہر لمحے کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لیا گیا۔ میں جب لاہور پہنچا تو اپنے داغدار دامن پر روتے ہوئے خودکشی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ تو میں نے اُسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیا اور سمجھایا کہ جو تم نے نہیں کیا، اُسے تمہارے نامہ اعمال میں درج نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی تمہیں ناکردہ گناہ کی پاداش میں اپنی جان گنوانے کی کوئی ضرورت ہے۔''

سردار نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ ......سوچنے لگا۔ ''شاید میرے سننے میں کوئی غلطی ہے؟''

بولا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو عالمگیر؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سردار!'' عالمگیر نے اُس کی جانب پیٹھ کر لی۔ وہ بیٹی کے اجڑنے کی داستان سناتے ہوئے دل گرفتہ باپ کی نگاہوں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ بولا۔ ''بم دھماکے کی بھگدڑ میں تمہاری بیٹی کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ اُسے کوئی ایسی ادویات دی گئیں کہ وہ ذہنی طور پر ماؤف ہو گئی۔ اُس کی بہکی ہوئی حرکات و سکنات کو اُن اوباش لوگوں نے محفوظ کر لیا۔ فلم کی کاپی اُنہوں نے شانی بی بی کو بھی بھیجی تھی۔ اُس کا تعاقب کوئی نہیں کرتا تھا، اُس فلم میں چھپی ہوئی موت اُس کے اردگرد رہ کر ڈراتی رہتی تھی۔ اسی پریشانی میں اُس نے مجھے لاہور بلوایا تھا۔ میں نے اُن لوگوں کو دوبارہ اُس کے قریب نہیں جانے دیا مگر پھر ایک قیامت پر تولنے لگی۔ ہمیں پتہ چلا کہ گناہ کے غلیظ پنجے تمہاری بیٹی کے پیٹ کے اندر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک پہنچ چکے ہیں۔ ہمیں ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا۔ یہ لمبی داستان ہے، نہ سنو تو بہتر ہے۔ ہمارے لئے یہی بہتر ہوگا کہ تم اُن کے مطالبے مانتے رہو اور ٹالتے رہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

سردار کی ہمت جواب دے گئی۔ ایک ٹک عالمگیر کو دیکھتا رہا۔ ہزاروں لوگوں کے سامنے سٹیج پر چڑھ کر کھلے جھوٹ بولتے ہوئے کبھی اُس کی زبان لڑکھڑائی نہیں تھی۔ اپنے زرخرید کے آگے سر جھک گیا۔ زبان نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کراہا۔ ''پ...... پانی...... مجھے پانی پلاؤ۔''

وہ بھاگ کر اندر گیا۔ پانی کا گلاس اُٹھائے باہر آیا۔ سردار نے لرزتے ہاتھوں سے گلاس تھاما۔ ہونٹوں سے لگانے لگا تو گرفت کمزور پڑ گئی۔ گلاس الٹ گیا۔ گردن اور سینہ تر بہ تر ہو گیا۔ جلدی سے اُٹھا۔ پھر جتنی تیزی سے اُٹھا تھا، لہرا کر اتنی ہی تیزی سے کرسی میں گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اُسے...... وہ شانی بی بی کو...... نہیں شانی کو بلاؤ۔''

وہ شانی کو بلا لایا۔ اُسے راستے میں صورت حال سے مختصراً آگاہ کر چکا تھا۔ سہمی سہمی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ''خود پر قابو پاؤ اور فیس کرنے کی کوشش کرو۔ ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ فلم بنانے والوں نے دیکھنے کیلئے نہیں بنائی تھی۔ چلو شاباش! میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

دونوں کو نظروں کے سامنے برابر کھڑے دیکھ کر سردار چیخا۔ ''شانی! یہ تم نے کیا کر دیا ہے؟ میری عمر بھر کی بنی ہوئی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔''

وہ زمین پر نظریں گاڑے خاموش کھڑی تھی۔ سردار اُٹھا۔ اُس کے مقابل آن کر کھڑا ہو گیا۔ ہذیانی انداز میں بولا۔ ''تم خاموش ہو۔ تمہاری خاموشی جرم کا اعتراف کر رہی ہے۔''

وہ پھر بھی سر جھکائے خاموش کھڑی رہی تو سردار کا ہاتھ اُٹھ گیا۔ ہاتھ طمانچہ بن کر شانی کے رخسار پر لگنے سے پہلے عالمگیر کی گرفت میں آ گیا۔ عالمگیر نے کہا۔ ''جوان بیٹی پر ہاتھ اٹھانا مقدر کو لات مارنے کے برابر ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ شانی کو اغوا کیا گیا تھا۔ اس سارے ڈرامے میں شانی کا کوئی کردار نہیں۔ اُس کی جگہ پر میں یا تم ہوتے تو کیا کر لیتے؟ خود کو سنبھالو سردار!''

وہ سنبھل نہ سکا اور گھاس پر گر گیا۔ دونوں نے مل کر اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور کمرے میں لے گئے۔ ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ مسیحا کے آنے سے پہلے ہی وہ اچانک شانت ہو کر سو گیا۔ عالمگیر نے نبض اور دھڑکن چیک کی اور شانی کو تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ صدمے سے بے ہوش ہوا ہے۔ ڈاکٹر دوائیں دے گا تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔''

وہ اپنے بے ہوش باپ کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگی۔ دل میں سوچنے لگی۔ ''کتنا اچھا ہے عالمگیر! اگر یہ نہ ہوتا تو پاپا مجھے جان سے مار دیتے۔ میرے لئے تو اُن کا ایک تھپڑ ہی کافی ہوتا۔ سچ کہتا تھا کہ میری طرف آنے والی ہر پریشانی کو سنبھال لے گا۔ میری پریشانیوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی سنبھالنا پڑ رہا ہے۔''

ماما چیختی چلاتی آندھی کی طرح کمرے میں وارد ہوئی۔ دونوں سے استفسار کرنے لگی۔ عالمگیر نے اُسے تمام رام کہانی سنا ڈالی۔ روز روز مرنے سے کہیں بہتر ایک ہی بار مر جانا ہوتا ہے۔ ماما کے دل کو جونہی تسلی ہوئی کہ اُس کے سر کا تاج بخیریت ہے تو وہ شانی پر بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹ پڑی۔ اُس کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر جھنجوڑنے لگی۔ روتی سسکتی پر طمانچوں کی برکھا برسانے لگی تو عالمگیر کو ڈھال بننا پڑا۔ چند ہی لمحوں میں اُس نے شانی کا چہرہ بُری طرح مسخ کر ڈالا تھا۔ ڈاکٹر کو ایک کی بجائے دو بے ہوشوں کو سُدھ بخشنا پڑی۔

سردار کو ہوش آیا تو دیوانوں کی طرح پھٹی پھٹی نگاہوں سے تینوں کو باری باری دیکھنے لگا۔ بیوی سفید بالوں میں جھریوں بھری انگلیاں لہراتے ہوئے تسلی دینے لگی۔ خود کو اور اپنے بطن سے جَنی بیٹی کو کوسنے لگی۔ وہ سنی ان سنی کرتا جا رہا تھا۔ جھنجوڑے جانے پر بولا۔ ''میں وہ نہیں رہا، کوئی اَور بن گیا ہوں۔ میرا نصیب میرا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔''

خالی خالی نظروں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''عالمگیر کہتا ہے کہ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اُس کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور میرا ہے۔ آگ لگانے والے کی انگلیاں ایک نہ ایک دن ضرور جھلس جاتی ہیں۔'' عالمگیر کی طرف متوجہ ہوا۔ ''عالمگیر! کیا تم ایسی حالت میں بھی اِس بے وقوف سے شادی کرنے پر تیار ہو؟''

وہ بیڈ پر سردار کی ٹانگوں کے پاس سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آہستگی سے بولا۔ ''میں ہی ایسا شخص ہوں جو اِس کی بے گناہی سے پوری طرح واقف ہوں۔ میں اِسے بیچ منجدھار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موجوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں شانی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

سردار کی آنکھیں پھیل گئیں۔ شانی بولی۔ ''پاپا! خود کو سنبھالیں۔ آپ ہیں تو سب کچھ ہے۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔''

''کچھ باقی رہا ہی نہیں تو غم کیسا؟'' سردار نے کہا۔ وہ باتوں باتوں میں خاصا سنبھل چکا تھا۔ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا سوچتا رہا پھر گلا کھنکار کر بولا۔ ''آج کیا تاریخ ہے؟''

بیوی نے جھٹ سے کہا۔ ''تاریخ کا پتہ نہیں، دن کا پتہ ہے۔ آج سوموار ہے۔''

بولا۔ ''یہی کافی ہے۔ تاریخ کا پتہ کرلو۔ آنے والے سوموار کو شانی اور عالمگیر کی دھوم دھام سے شادی ہو رہی ہے۔ تم جو کرنا چاہتی ہو، کرلو۔''

تینوں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عالمگیر بولا۔ ''سردار! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟''

وہ بولا۔ ''تاخیر کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہم ایک دن میں جہیز تیار کر سکتے ہیں۔ ایک دن میں بارات کی تیاری کر سکتے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''پھر بھی!''

سردار نے ہاتھ اُٹھایا۔ ہاتھ کو پورا کھول کر پنجہ بناتے ہوئے بولا۔ ''کہہ دیا ناں! اگلے سوموار کو شادی ہو گی۔ بس!''

بیٹی اور بیوی رونے لگیں۔ جھڑک کر بولا۔ ''کوئی مر گیا ہے کیا؟''

بیٹی باپ سے دیوانہ وار چمٹ گئی۔ ''پاپا! ایسے تو مُردوں کو گھر سے نکالا جاتا ہے۔ زمین بُرد کرنے میں جلدی دکھائی جاتی ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میری شادی کی نہیں، مجھے دفن کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔''

باپ نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ دو آنسو رخساروں پر لڑھک آئے۔ پیشانی کو چومتے ہوئے بولا۔ ''تم عالمگیر کو پسند کرتی ہو۔ وہ تمہیں چاہتا ہے۔ مجھے تم دونوں کی خوشیاں عزیز ہیں۔ آنے والے وقت سے پنجہ آزمائی کرنے کیلئے تمہیں ایک ہونا پڑے گا۔ ایک کرنے کیلئے میں نے ہنگامی طور پر یہ فیصلہ کیا ہے۔''

اُس کے فیصلے پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ سردار نے کہا۔ ''اَب تم اپنے اپنے کاموں سے نبرد آزما ہو جاؤ اور مجھے تنہائی دے دو۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' پھر عالمگیر کی

طرف بالخصوص متوجہ ہو کر بولا۔ ''شادی کے اہتمام میں کسی قسم کی کمی قابلِ برداشت نہیں ہوگی۔ وسیب کے تمام معززین کو دعوت دو۔ جشن کا انتظام کرو۔''

تینوں کمرے سے باہر نکلے۔ ماما دونوں پر خفا سی نگاہ ڈال کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دونوں کاریڈور میں کھڑے رہے۔ اطراف میں کسی کو نہ پا کر عالمگیر سے لپٹ کر سسکنے لگی۔ ''میں نے تمہارا ساتھ خدا سے مانگا تھا مگر نہیں جانتی تھی کہ تمہیں پانے کی کتنی بڑی قیمت چکانا پڑے گی۔ ہائے میرے عالمگیر! میں نہ ادھر کی رہی، نہ اُدھر کی۔ میں نے کچھ نہیں کیا مگر سب لوگوں کی نظروں میں اپنے لئے طنز اور اہانت دیکھ کر جل کر کوئلہ ہو جاتی ہوں۔ کیا کل تم بھی ایسے ہی آنکھیں پھیر لو گے؟''

کورٹ میں پڑھائے جانے والے نکاح سے پہلے سوچا کرتا تھا کہ باپ کے بعد ماں بیٹی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ دونوں کو سسکا سسکا کر مارے گا۔ نکاح کے بعد اُس کی سوچ نے انقلابی انگڑائی لیتے ہوئے اُس کے ارادوں پر مٹی کا گاڑھا لیپ پھیر دیا تھا۔ سینے سے لگ کر روتی ہوئی کمزور جان کو دلاسہ دینے لگا۔ ''نہیں میری جان! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ مجھے صرف چند دن درکار ہیں۔ پھر دنیا کا کوئی شخص تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ تمہارے پاپا اور ماما بھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ مجھ پر یقین رکھو۔''

''یقین ہی تو زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ میرے اندر بچا ہی کیا ہے؟'' وہ سسکی۔

عقب میں آہٹ ہوئی۔ عالمگیر نے گردن موڑ کر دیکھا۔ کھلے دروازے میں سردار شکست خوردہ انداز میں کھڑا دونوں کو گھور رہا تھا۔ عالمگیر نے گھبرا کر شانی کو خود سے الگ کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔ سردار نے رُخ پھیر لیا اور کہا۔ ''شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں مگر یہ بوڑھی آنکھیں سوموار تک دنیا کو دیکھتے رہنا چاہتی ہیں۔ احتیاط کرو۔''

دونوں سر جھکائے سردار کے کمرے سے دور ہو گئے۔

روایات جاگ اُٹھیں۔ شانی کو سات پردوں میں چھپا دیا گیا۔ چاہنے والا انتظام و انصرام میں جُت گیا۔ آسان دکھائی دینے والا کام نہایت مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ہفتے میں اتنی بڑی تقریب کی تیاری ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے مترادف تھی۔ اُس نے متروک حویلی سے تمام کارندوں کو بلا لیا تھا۔ بیلے سے بشیر خان اور شبر علی بھی پہنچ گئے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ایک دن مٹھی میں دبی ریت کی طرح سرکتے گئے۔ اتوار کی شام کو سردار اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا بیتے ماہ و سال کا احاطہ کر رہا تھا۔ گھر میں ڈھولک کی آوازیں بھری ہوئی تھیں۔ شور و غوغا...... ہلڑ بازی...... بعض اوقات تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دور پار کے رشتہ دار اکٹھے ہو چکے تھے۔ اقتدار کے دنوں کے تمام احباب اپنی فیملیوں سمیت آ چکے تھے۔ وہ کبھی مسکرانے لگتا، کبھی دل ہول کھانے لگتا۔ ایسے میں اُس کے فون کا بزر بجا۔ روشن سکرین پر دیکھا تو یکبارگی سے چہرہ تاریک ہو گیا۔ تھرڈ مین رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نفرت اور بے بسی کے ملے جلے انداز میں بولا۔ ''ہاں سُن رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟''

تھرڈ مین کی آواز سنائی دی۔ ''تم پرانے سیاسی آدمی ہو۔ بساط پر پہلو بدل بدل کر چالیں چلتے رہتے ہو۔ ریس کورس میں ایک گھوڑے کے پٹ جانے پر دوسرا میدان میں اُتار لیتے ہو۔ بیٹی کے دامن پر لگے داغ کو دھونے کیلئے تم نے فوری طور پر دھوبی کا بندوبست کر لیا۔ واہ کیا کہنے!''

وہ بیزاری سے بولا۔ ''تو تمہیں پتہ چل گیا۔ تمہیں یہ بھی پتہ ہوگا کہ اس وقت میں کتنا مصروف ہوں۔ جو کہنا ہے، جلدی سے کہو اور جان چھوڑو۔''

''اوکے مسٹر فضل خان!'' تھرڈ مین نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''داؤد بھائی کے پیغام کو تم تک پہنچانے کیلئے فون کر رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ اِس سوموار کو تم بیٹی کی شادی کر رہے ہو۔ تم پر احسان کرتے ہوئے ہم اِس سوموار کیلئے جاری کئے جانے والے حکم کو اگلے سوموار پر ٹال دیتے ہیں۔ اگلے سوموار تک تم موت کو اپنے ہاتھوں گلے لگا لو۔ اگر تم خودکشی نہیں کرو گے تو تمہیں قسطوں میں قتل کر دیا جائے گا۔ پہلی قسط میں تمہیں عدالت میں گھسیٹا جائے گا۔ دوسری قسط میں تمہیں قتل کے الزام میں تھانے پہنچایا جائے گا۔ اِسی طرح اُس پر ملک امجد کا غصے سے لبریز جام انڈیلا جائے گا۔ آخر پر تمہاری بیٹی کے بدن کو پورے ملک کیا، پوری دنیا میں تمہارے حوالے سے نشر کر دیا جائے گا۔ اگر تم پھر بھی چلو میں پانی بھر کر بے غیرتی کی موت نہیں مرو گے تو تمہیں اندھی گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔''

اُس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اُس خبیث، داؤد سبحانی کو مجھ سے دشمنی کیا ہے آخر؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اتوار کے دن، تمہاری خودکشی سے ایک دن پہلے، تمہیں دشمنی کی وجہ بھی بتلا دی جائے گی۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ تم بغیر وجہ جانے دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔" تھرڈ مین نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ کافی دیر تک خالی خالی نگاہوں سے موبائل ہاتھ میں تھامے دیکھتا رہا۔ موبائل کی سکرین چند سیکنڈوں کے بعد بجھ گئی مگر سردار کی نظریں سکرین میں نظر آنے والی بھیانک موت کو دیکھ سکتی تھیں۔

گزشتہ ماہ میں اُس نے بارہا سوچا تھا کہ انڈرورلڈ کے داؤد سبحانی کو اُس سے کیا گلہ پیدا ہو گیا تھا حالانکہ وہ اُسے جانتا ہی نہیں تھا۔ آج تک اُس سے ملاقات یا تعارف نہیں ہوا تھا۔ بیٹھے بیٹھائے مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ جان بچانے کیلئے منت ساجت کا ارادہ کر کے تھرڈ مین کا نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ فون آف تھا۔ ناکامی پر جھنجلا گیا۔ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ بے بسی، پریشانی پر مستزاد تھی۔ کبھی موت کو یاد نہیں کیا تھا۔ جو یاد نہ آئے وہ پریشان بھی نہیں کرتا۔ پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ زندگی کتنی پیاری شئے ہے۔ پھر سوچنے لگا۔ "میں کتنا بدقسمت ہوں۔ جان بچا سکتا ہوں مگر بچانے کے چکر میں اپنی اور اپنی بیٹی کی عزت کو بیچ چوراہے برہنہ کر بیٹھوں گا۔ شاید زندہ پھر بھی نہ رہ سکوں۔ جو اتنا کچھ کر سکتے ہیں، وہ ایک گولی بھی چلا سکتے ہیں۔ گولی اندھی ہوتی ہے۔ اندھے کو کیا پتہ کہ وہ کس سے ٹکرانے لگا ہے۔"

عقب میں سمندر، سامنے جنگل...... داؤد سبحانی نے زندگی میں پہلی مرتبہ اُس پر زندگی تنگ کر دی تھی۔ موت بذاتِ خود گلا تنگ کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ کوٹھی میں گونجنے والی ڈھولک کی تھاپ بھی خال خال سنائی دیتی تھی۔ سکت نہ رہی تو بے دم سا ہو کر بیڈ میں گر گیا۔

اُن کا نکاح عدالت نے پڑھا دیا تھا۔ نکاح پر نکاح نہیں پڑھایا جا سکتا مگر بوڑھا قاضی لوگوں کو دکھانے کیلئے رجسٹر کے پرت پر پرت کالے کر رہا تھا۔ شریعت کی لاٹھی سے دونوں کو تین تین مرتبہ ہانک کر عشق کی چراگاہ تک لے گیا۔ مبارک باد کی صدائیں، برتنوں کی جھنکار، بچوں کا شور و غل...... شام تک سب کچھ ماند پڑ گیا۔ کوٹھی کے گیٹ پر فرلانگ بھر لگی کاروں کی لمبی لائن غائب ہو گئی تو وہ دلہا کا مخصوص لباس پہنے اپنی رانی کے قرب میں آ کر گر سا گیا۔

دیکھی بھالی دلہن تھی۔ دلہے نے بارہا مرتبہ چھو کر، چوم کر اور جھوم کر دیکھ رکھا تھا مگر بیا

چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھائے اور آنکھوں میں جھانک کر دل کی دنیا تہہ و بالا کر دے۔ کچھ دیر گزر گئی تو بے قرار ہونے لگی۔ "ہائے اللہ! پردہ ہٹاتا کیوں نہیں؟ چاند کو دیکھنے والے کی آنکھیں بند کیوں ہیں؟ ہاتھ بندھے ہوئے کیوں ہیں؟ اگر وہ مجھے دیکھنے کیلئے بے قرار نہیں ہے تو مجھے ہی گھونگھٹ کو پرے پھینک کر دیدار کا جام پی لینا چاہیے۔"

ہاتھوں میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی۔ لاج نے ہاتھ پکڑ لیا۔ شرما کر سوچنے لگی۔ "چاند بدلیوں کی اوٹ سے خود نہیں نکلتا، نکال کر دیکھا جاتا ہے۔ میں اپنے ہاتھوں سے پردہ کیوں ہٹاؤں؟ جسے دیکھنے کی طلب ہوگی، وہ خود ہی بدلیوں کو ہٹا دے گا۔"

عالمگیر کہنی کے بل اُس کے گھٹنوں کے پاس لیٹا ہوا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اُس نے سر اُٹھایا۔ بڑے سے گھگھرے میں اُس کے وجود کو تلاش کرنے کیلئے کھوجتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ ہاتھ کی حرکت سے اُس کے مقام کا پتہ چلا تو اُس نے جھٹ سے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ڈر سی گئی۔ "ہائے! یہ کیا کر رہا ہے؟"

ڈر کی عمر سمٹ گئی۔ جب چاہنے والا دیوانہ وار اُس کی کلائی کے تل کو چومنے لگا تو وہ بے خود اور سرشار سی ہو کر اُس پر کٹے ہوئے شہتیر کی مانند ڈھے گئی۔ ایسے میں اچانک بجلی چلی گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ بجلی غیر متوقع طور پر گئی تھی اِس لئے کوئی متبادل بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔

کون گھونگٹ اُٹھاتا ہے؟ کون اپنا آپ دکھاتا ہے؟ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اِن باتوں کا پتہ نہیں چلتا۔ دیوانہ کہہ رہا تھا۔ "ابھی تو چاند بدلیوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ آدھی جھلک نے زمانے کی روشنیوں کو شرما کر چھپ جانے پر مجبور کر دیا۔ اگر پورا چاند نکل آتا تو کیا ہو جاتا؟ شاید سب کچھ ہی خاکستر ہو جاتا۔"

شانی کی خمار آلود آواز اُبھری۔ "کیا تم بھی؟"

"اِس نار بھری ناری کے سامنے میری اوقات ہی کیا ہے؟"

عروسی ملبوس کی سرسراہٹ ساز بن گئی۔ دھڑکنیں سُر بن کر پورے کمرے کو دھڑکانے لگیں۔ دو تشنہ کام وجود گیت کی لے پر رقصاں ہو گئے۔

شب کے پچھلے پہر میں بجلی آ گئی۔ یوں لگا جیسے زندگی کے کھلونے کا بٹن دبا دیا گیا ہو۔ نکل آنے پر آٹومیٹک واٹر پمپ چل پڑا۔ اُس میں کوئی فنی خرابی تھی جس کی وجہ سے کافی

زیادہ آواز پیدا کرتا تھا۔ رات کے سکوت میں پمپ کی ڈراؤنی آواز نے دونوں کو جگا دیا۔ دونوں نے آنکھیں مل مل کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شانی شرما کر ہنسنے لگی۔ وہ جی جان سے نثار ہوتے ہوئے بولا۔ ”آئی لو یو شانی! آئی لو یو......“

وہ منہ چھپا کر بولی۔ ”آج سے پہلے کبھی بھی اِس پمپ کی آواز اچھی نہیں لگی۔“

وہ مسکرایا۔ ”تمہارے باپ کو تو شاید آج بھی بری لگی ہوگی۔“

وہ چونک کر اُس کی جانب مُڑ آئی۔ شکوہ کناں نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”رنگ میں بھنگ ڈالنے کی عادت بہت بری ہوتی ہے۔ وہ اَب صرف میرے ہی نہیں، تمہارے بھی پاپا ہیں۔ اُن کا نام اَدب سے لیا کرو۔ اگر وہ نہ مانتے تو شاید......“

وہ بولا۔ ”اُن کے نہ ماننے پر بھی میں تمہیں حاصل کر لیتا۔“

”یہ کس نے کہا ہے کہ تم نے مجھے حاصل کیا ہے؟“ وہ شرارت سے بولی۔ ”دل سے پوچھو۔ وہ بھی کہے گا کہ تم نے نہیں، میں نے تمہیں پایا ہے۔“

”اچھا بابا مان لیتا ہوں کہ تم نے ہی سب کچھ کیا ہے۔“ وہ اُس کی ننھی سی ناک کو پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایک بات تو بتاؤ۔ تم نے اپنے باپ کو شادی پر رضامند کیسے کیا؟“

وہ آنکھیں بند کئے چھوٹے چھوٹے سانس لیتی رہی۔ شاید دل میں کوئی فیصلہ کرنے لگی تھی۔ وہ بولا۔ ”اَب بول بھی پڑو۔“

آنکھیں پوری کھول کر اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”پہلے تم ایک سوال کا جواب دو۔ تمہیں میرے پاپا سے اتنی نفرت کیوں ہے؟“

وہ بولا۔ ”مجھے تمہارے باپ سے نہیں، اُس جیسے ہر سیاسی فرعون سے نفرت ہے۔ مجھے یہ جھوٹے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ پیٹ پالنے کیلئے مجبوراً تمہارے باپ کے پاس کام کر رہا ہوں۔“

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ وہ غیر متوقع ردِعمل پر جھنجلا کر بولا۔ ”کیا مصیبت ہے؟ میں نے تمہیں کوئی لطیفہ سنایا ہے جو یوں منہ پھاڑ کر ہنسنے لگی ہو؟“

وہ بدقت تمام ہنسی روک کر بولی۔ ”جھوٹے کو جھوٹ بولنے والے لوگ پسند نہیں۔ ہے نا؟“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔ ”میں جھوٹا ہوں؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ ”ناں بابا! تم جھوٹے نہیں ہو۔ بس کبھی کبھار اپنی بیوی کے سامنے جھوٹ بولنے کا شوق پورا کرتے ہو۔ یہ کوئی خاص بری بات بھی نہیں۔“

”میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟“ اُس کا غصہ بڑھ رہا تھا۔

وہ آنکھیں آدھی میچ کر اُسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ بولی۔ ”پچھلی باتوں کو چھوڑو۔ میں نئے سوال کرتی ہوں۔ تم نئے جھوٹ بولو۔“

وہ کہنیوں کے بل کھسک کر تھوڑا اونچا ہو کر اُسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ بولا۔ ”چلو! اپنا شوق پورا کرلو۔“

وہ بولی۔ ”میرے مرحوم چچا کا نام محمد خان تھا۔ تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟“

وہ چونک پڑا۔ دل پر گھونسا لگا۔ استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔ ”کیا مطلب؟ یہ کیا سوال ہوا؟“

وہ چڑانے کے سے انداز میں بولی۔ ”تم اتنے بھی بے وقوف نہیں ہو کہ میرے سوال کو سمجھ ہی نہ سکو۔“

وہ طوعاً و کرہاً بولا۔ ”جب میرا نام علم دین تھا، تب میرے باپ کا نام بھی محمد خان تھا۔ جب مجھے عالمگیر بنا دیا گیا تو میرے باپ کا نام بدل گیا۔ اَب اُس کا نام جہانگیر ہے۔“

وہ بولی۔ ”میری چاچی کا نام رضیہ تھا جسے گھر والے پیار سے رَجو کہتے تھے۔ تمہاری ماں کا نام کیا ہے؟ علم دین کی ماں کا نام بتانا، عالمگیر کی ماں سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔“

وہ اُٹھ کر اُسے پریشانی کے عالم میں دیکھنے لگا۔ بولا۔ ”تم کھل کر بات کرو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”میں تمہاری بیوی ہوں۔ مجھے حق حاصل ہے کہ میں اپنے مرحوم سسر اور ساس کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ صبح مجھ سے ملنے جلنے والیوں نے بہت سی باتیں پوچھی ہیں۔ جانتی ہوں گی تو بتا دوں گی۔ لاعلمی کی صورت میں جھوٹ پر جھوٹ بولتی رہوں گی۔ جھوٹ ایک نہ ایک دن چاشنی کھو بیٹھتا ہے۔“

وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ”مگر تم مجھ سے میرے ماں باپ کے بارے میں پوچھتے ہوئے اپنے چچا چچی کا تذکرہ کیوں کرتی ہو؟“

وہ ہنسنے لگی۔ قریب ہو کر اُس کی جھولی میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ بولی۔ ''اِس لئے کہ تم میرے مرحوم چچا محمد خان کے بیٹے ہو۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے باپ کو زمین کے حصول کیلئے پاپا نے خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔ تم اور تمہاری ماں دونوں بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔''

وہ جھولی میں سر رکھ کر لیٹی ہوئی اُس قاتلۂ جاں کو دیکھنے لگا جس نے بڑے عام سے لہجے میں اُس کو سرِعام ننگا کر دیا تھا۔ وہ اَب تک یہی سوچتا چلا آ رہا تھا کہ سردار فضل سمیت گھر کا ہر فرد اُس کی اصلیت سے بے خبر ہے۔ بے خبری اُس کیلئے فائدہ مند تھی۔ خبر نقصان دہ تھی۔

وہ ہکلا کر بولا۔ ''تت...... تم اور کیا جانتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تم جھوٹے ہو یا نہیں ہو؟''

وہ خاموش رہا تو پھر آنکھیں پوری کھول کر اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم نے کہا تھا کہ تمہیں ہر سیاسی شخص سے نفرت ہے، صرف پاپا سے نہیں۔ اَب بتاؤ ناں مجھے! کیا تم اپنے باپ کے قاتل سے نفرت نہیں کرتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہاں! میں جھوٹا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''یہ اعتراف بھی کر لو کہ تمہاری محبت بھی جھوٹی ہے۔''

وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں۔ میری محبت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔''

وہ بولی۔ ''تو سنو! تم سمجھتے ہو کہ پاپا کو اپنے سیاسی حریفوں کی چالوں کا جواب دینے کیلئے تمہاری ضرورت تھی تبھی اُنہوں نے تین لاکھ روپے جیلر کو دے کر تمہیں جیل سے نکالا اور تین چار لاکھ روپے خرچ کر کے تمہارے کاغذات بنوائے۔ ہے ناں؟ تم نے یہ نہیں سوچا کہ اتنی بڑی رقم خرچ کر کے وہ تمہارے جیسے دس بندے خرید سکتے تھے۔ تم سمجھتے ہو وہ تمہاری قابلیت اور دلیری کے باعث تم پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ تم نے یہ خیال نہیں کیا کہ کتنے تعلیم یافتہ جوان ہاتھوں میں بڑی بڑی ڈگریاں تھامے ہماری کوٹھی کے چکر پر چکر لگاتے رہتے ہیں اور پاپا کے پاس اُن سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا۔''

وہ سانس لینے کیلئے رُکی پھر گویا ہوئی۔ ''تم سمجھتے ہو کہ اُنہیں تمہاری بہادری اور وفاداری پر اعتماد تھا اِس لئے اُنہوں نے تمہیں میری حفاظت کیلئے لاہور بھیجا۔ یہ کام تو دوسرے لوگ بھی کر سکتے تھے۔ مگر تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ وہ سوچتے تھے کہ خون کیلئے خون ہی جوش مارتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ تمہیں تو کسی بات کا علم نہیں ہے۔ میں اور وہ...... دونوں ہی تمہارے جھوٹ پر جھوٹ سنتے رہے اور آنکھیں بند کر کے یقین کرتے رہے۔''

یوں لگ رہا تھا جیسے عالمگیر کا اپنے قلب و بدن پر اختیار نہیں رہا تھا۔ مشینی سے انداز میں بولا۔ ''تم اور کیا کچھ جانتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''بتاؤں؟''

''ہاں!''

''سننے کا حوصلہ رکھتے ہو؟''

''پلیز! کہتی رہو۔ مجھ میں بڑا حوصلہ ہے۔''

''پاپا گزشتہ کئی برسوں سے تم ماں بیٹا کو تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں اُن کی واحد رازدار تھی۔ ماما کو اُنہوں نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ جب اُنہیں تمہارا پتہ چلا، تم اُس وقت دوہرے قتل کے ثابت شدہ جرم پر موت کی سزا پا چکے تھے۔ انہوں نے بڑی سرکار کی منت سماجت کی۔ تمہیں چھڑانے کیلئے اپنی سیاسی پارٹی بدلی۔ بڑی سرکار نے اُن کا رابطہ جیلر سے کرایا۔ تمہیں چھڑا کر یہاں لے آئے۔ وہ دل میں ڈرتے تھے کہ اگر تمہیں اُن کی اصلیت کا پتہ چل گیا تو تم منتقم مزاجی میں کوئی بڑا قدم اُٹھا بیٹھو گے۔ اور کچھ نہ کر سکے تو دُور نکل جاؤ گے۔''

وہ کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گئی۔ وہ بولا۔ ''رُکو مت۔ بولتی رہو۔''

''وہ اپنے بھائی کو قتل کرنے پر بہت پچھتاتے تھے۔ میں نے اُنہیں اپنے بھائی کی تصویر کو سینے سے لگا کر آدھی آدھی رات تک روتے دیکھا ہے۔ وقت اُن کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ نکلے ہوئے وقت پر اُن کا رونا مجھے گراں گزرتا رہا اور میں اُن کے آنسو پونچھتی رہی۔ تمہیں یہاں لے آنے کے بعد کبھی نہیں روئے۔ اُنہوں نے مجھے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تمہاری شادی عالمگیر سے ہو گی۔ کب اور کیسے؟ یہ فیصلہ وقت اور قسمت پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نہیں مانتی تھی۔ ماما نے بھی اِس فیصلے کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اتنی بڑی جائیداد کو کسی غیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بھی اُن کے خیال کے مطابق اِس تمام دولت پر تمہارا حق بنتا ہے۔''

کچھ توقف آیا۔ تھک گئی تھی۔ گلا خشک ہونے لگا تو اُٹھ کر پانی پینے لگی۔ عالمگیر نے

ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگا۔ اُس کیلئے پانی بھر لائی۔ وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گیا۔ بولا۔ ''تم بات جاری رکھو۔''

وہ اُس کے گھٹنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ''وہ چاہتے تھے کہ میری اور تمہاری شادی ہو جائے تو وہ سیاست سے ریٹائرمنٹ لے کر گوشہ نشین ہو جائیں۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ جوانی میں بھائی کی کمی کا احساس زیادہ قوی نہیں تھا۔ بڑھاپے اور بیٹے کی کمی میں بھائی کے قتل نے پشیمانی اور دُکھ کے احساس کو حد سے متجاوز کر دیا تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے مجھے تاکید کرتے تھے کہ عالمگیر کو شادی پر رضامند کرو۔ میں نہیں مانتی تھی۔ تمہیں قریب سے دیکھا تو مجھے بھی اُن کا ہم خیال ہونا پڑا۔ تم محبت کرنے اور چاہے جانے کے لائق انسان ہو۔ اور ہاں! پاپا نے تمہارے باپ کی زمین اپنے نام نہیں کرائی۔ اُس زمین کی آمدنی کو جمع کرتے رہتے، پھر اُس سے زمین خرید لیتے۔ یوں تمہاری وراثتی زمین میں تین مربعوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ اُنہوں نے تو تمہیں یہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ تمہارے باپ کی زمین کو اپنے نام منتقل کرانے کیلئے اُنہیں علم دین کو پولیس مقابلے میں مروانا پڑا۔ جب اُن کے نام ہو گئی تو انہوں نے تمام اراضی تمہارے نام کرا دی۔ وہ اپنے پاپ کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ اَب وہ مطمئن ہیں کہ اُنہوں نے تمہاری محرومیوں کا مداوا کر دیا ہے۔ اُن کے پاس ایک ہی قیمتی شئے تھی...... مَیں...... مجھے تمہارے حوالے کر کے شاد اور مطمئن ہو گئے ہیں۔''

اُس کی ساری خوش فہمیاں آن کی آن میں ریت کے گھروندے کی طرح مسمار ہو گئی تھیں۔ لیٹ کر آنکھیں موند کر سوچنے لگا۔ سردار فضل کا چہرہ بار بار اُس کی نظروں میں چکرانے لگا۔ وہ کیا تھا؟ وہ کیا سمجھتا رہا اور نکلا کیا؟...... جس سے سب کچھ چھین کر حساب برابر کرنا چاہتا تھا، وہ پہلے سے ہی دینے پر تیار بیٹھا تھا۔ پھر اُس کی تمام تر محنت کیا ہوئی؟ اگر وہ کچھ بھی نہ کرتا تو یہ سب کچھ اُسے ملنا ہی تھا۔ اُس نے جو کیا غلط کیا تھا۔ ساری محنت رائیگاں گئی۔ یہی سوچ اُسے پریشان کئے دے رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''کیا تمہارے باپ کو یہ ڈر نہیں تھا کہ مجھے جونہی پتہ چلے گا، میں اُسے قتل کر دوں گا؟''

''ہاں! اُنہیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ تم کوئی بھی جذباتی قدم اُٹھا سکتے ہو۔ میں نے بھی اُنہیں بارہا سمجھایا مگر وہ نہیں مانے۔''

وہ بڑبڑایا۔ ''ہاں شانی! میں جھوٹا نہیں، بہت بڑا جھوٹا ہوں۔ میں نے تم سے کئی باتیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھپائیں مگر ایک بات ہے...... میں نے محبت میں کوئی کھوٹ نہیں رکھی۔ کوئی ملاوٹ نہیں کی۔''

وہ جھینپ کر اُس سے لپٹ گئی۔ اُس کے برہنہ کندھے پر اپنے سرخ ہونٹ رگڑ کر لپ اسٹک اتارتے ہوئے بولی۔ ''جیسے محبت کو میرے ہونٹوں پر جمی ہوئی لپ اسٹک گوارا نہیں ہوتی اور اس کی تہہ کو اتار دیتی ہے ایسے ہی تم بھی خود کو جھوٹ کی آلائشوں سے پاک کر دو۔ میں جھوٹ نہیں بولتی، پرسکون رہتی ہوں۔ اپنا دُکھ تمہارے حوالے کر کے مطمئن ہو جاتی ہوں۔ تم بھی ایسا ہی کیا کرو۔ اور ہاں! اگر تم جھوٹ بھی بولو تو مجھے یقین آ جائے گا۔ سچے دل سے نہ سہی، جھوٹی زبان سے ہی مجھے محبت کے اقرار کا ٹانک پلاتے رہو تو میں شانت اور قوی رہوں گی۔''

عالمگیر کے پاس کوئی دلاسہ، کوئی یقین یا کوئی سچ نہیں تھا جسے اپنی محبوبہ کی سماعت میں انڈیل کر۔ تہی دامنی کے عالم میں اپنی آنکھیں موندے لیٹا رہا۔ دل میں گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت کچھ ہو چکا تھا، بہت کچھ ہونے والا تھا۔ کیا؟ یہ پتہ نہیں چلتا تھا۔

اُس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے بولا۔ ''تم ایک بات مانو گی؟''

''نہ ماننے کی ہوئی تب بھی مان لوں گی۔'' وہ اُس کی نقل کرتے ہوئے بولی۔

وہ مسکرایا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''تم میری اجازت کے بغیر اپنے باپ کو نہیں بتاؤ گی کہ اُس نے مجھے سب کچھ بتلا دیا ہے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''تم دیکھ لو گی۔''

''پھر بھی؟''

اُس کا ذہن بدلنے کو بولا۔ ''پرسوں لوکل باڈیز کے انتخابات ہیں۔ ملک فرید کے بیٹے کے مقابلے میں کوئی کھڑا نہیں ہوا اور وہ بلا مقابلہ جیت چکا ہے۔ سنا ہے کہ وہ اتوار کو اپنے بیٹے ملک امجد کی شادی چوہدری باسط کی بیٹی بتول سے کر رہا ہے۔ کیا اُس نے سردار فضل کو بُلایا ہے؟''

''سردار فضل نہیں۔ پاپا!''

"چلو پاپا ہی سہی......"

وہ بولی۔ "ہاں! اُن کا شادی کارڈ موصول ہوا تھا۔ ماما کہہ رہی تھیں کہ امجد کی مہندی پر مجھے خصوصی طور پر اُنہوں نے بلایا ہے۔" وہ بولی۔

"تم جاؤ گی؟"

"ہاں! اگر تمہیں برا نہ لگا تو......"

"مجھے کیوں برا لگے گا؟"

"شوہر بہت بگڑی ہوئی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب جی چاہا، بین لگا دیا۔ جب جی چاہا نواز دیا۔" اُس کی آواز میں شرارت، بے خودی اور دعوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔

"یہ بات ہے؟" وہ مچل گیا۔ اُسے یکبارگی سے یاد آیا کہ وہ شوہر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کا حقیقی کزن بھی ہے۔

❁❁❁

سردار فضل اپنی بیوی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ دیکھنے والے مُردنی کو سنجیدگی سے تعبیر کر رہے تھے۔ بڑی فوروہیل جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر عالمگیر جبکہ اُس کے برابر شانی براجمان تھی۔ سبھی تیاری کر کے ملک امجد کی رسمِ حنا میں شرکت کیلئے جا رہے تھے۔ سردار فضل کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ صبح سے کئی مرتبہ انگلیوں پر حساب لگا کر یقین کر چکا تھا کہ آج اتوار کا دن تھا۔ سیٹھ داؤد سبحانی کی دی گئی مہلت کا آخری دن تھا۔ بڑی سڑک سے اُتر کر لنک روڈ پر چڑھے تو سردار کے فون کا بزر بول پڑا۔ سردار نے نمبر دیکھا۔ تھرڈ مین کا نمبر دیکھ کر تیوری چڑھ گئی۔ فون آن کر کے بولا۔ "میں سردار فضل بول رہا ہوں۔ کیا بات ہے؟"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "سردار! تمہیں دی جانے والی مہلت ختم ہو چکی ہے۔ داؤد سبحانی نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے۔"

سردار نے اطمینان کا سانس لیا، بولا۔ "اَب کیا کہتا ہے وہ؟"

"تمہاری خوبصورت چمکتی دمکتی گاڑی میں بہت طاقتور بم فٹ کر دیا گیا ہے۔ اِس بم کا ریموٹ میرے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے آنے والی گرے کلر کی ٹویوٹا کار میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھا ہوا ہوں۔ میری انگلی کی ذرا سی جنبش تمہارے پورے خاندان کے پرخچے اُڑا سکتی ہے۔" تھرڈ مین نے بڑے سفاک لہجے میں کہا۔

سردار نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ گرے رنگ کی کار دو تین سو فٹ کے فاصلے پر دوڑتی آ رہی تھی۔ سردار کی آنکھوں میں موت کی وحشت ناچنے لگی۔ گھبرا کر باری باری تینوں کو دیکھنے لگا۔ عالمگیر نے عقب نما میں جھانک کر دیکھا۔ سردار کی متغیر حالت دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے سردار؟ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں؟"

سردار نے جواب دینے کی بجائے فون کا وائڈ سپیکر آن کر دیا۔ تھرڈ مین کی بھاری سخت آواز گاڑی میں گونجنے لگی۔ "سردار! تم جواب کیوں نہیں دیتے؟ ...... کیا موت کے خوف سے گھگی بندھ گئی ہے تمہاری؟"

چاروں فون کی طرف متوجہ تھے۔ سردار نے کہا۔ "خدا کیلئے ایسا مت کرو۔ میں سیٹھ سبحانی کی ہدایات پر عمل کروں گا۔"

عالمگیر نے فون کے قریب منہ کر کے کہا۔ "ابے کتے! کیا دھمکیاں دیتا ہے؟"

تھرڈ مین نے اپنے بات دہرائی۔ دھمکی دی۔ "تم چھلانگیں لگانے کی کوشش بھی مت کرنا۔ گاڑی میں نصب شدہ بم پچاس فٹ تک مار کرتا ہے۔ تمہارے پُرزے ہوا میں میلوں دور تک بکھر جائیں گے۔"

عالمگیر کی آنکھوں سے پریشانی مترشح ہونے لگی۔ بولا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

"تم گاڑی کو سردار کے خفیہ ٹھکانے پر لے چلو۔ دریا کے کنارے واقع متروک حویلی میں۔ باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔" تھرڈ مین نے کہا۔ "اِس زعم میں مت رہنا کہ وہاں تمہارے ساتھی موجود ہیں۔ وہ سب ٹانگیں تڑوا کر سٹور میں بند پڑے ہیں۔"

چاروں کو حالات کی سنگینی کا شدت سے احساس ہوا۔ شانی نے گھبرا کر عالمگیر کا بازو پکڑ لیا۔ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "اب کیا ہوگا عالمگیر؟"

عالمگیر بولا۔ "خاموش رہو، مجھے سوچنے دو۔"

حویلی کے مرکزی دروازے پر جونہی جیپ رُکی، تین چار گن بردار ڈھاٹا پوش بندے گاڑی کے اطراف میں کھڑے ہوگئے۔ گنوں کی نالیوں کا رُخ جیپ سے اُترنے والوں کی طرف تھا۔ جیپ کے عقب میں گرے کار رُک گئی۔ واپسی کا راستہ مسدود ہوگیا۔ اُس میں

سے صرف ایک آدمی برآمد ہوا۔ اُس کا چہرا کھلا تھا۔ اُسے سردار سمیت کسی نے بھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔

وہ گنوں کے سائے میں حویلی کے صحن تک پہنچے۔ سردار قطعی طور پر خاموش تھا۔ شانی عالمگیر سے چمٹ کر گھسٹ رہی تھی۔ ہر کوئی اپنے طور پر حالات کی اِس کروٹ کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی سرا نہیں آ رہا تھا۔ صحن میں پہنچ کر ڈھاٹا پوشوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ دو آدمیوں نے شانی اور اُس کی ماما کو پکڑ کر ایک طرف کر لیا۔ سردار اور عالمگیر کو صحن کے وسط میں ہینڈز اَپ کرا دیا۔ سردار کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر منظر دھندلایا ہوا تھا۔

شانی کو بڑے کمرے کی سلاخوں والی کھڑکی میں نائیلون کی رسی سے مضبوطی سے باندھ دیا گیا۔ اُس کی ماما کو ستون کے ساتھ کھڑا کر کے باندھنے کے بعد ایک بندہ بڑے کمرے میں سے مٹی کے تیل کی کین اُٹھا لایا۔ بڑی سرعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس نے دونوں کو تیل میں بھگو دیا۔ پھر اردگرد تیل کا چھڑکاؤ کرنے لگا۔ دوسرا آدمی حویلی کے کمروں میں تیل چھڑکنے لگا۔ سردار پھٹی پھٹی آنکھوں سے نہ سمجھ میں آنے والے منظر کو دیکھ رہا تھا۔

ایک ڈھاٹا پوش نے برآمدے میں کھڑے ہو کر اطلاع دینے کے سے انداز میں کہا۔ ”ماسٹر! کام مکمل ہو چکا ہے۔ سیٹ لگا دیا گیا ہے۔ اَب تم اپنی شوٹنگ مکمل کروا سکتے ہو۔“

اچانک سبھی کارندے پوزیشنیں بدل کر محفوظ ہو گئے۔ گنوں کی نالیاں دکھائی دے رہیں تھیں۔ عالمگیر نے اونچی آواز میں کہا۔ ”میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تمہیں ڈراتا ہوں کہ اپنی اِس اوچھی حرکت سے باز آ جاؤ ورنہ ساری عمر پچھتاتے رہو گے۔ مردوں کی لڑائی میں عورتوں کو یرغمال بنانے والے اور اُن پر گولیاں چلانے والے بزدل ہوتے ہیں۔ تم میں ہمت ہے تو سامنے آؤ۔ مَردوں کی طرح پنجہ آزمائی کرو۔“

ایسے میں سردار کے پیروں کے قریب ایک ریوالور آن گرا۔ دونوں نے چونک کر ریوالور کی طرف دیکھا۔ دُشمن کا قہقہہ بلند ہوا۔ ”سردار فضل خان! کیا دیکھتے ہو؟ یہ ریوالور ہے۔ اِس میں صرف دو گولیاں ہیں۔ ایک گولی پر تمہاری بیٹی کا نام لکھا ہوا ہے۔ دوسری پر تمہاری بیوی کا نام لکھا ہے۔ ریوالور اُٹھاؤ اور دونوں کے سینوں میں ایک ایک گولی اُتار دو۔ سیٹھ داؤد سبحانی کا حکم ہے کہ اگر تم دونوں کو اپنے ہاتھ سے گولی مار دو تو تمہاری جان بخشی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دی جائے گی۔ ورنہ تمہیں تمہارے داماد سمیت گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔“

سردار کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے عالمگیر کی طرف دیکھا۔ اُس کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے جھک کر ریوالور اٹھایا۔ اردگرد دیکھا۔ آنکھوں سے بے بسی مترشح تھی۔ ہولے ہولے ریوالور والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا، نالی کا رُخ اُس کی بیوی کی طرف ہوا۔ بیوی نے چیخ کر کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو۔ میں تمہاری جان سے پیاری بیوی ہوں۔ عمر بھر جس سینے پر کان رکھ کر دل کے نغمے سنتے رہے ہو، اُسی سینے کو چھلنی کر دو گے؟ کوئی بیوی کو بھی گولی مارتا ہے کیا؟“

سردار کا ہاتھ جھک گیا۔ دوسری مرتبہ بلند ہوا تو اُس کی نال کا رُخ بیٹی کی طرف تھا۔ بیٹی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ باپ کی محبت پر یقین تھا۔ باپ کے اُٹھے ہوئے ہاتھ میں دبے ریوالور کی ہلاکت خیزی کا بھی علم تھا۔ روتے ہوئے بولی۔ ”پاپا! زندگی آپ کی دَین ہے۔ آپ کے ہاتھوں موت آئے، اِس سے بڑی خوشی کی کوئی بات نہیں۔ ماما کے حصے کی گولی بھی میرے سینے میں اُتار دیجئے۔“

ہاتھ جھک گیا۔ سر بھی جھک گیا۔ سوچنے لگا۔ ”سبحانی اتنا احمق نہیں ہے کہ مجھے زندہ چھوڑ دے۔ خدا جانے اُسے کیا دُشمنی ہے مجھ سے؟“

خاموشی طاری تھی۔ کوئی بول نہیں رہا تھا۔ سردار نے اردگرد دیکھا۔ گنوں کی نالیاں اُس کا نشانہ لئے دکھائی دے رہی تھیں۔ اُس نے عالمگیر سے کہا۔ ”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں زندہ نہیں رہوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے۔“

عالمگیر نے کہا۔ ”اُن لوگوں نے شانی اور ماما پر تیل چھڑک دیا ہے۔ وہ اُن کی گرہیں کھولنے کی بجائے ایک دیا سلائی جلا کر معاملہ ختم کر دیں گے۔“

سردار کا ریوالور والا ہاتھ ایک بار پھر ہوا میں بلند ہوا۔ اپنی کنپٹی پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”عالمگیر! مجھے سچے دل سے معاف کر دینا۔ اگر بچ جاؤ تو شانی کو بچانے کی کوشش کرنا۔ میں اِس بڑھاپے میں شانی اور تمہاری موت کا دُکھ برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تم لوگ بھی مار دیے جاؤ گے مگر میری آنکھ یہ قیامت کا منظر دیکھنے سے پہلے بند ہو جائے گی۔ خدا حافظ!“

شانی اور ماما بلند آواز میں چیخنے لگیں۔ سردار نے آنکھیں بند کر لیں۔ زیرِ لب کچھ پڑھا

اور ٹریگر دبا دیا۔

ٹرچ......ٹرچ......

سردار کی آنکھیں فرطِ خوف سے پھیل چکی تھیں۔ اُسے کافی دیر تک پتہ ہی نہیں چلا کہ ریوالور کی نال میں سے دونوں مرتبہ کوئی گولی نہیں نکلی تھی اور نہ ہی فائر کی آواز سنائی دی تھی۔ شانی اور ماما آنکھیں اور منہ پھاڑے آشفتگی کے عالم میں اُسے دیکھ رہی تھیں۔

پورا ایک منٹ گزر گیا۔ سردار کا ماتھا پسینے سے تر تھا۔ نہایت آہستگی سے اُس نے ریوالور والا ہاتھ نیچے کیا۔ ریوالور کو دیکھا۔ یقین ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ گولی نہیں چلی تھی۔ اُس نے دیوانگی کے عالم میں برق رفتاری سے ریوالور اپنے سینے کی جانب سیدھا کر کے ٹریگر دبایا۔ کچھ نہیں ہوا۔ وہ بار بار لبلبی دباتا جا رہا تھا۔ پھر ریوالور پرے پھینک کر ادرگرد دیکھنے لگا۔ ٹانگیں جواب دے گئیں۔ ہمت ٹوٹ گئی۔ لہرا کر گھٹنوں کے بل زمین بوس ہو گیا۔

چوپائے کی طرح سر جھکا کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پھر آہستگی سے ڈھے گیا۔

ایسے میں اچانک بساط پلٹ گئی۔ ڈھاٹا بردار چھلانگیں لگا کر موروچوں سے باہر نکل آئے۔ عالمگیر کے پاس آ کر اپنے ڈھاٹے کھول کر چہرے ننگے کرنے لگے۔ شانی اور ماما کی تحیر نا کی دیدنی تھی۔ اُن کے منہ سے کچھ نکل ہی نہیں رہا تھا۔ ایک کارندہ دوڑ کر شانی کے پاس آیا۔ اُس کی رسیاں کھولتے ہوئے بولا۔ ''بھابی! دونوں ہاتھ جوڑ کر گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ مجبوری تھی۔ ہم مرتے دم تک عالمگیر کی حکم عدولی نہیں کر سکتے۔''

دوسرا ماما کی طرف بڑھا۔ رسیاں کھول کر بولا۔ ''تم عالمگیر کی ساس ہو، ماں ہو، ہم سب کی ماں ہو۔ میں اپنے بھائی بندوں کی طرف سے معذرت کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ مجبوری کی حالت میں کیا گیا۔''

عالمگیر نے سردار کا معائنہ کیا۔ اطمینان سے سر ہلا کر بولا۔ ''تم دونوں اِنہیں اُٹھا کر باہر گاڑی میں لے جاؤ۔ ہم آ رہے ہیں۔''

وہ سردار کو اُٹھا کر باہر چلے گئے۔ عالمگیر کے اشارے پر ایک آدمی بڑے کمرے میں گیا اور ایک بڑا سا اٹیچی کیس اٹھائے باہر نکلا۔ عالمگیر نے برآمدے کے فرش پر اٹیچی کھول کر الٹ دیا۔ اُس میں سے بہت سی فائلیں، وڈیو کیسٹیں اور وڈیو ڈسکیں برآمد ہوئیں۔ پیروں کے بل زمین پر بیٹھ کر کچھ چیزیں چھانٹی کر کے الگ کیں۔ باقیوں پر تیل چھڑک دیا۔ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک ساکت کھڑی شانی کے پاس آیا اور بولا۔ ''جانِ عالمگیر! اِس ڈھیر میں ہر وہ ڈسک اور فلم موجود ہے جو تمہیں رُلاتی رہی ہے۔ اِس میں ہر وہ فائل اور ثبوت پڑے دیاسلائی کے منتظر ہیں جو تمہارے باپ کو آسمان سے زمین پر لا پٹختے ہیں۔ یہ تھوڑی دیر کے بعد جل جائیں گے۔''

چھانٹی کی ہوئی چیزیں ایک شاپنگ بیگ میں ٹھونستے ہوئے وہ سب کو لے کر باہر گاڑی میں آ گیا۔ گہرے رنگ کی گاڑی کو اُس کے ساتھیوں نے پیچھے ہٹا کر اُسے راستہ دیا۔ کچھ فاصلے پر پہنچ کر اُس نے گاڑی روکی۔ اُتر کر حویلی کی طرف گیا۔ بڑے دروازے کو دیاسلائی دکھاتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''اے تپانے والی آگ! آج سب کچھ جلا کر میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دے، میرے سر پر ٹھنڈا پانی انڈیل دے۔''

لکڑی کے مین گیٹ نے سست رفتاری سے آگ پکڑنا شروع کر دی۔ چار پانچ منٹ کے دورانئے میں آگ بھڑک کر پوری حویلی سے لپٹ چکی تھی۔ آگ کی تپش نے اُس کے چہرے کو سرخ کر دیا تھا۔ ایسے میں وہ ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہر بار آگ سے نکل آتی تھی۔ آج نکلتی ہوئی دکھائی نہیں دی تو سوچ میں پڑ گیا۔ ''کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی؟ اندر کوئی رہ تو نہیں گیا؟''

اپنے ساتھیوں کو گنا۔ کوئی بھی کم نہیں تھا۔ آگ کے سرخ اور پیلگوں شعلوں پر نظر جمائی۔ ماں دکھائی نہیں دی تو بے بسی سے دل ہی دل میں اُسے پکارنے لگا۔ وہ اچانک سامنے آ گئی۔ آج اُس کے جھریوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے قریب آ گئی۔ اُس کے تپتے ہوئے رخساروں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں چومنے لگی۔ دیوانہ وار خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میرے علم دینے! اللہ کا شکر ہے کہ تو نے عالمگیر کے بہروپ کو جلا دیا۔ میری روح کو قرار آ گیا ہے۔ تو واقعی بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ تیری رگوں میں میرے خان کا خون دوڑتا ہے۔ تو حرامی نہیں، حلالی ہے۔ اپنے باپ کے قاتل کو معاف کر کے، قاتل کی بیٹی کو سینے سے لگا کر تم نے مجھے پرسکون کر دیا ہے۔ میں چلتی ہوں۔ میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے!''

وہ اُسے روکنا چاہتا تھا۔ وہ آتش زدہ حویلی کے بڑے گیٹ میں جا کر چند ثانیے کیلئے رکی۔ پلٹ کر ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ ''تیرا باپ برسوں سے میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں

اُس کا سامنا کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اُسے کیا بتلاتی کہ میں نے اُس کے علم دین کو عالمگیر جیسا قاتل اور خونی بنا دیا؟ اَب اُس کا سامنا کر سکتی ہوں۔ اُسے فخر سے بتلا سکتی ہوں کہ اُس کے بیٹے کو آگ کے شعلوں کے مہیب بطن سے نکال کر علم دین بنا آئی ہوں۔ میرے علم دین! میرے خان کی جان! اللہ بیلی!"

وہ پلٹی۔ دروازہ عبور کر کے آگ میں غائب ہو گئی۔

عالمگیر نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں میں اُتر آنے والے دُکھ کے آنسوؤں کو صاف کیا۔ پلٹ کر گاڑی میں آ کر بیٹھا اور گردن موڑ کر حویلی کے جلتے ہوئے دروازے کو دیکھنے لگا جس میں داخل ہو کر ماں ہمیشہ کیلئے اوجھل ہو گئی تھی۔ ہاتھ کے اشارے سے بشیر خان کو پاس بلایا۔ "بشیر خان! تم نے مجھ پر اتنے احسانات کئے ہیں کہ میں کسی ایک کا بھی بدلہ نہیں چُکا سکتا۔ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر بیلے کی طرف نکل جاؤ۔ ایک ہفتے کے بعد کوٹھی پر آ جانا۔ میں نے تمام بندوبست کر رکھا ہے۔ کچھ کمی ہے، وہ بھی ایک ہفتے میں پوری کر لوں گا۔"

بشیر خان کے پیچھے پیچھے شبر علی پہنچ گیا۔ بولا۔ "عالمگیر! تم نے وعدہ کیا تھا کہ......"

عالمگیر اُس کی بات رَسان سے کاٹ کر بولا۔ "میں نے کہا ناں کہ ایک ہفتے کے بعد میرے پاس چلے آنا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے حصے کی تمام زمین تم لوگوں میں بانٹ دوں گا۔ تمہیں عزت کی روٹی چاہیے اور ایک چھوٹا سا پُرسکون گھر چاہیے۔ ہے ناں؟...... ملے گا۔ محنت کرنا، اپنے لئے بیویاں ڈھونڈنا...... جتنا پیسہ بھی لگے گا، میں لگاؤں گا اور تمہیں حلال روزی کمانے والا کاشتکار بناؤں گا۔ او۔کے؟"

"او کے!"

گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک پر ڈالتے ہوئے بیک مرر میں سردار فضل خان کو دیکھنے لگا۔ وہ بے ہوش پڑا تھا۔ بیوی اپنے شوہر کے ہاتھوں کو سہلا رہی تھی۔ زیرِ لب اپنے سائیں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اُس نے مسکرا کر اپنی جان سے پیاری ہستی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "شانی! تکلیف دینے پر دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی طلب کرتا ہوں۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ سر جھکا کر انگلیاں چٹخاتی رہی۔

وہ بولا۔ "ناراض ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں...... تمہارا غصہ اُتر گیا؟"

"ہاں......"

وہ رُخ پھیر کر بولی۔ "معاف کر دینے والے بڑے عظیم لوگ ہوتے ہیں۔ آج تک سنا ہے، دیکھا نہیں۔ دیکھنے کا موقع ملا تو شاید نظر ہی کچی نکلی، عین موقع پر دھندلا گئی۔"

تیزی سے اُس کی طرف پلٹ کر بولی۔ "شاپنگ بیگ میں کس کی فلمیں ہیں؟"

وہ بولا۔ "بتول کی۔ سوچا اُسے بھی لگے ہاتھوں آزادی کا پروانہ دیے جاؤں۔ مجھ پر شک نہ کرو۔ منیرے قصائی کے کہنے پر میں نے چوہدری باسط کے دشمنوں کے چنگل سے نکالی ہیں۔"

وہ جو کچھ پوچھنا چاہتی تھی، پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بدقت تمام بولی۔ "تو کیا یہ سارا ڈراما تم نے......"

وہ بات کاٹ کر بولا۔ "نہیں...... صرف آج کی قسط کا سکرپٹ میں نے لکھا تھا۔ اِس سے پہلے جو کچھ ہوا، اُس میں میرا کوئی کردار نہیں تھا۔"

اُس نے گاڑی روک دی۔ منہ پھیر کر بیٹھی ہوئی مہارانی سے ملتجیانہ انداز میں مخاطب ہوا۔ "شانی! بازو اِدھر کرو۔"

اُس نے بلا سوچے سمجھے بازو اُس کی طرف بڑھا دیا۔ عالمگیر نے کف ہٹانا چاہا تو چونک پڑا۔ شانی کا لباس مٹی کے تیل سے گیلا ہو چکا تھا۔ مسکرا کر کف ہٹانے لگا۔ تِل پر نظریں جمائے بے خود ہوتا گیا۔ بڑی ہی آہستگی سے اُس نے اپنے ہونٹ تیل زدہ تِل پر رکھ دیے۔

ایسے میں سردار فضل خان نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر خالی الذہنی کی کیفیت میں ڈوبا رہا۔ چند لمحوں بعد ماحول سے شناسائی کی لہر آنکھوں میں ابھری۔ عالمگیر کو دیوانوں کی طرح تِل چوستے دیکھ کر بولا۔ "عالمگیر! یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

عالمگیر نے جلدی سے شانی کا بازو چھوڑ دیا۔ سوال کرنے والے کو چند ساعتوں تک عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "زندگی میں پہلی مرتبہ تمہیں انکل کہہ کر بات کرنے چلا ہوں۔ انکل! تمہاری بیٹی نے اگر مجھے تمہاری ندامت اور پچھتاوے کے بارے میں بروقت نہ بتایا ہوتا تو ریوالور خالی نہ ہوتا۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سردار کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی۔ ''یہ تو تم نے بہت بڑا احسان کیا جو معاف کردیا۔ جب معاف ہی کرنا تھا تو پھر یہ ناٹک کیوں کیا؟''

''صرف درد آشنائی کیلئے!'' عالمگیر نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہیں تمہاری زندگی میں اُس دُکھ اور بے بسی سے روشناس کرانا ضروری تھا جو تمہارے بڑے بھائی محمد خان نے تمہارے ہاتھوں جھیلا تھا۔ جس بے بسی اور لاچارگی کو اُس نے مرنے سے پہلے محسوس کیا تھا، تم نے بھی محسوس کرلیا ہے۔''

دیوانہ وار دیکھتی ہوئی شاہانہ پر ایک عجیب سی نگاہ ڈالی اور ایکسیلریٹر پر پاؤں کا زور بڑھادیا۔

(تمت بالخیر)